سوچ کا ہمالیہ
قاسم علی شاہ

سوچ کا ہمالیہ

قاسم علی شاہ

نئی سوچ

آفس نمبر 46،47 فرسٹ فلور
ہادیہ حلیمہ سنٹر، غزنی اسٹریٹ
اُردو بازار، لاہور 0423-7361416

انتساب!

میرے استاد محترم

سید سرفراز احمد شاہ صاحب کے نام

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	عرضِ مصنف - سوچ کا ہمالیہ	6
2	سیلف مینجمنٹ	10
3	کامیابی کی کہانی	14
4	تزکیہ نفس اور مُرشد	19
5	دولت کا راز	29
6	فیصلہ سازی-ایک اہم خوبی	38
7	درست سمت	44
8	ٹائم مینجمنٹ	50
9	شوق کی تلاش	58
10	ذہنی مضبوطی	63
11	فکری ارتقا	72
12	سی ایس ایس امتحان	79
13	کامیابی کی قیمت	89
14	رویوں میں تبدیلی	97
15	ان جان دوست	102
16	کندھا	109
17	خوشحالی کا فلسفہ	116
18	ایک انسان، کئی ذہانتیں	122
19	معاشی ترقی	130

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
20	گھریلو مسائل	146
21	حضرت علامہ اقبال کا فلسفہ تعلیم	154
22	متحرک زندگی	162
23	کاؤنسلنگ اور کوچنگ	172
24	تعلیم، تربیت، استاد	180
25	ماضی، حال، مستقبل	185
26	دانہ پانی	192
27	سیلف امیج	198
28	بلھیا، کی جاناں میں کون؟	204
29	رہنمائی کی تلاش	210
30	کامیابی میں ناکامی	216
31	محرومیوں کو کامیابی میں بدلیے	225
32	خاندانی نظام اور عورتوں پر تشدد	231
33	ولی ساز	240
34	شخصیت کی بنیاد	248
35	کمزوریوں کو قوت میں تبدیل کیجیے	254
36	ممتاز بننے کا جذبہ	261
37	خدمت کا جذبہ	274
38	اپنی کہانی، اپنی زبانی	279

عرض مصنف

سوچ کا ہمالیہ

ہمالیہ... آپ کے ذہن میں یہ لفظ سنتے ہی کیا آتا ہے؟

دنیا کا سب سے طویل سلسلہ کوہ جس میں دنیا کے کئی بلند ترین پہاڑ آتے ہیں۔ یہ سلسلہ پانچ ممالک سے گزرتا ہے جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔ معاشرے میں ہمالیہ کی اسی خاصیت کی وجہ سے مختلف غیر معمولی بڑی چیزوں کو ہمالیہ سے نسبت بھی دی جاتی ہے۔ میری کتاب ''سوچ کا ہمالیہ'' گویا اس جانب اشارہ ہے کہ آج میں جو کچھ ہوں، وہ میرے رب کے فضل کے بعد ظاہری اعتبار سے میری غیر معمولی بڑی سوچ کے باعث ہے۔

انسان کی کامیابی اور ناکامی، دونوں کا آغاز ''سوچ'' سے ہوتا ہے۔ میں اپنی زندگی پر غور کرتا ہوں تو میری زندگی جو آج دنیا کے سامنے ہے، ہمیشہ سے ایسی نہ تھی۔ لیکن، جب میں نے اپنی سوچ تبدیل کی تو سب کچھ بہت تیزی سے بدلنا شروع ہو گیا۔

سوچ کی جسامت

حقیقت یہ ہے کہ صرف میں ہی نہیں، میں نے دنیا کے جتنے بھی کامیاب لوگوں (ناکام لوگ بھی) کا مشاہدہ و مطالعہ کیا ہے، سب میں جو واحد عامل سب سے متحرک ہے، وہ ''سوچ'' ہے۔ آدمی کی سوچ کی جسامت یعنی سائز (Size) اس کی زندگی کی کیفیت کی تشکیل کرتا ہے۔ ہر کامیابی کے پیچھے بڑی سوچ جبکہ ہر ناکامی کے پیچھے آدمی کی چھوٹی سوچ کارفرما ہے۔ ہم سب اپنی سوچ کی پیداوار ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کسی فرد کے اکاؤنٹ کا سائز، کسی فرد کی خوشی کا سائز، کسی فرد کی طمانیت کا سائز براہ راست منحصر ہوتا ہے، اس کی سوچ

کے سائز پر۔ جس فرد کی سوچ کا سائز ہمالیہ کے برابر ہو تو آپ کیا کہیں گے؟

بڑی سوچ میں جادو ہے۔ کسی فرد کی غیر معمولی زندگی کا تعلق اس کی سوچ سے ہے۔ یہ سوچ جتنی بڑی ہوگی، یہ جادو اتنا ہی سر چڑھ کر بولے گا۔

ایک اہم سوال

یہاں یہ سوال یقیناً کیا جا سکتا ہے کہ ''اگر واقعی سوچ اتنی ہی قوی تاثیر رکھتی ہے اور اس پر خرچ بھی کچھ نہیں آتا تو لوگ بڑا کیوں نہیں سوچتے؟''

ماہرین کامیابی اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اگرچہ ہم سب اپنی سوچ کی پیداوار ہیں، مگر ہم میں سے اکثر لوگ (جو پوری دنیا میں پچانوے چھیانوے فیصد سے کم نہیں) بہت چھوٹا سوچتے ہیں۔ آپ اپنے اردگرد لوگوں کو دیکھئے تو وہ آپ کو پیچھے ہٹنے اور محفوظ زندگی گزارنے پر اکساتے ہیں۔ وہ آپ کو حقیقت پسند بننے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہم اپنے ماحول میں نظر دوڑائیں تو سب دو نمبری سے لے کر دس نمبری سوچ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہمیں اپنے پیر اپنی چادر دیکھ کر پھیلانے چاہئیں، لیکن ہمیں اپنی سوچ بھی اپنی چادر تک محدود رکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

آپ محدود نہیں

ہم جب پیدا ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہمیں لامحدود صلاحیتوں کے ساتھ پیدا فرماتا ہے۔ لیکن، ہمارے ماں باپ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ تم میں فلاں خامی ہے، فلاں خامی ہے، تم یہ نہیں کر سکتے، تم وہ نہیں کر سکتے۔ کیا میرا رب ظالم ہے جو اس نے مجھے ان خامیوں کے ساتھ پیدا کیا ہے؟ (نعوذ باللہ) نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے وہ تمام وسائل و ذخائر مہیا کر دیے ہیں جو

اسے اس دنیا میں کوئی بھی بڑی سے بڑی کامیابی کے حصول کیلئے درکار ہیں۔ سائنس بھی آج یہ بات تسلیم کر چکی ہے۔ نیورولنگوئسٹک پروگرامنگ کا تیرہ بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول ہے کہ people already have all the resources they need. یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو کم تر یا برتر پیدا نہیں فرمایا۔ ہر انسان بہترین ساخت اور وسائل کے ساتھ اس دنیا میں آیا ہے۔

محدود سوچ، محدود زندگی

لیکن، ہماری چھوٹی اور محدود سوچ کے باعث ہم خود کو کمزور، غریب اور معذور کر لیتے ہیں۔ گویا، یہ کہنے دیجیے کہ انسانی زندگی میں کامیابی، ترقی اور خوش حالی کا سب سے بڑا اوزار ابڑی سوچ ہے۔ سوچ کا معیار کا جتنا عمدہ اور واضح ہوگا، زندگی اتنی زیادہ عمدہ اور بہتر ہوگی۔ آپ کے ذہن میں پیدا ہونے والا آپ کی زندگی کو جنت بھی بنا سکتا ہے اور جہنم بھی۔ بہ قول اقبال، ''یہ خاکی اپنی فطرت میں نوری ہے نہ ناری ہے''۔ اسی طرح، مشہور انگریز ادیب شیکسپیئر نے لکھا ہے، ''یہاں کچھ بھی اچھا یا برا نہیں، سوائے اس کے جسے سوچ اچھا یا برا بنا دے۔''

اب سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر سوچ ہی سب کچھ ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب آسان ہے اور وہ یہ ہے کہ معاشرے کے مختلف کامیاب افراد کا مشاہدہ و مطالعہ کیا جائے اور یہ جانا جائے کہ انھوں نے اپنی زندگیوں میں کیوں کر کامیابی، ترقی اور خوشی پائی۔ انسانی تاریخ کے کامیاب ترین لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے پتا چلتا ہے کہ ان کی زندگی میں کامیابی اور خوشی کا جو جادو ہوا، اس کا اصل ان کی بڑی سوچ تھی۔

ان افراد کی زندگیاں کوئی کاغذی فلسفہ نہیں اور نہ لفاظی ہے۔ بلکہ ان افراد کی زندگیاں اس بات کا عملی ثبوت ہیں کہ انھوں نے جو کچھ کیا اور پھر مطلوبہ نتائج حاصل کر لیے تو اس لیے کہ انھوں نے اپنی سوچ کو بہت بڑا رکھا۔ پھر ان کی سوچ نے ان کی زندگیوں میں جو جادو

جگایا، وہ دنیا اس کی شاہد ہے۔ کامیابی اور خوشی کا سب سے موثر اوزار، بڑی سوچ ہے۔ کرۂ ارض پر انسانوں کی اکثریت اس اوزار سے ناواقف ہے۔ یہ لوگ اگرچہ کامیابی اور خوشی چاہتے ہیں، مگر اس اوزار سے عدم واقفیت کی بنا پر اپنی من چاہی زندگی حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ اس تحریر کے ذریعے میں اپنے پیارے قارئین کو جو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، میرے لیکچرز سنتے ہیں، یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس یہ اوزار ہے... بڑی سوچ کا اوزار۔ بڑی سوچ... جو کامیابی اور خوشی کا خزانہ آپ کے اندر سے کھوج کر آپ کی زندگی میں لاسکتی ہے۔ آپ کی زندگی یکسر بدل سکتی ہے۔

بڑا سوچیے، آپ بھی بڑے بن جائیں گے۔ آپ کو بہت سی خوشی ملے گی۔ آپ کو ڈھیروں کامیابیاں حاصل ہوں گی۔ آپ کی آمدن زیادہ ہوگی۔ آپ کے دوستوں کا حلقہ بڑا ہوگا۔ آپ کی عزت زیادہ ہوگی۔ آپ کی زندگی بڑی ہوگی۔

بڑی سوچ کا آغاز کب سے کیا جائے؟ اچھا اور اہم سوال ہے۔ اس کا سادہ ترین جواب ہے، ابھی اور ابھی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ نے جس لمحے اپنی چھوٹی اور محدود سوچ کو خیر باد کہہ دیا اور جس لمحے بڑا سوچنا شروع کر دیا، اسی لمحے سے آپ کی زندگی اسی لمحے جادو اثر ہونا شروع ہو جائے گی۔

میں نے اپنی سوچ کے ہمالیہ کی بات کی ہے۔ یہ آپ پر ہے کہ آپ اپنی سوچ کا سائز کتنا رکھتے ہیں۔ سوچیے کہ آپ کتنا بڑا سوچ سکتے ہیں؟

قاسم علی شاہ

سیلف مینجمنٹ

""چیمپین بننے کیلئے تمہیں اپنے آپ پر یقین کرنا ہوگا، کوئی اور تمہارے لیے یہ کام نہیں کر سکتا!""

شوگر رے رو بنسن

انسان کی زندگی مختلف مراحل پر مشتمل ہے جیسے بچپن، لڑکپن، جوانی، ادھیڑ پن اور بڑھاپا۔ انسان کی زندگی کا جب آغاز ہوتا ہے تو اسے کسی قسم کا شعور نہیں ہوتا، یہاں تک اسے بے لباسی کا احساس نہیں ہوتا۔ جیسے ہی عمر پانچ چھے سال کی ہوتی ہے تو اُس کے اندر شرم وحیا کا رویہ جنم لیتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ مجھے اپنا جسم ڈھانپنا چاہیے۔ مجھے اپنا آپ چھپانا ہے۔ جب مزید بڑا ہوتا ہے تو اس کے اندر چاہت آتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ میری باتیں سنیں اور میری بات مانی جائے۔ وہ شاباشی ملنے پر خوشی محسوس کرتا ہے۔ انسان کی عمر میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا ہے، ویسے ویسے اس کے شعور میں پختگی آتی ہے۔

سیلف مینجمنٹ کیا ہے؟

سیلف مینجمنٹ (Self Management) میں دو الفاظ ہیں۔ اول، سیلف (Self) اور مینجمنٹ (Management)۔

سیلف کا مطلب ہے، ""میں""۔ ایسے بے شمار لوگ ہیں جو جس چیز کو مینج کرنا چاہتے ہیں، وہ اس چیز کے بارے میں نہیں جانتے جیسے یہ کہ گھر کیا ہے، گھر کسے کہا جاتا ہے، معاش کیا ہے، یہ کیوں ضروری ہے، شادی کیا ہے، شادی کرنا کیوں ضروری ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام وہ احساسات ہیں جو انسان کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ""میں"" ہوں۔ یہ شعور آتا ہے تو آدمی خود کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اسی کو ""سیلف مینجمنٹ"" کہا جاتا ہے۔

جس فرد کے اندر یہ احساس نہ ہو، اس کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ نارمل نہیں ہے۔

معاشرے میں جو لوگ کپڑوں کے بغیر پھر رہے ہوتے ہیں، وہ جہاں چاہتے ہیں، بیٹھ جاتے، لیٹ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں شعور نہیں ہے۔ جن کے پاس رونے یا ہنسنے کی وجہ عجیب ہو یا وہ زندگی کی ڈگر سے ہٹ گئے ہوں، ایسے لوگوں میں سیلف مینجمنٹ نہیں ہوتی۔ کچھ لوگوں کی سیلف مینجمنٹ کا لیول اتنا بلند ہوتا ہے کہ ان کے دنیا سے چلے جانے کے باوجود اُن کے افکار زندہ رہتے ہیں۔ جیسے سدھارتھا (گوتھم بدھ) نے کہا کہ ''خواہش مار دو تو غم مر جائے گا۔'' آج لوگوں کو گوتھم بدھ کی شکل وصورت کا نہیں پتا، مگر اس کی سیلف یا ذات سے نکلی ہوئی باتوں پر آج بھی دنیا غور کر رہی ہے۔ اسی طرح یہ جملہ کہ ''اگر دجلہ وفرات کے کنارے کتا بھی مر جائے تو عمرؓ اس کا جواب دہ ہے''، یہ جملہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عظیم سیلف مینجمنٹ کا اظہار کرتا ہے۔

ایک مستقل سفر

سیلف مینجمنٹ سے پہلے ''سیلف'' کا سفر ہے۔ سیلف کی پالش کرنا ہے، سیلف کو جاننا ہے اور سیلف کو شناخت کرنا ہے۔ اس کو خودی کا سفر بھی کہا جا سکتا ہے۔ عام طور پر، ہم نے سیلف کی جو شناخت کی ہوتی ہے، وہ سیلف نہیں ہوتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سیلف میں بہتری آنی چاہیے۔ اگر بہتری نہیں آتی تو اس کا مطلب ہے کہ سیلف کا سفر جہاں سے شروع ہوا تھا، وہ وہیں کا وہیں ہے۔ اس دنیا میں واقعات، افراد، حادثات، خوشیاں، غم اور تجربات خودشناسی کا بہترین آئینہ ہیں۔ سیلف کو جاننے کے مواقع تب زیادہ ہوتے ہیں کہ جب آدمی زندگی کی ٹرک پر احساسات کے ساتھ چلتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری پیغام دیا جس سے پتا چلا کہ چلتے رہنا ہی خودشناسی ہے جبکہ اس سے پہلے خودشناسی کا مطلب یہ تھا کہ شادی نہیں کرنی، دنیا کو چھوڑ دینا ہے، جنگلوں میں رہنا ہے۔ رہبانیت اختیار کر لینی ہے۔

زندگی بذاتِ خود انسان کو اپنے آپ سے آشنا کراتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کے احساسات زندہ ہوں۔ یہ احساس کہ زندگی ایک بار ملی ہے، یہ احساس کہ مجھے کچھ کرنا ہے، یہ احساس کہ دوبارہ موقع نہیں ملنا۔ اگر یہ احساسات ہیں تو یہ خوش بختی کی علامت ہے۔

خود فراموشی

خود شناسی کے بعد اگلا مرحلہ خود فراموشی کا آتا ہے۔ جب آدمی خود کو جان جاتا ہے اور پھر اس پر مسلسل کام کرتا رہتا ہے تو ایک وقت آتا ہے کہ وہ اپنے تئیں بھول جاتا ہے۔ اسے یہ ادراک ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی دوسروں کیلئے ہے۔ چنانچہ وہ دوسروں کیلئے چھوٹی چھوٹی آسانیاں پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جو لوگ دوسروں کیلئے آسانیاں پیدا کرنا شروع کر دیں، وہ Selfless لوگ ہوتے ہیں۔ انھیں اپنی ذات کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے سیلف کی شناخت کے بعد بے پروا ہو جاتے ہیں۔ میسلو کہتا ہے کہ دنیا میں بڑے لوگ ایسے ہیں جو سیلف کی شناخت کے بعد سیلف لیس ہو جاتے ہیں۔

لوگوں کی اکثریت زندگی کی چھوٹی دوڑ میں پھنسی ہوئی ہے۔ یہ لوگ اپنی آسانی کیلئے بہت کچھ بنا لیتے ہیں، مگر ان کے سیلف میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ زندگی میں تو ہم نے کچھ کر کے نہیں پایا تو پھر کیوں نہ ہم روحانیت میں آ جائیں۔ یہ زندگی سے راہ فرار ہے۔ کمال یہ ہے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

نیکی کا پیمانہ

ہم کہتے ہیں کہ نیکی تب ہوگی جب لوگ دیکھیں، جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نیکی تب ہوگی جب میں قبول کروں گا۔ اور قبولیت چیزوں سے نہیں ہوتی، نیت سے ہوتی ہے۔ سیلف کا ایک بڑا حصہ تزکیے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ سیلف کا ایک حصہ ایسا ہے جس کا حساب ہی نہیں ہے اور وہ ہے نیچر۔ جو چیز نیچر میں ہے اس کا حساب نہیں ہے، لیکن جو چیز اختیار میں ہے اس کا حساب ہوگا۔

کیا آپ اپنے یقینوں پر سوال اٹھا سکتے ہیں

سب سے بہادر انسان وہ ہے جو اپنے افکار پر سوال اٹھا سکے۔ ایسا کرنا بہت مشکل ہے۔ آپریشن کے ذریعے بازو کاٹنا آسان ہے، لیکن ذہنی آپریشن کر کے نظریات کو نکالنا بہت مشکل کام

ہے۔انسانی تاریخ میں جتنی بھی جنگیں لڑی گئیں، وہ "میں صحیح اور وہ غلط" کی بنیاد پر لڑی گئیں۔ بہت سے لوگ اپنی طرف سے یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم میں بہتری آرہی ہے، لیکن اصل میں بہتری نہیں ہوتی۔ کسی کو دیکھ کر اگر سیلف کا سفر شروع کرنا ہے تو پھر یہ سفر نہیں ہوگا۔ سیلف مینجمنٹ میں سب سے پہلا قدم خود کو جاننا ہے۔ اس کے بعد اپنے نظریات کو بدلنا۔ وہ تمام خیالات اور یقین جو ترقی پذیر نہیں ہیں، ان پر ضرور سوال اٹھانے چاہئیں۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ زندگی میں جس جس گوشے میں بہتری نہیں آرہی، اس میں بہتری لائیے۔ جب تک نئے افکار، نئی چیزیں اور نئے یقین نہیں آئیں گے، سیلف مینجمنٹ میں بہتری نہیں آئے گی۔

کوچ ضروری ہے

ہماری زندگی کی جو ٹرین چل رہی ہوتی ہے، بعض اوقات وہ سفر اچھا نہیں لگ رہا ہوتا۔ اس کا اندازہ یوں ہوتا ہے کہ ہم جو محنت کر رہے ہیں، نتائج اس کے مطابق نہیں ہوتے۔ اس لیے زندگی کے سفر میں بہتری لانے کیلئے کسی کوچ یا مینٹور کو اپنی زندگی میں شامل کیجیے۔ اس کیلئے لازم نہیں کہ بیعت ہی کرنی پڑے، لازم نہیں ہے کہ وہ کوئی مرشد ہو۔ وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ اگر دل کے دروازے کھلے ہیں تو پھر لوگ مل جائیں گے۔ ہمارے ساتھ یہ مسئلہ ہے کہ ہم پہلے پیمانہ بناتے ہیں، پھر اس سے لوگوں کو جانچتے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں کھرے اور سچے لوگ نہیں ملتے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، "ہم دوسروں کو ماپنے کے پیمانے بناتے ہیں اور خود کو ماپنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔"

اپنی سیلف مینجمنٹ کو بہتر کرنے کیلئے درج ذیل چیزیں اپنی زندگی میں شامل کیجیے:

1 سوچ کی تنظیم 2 یقین کی ترجیح

3 انسپائریشن 4 مطالعہ

5 ذاتی بہتری کی فہرست

کامیابی کی کہانی

''انسان کا کمال یہ نہیں کہ وہ نہ گرے، کمال تو یہ ہے کہ گرے اور اٹھ جائے!''

کنفیوشس

کہانیاں ایک مشکل بات کو دلچسپی اور آسانی کے ساتھ سمجھانے کیلئے ہوتی ہیں۔ موٹیویشن کیلئے ہوتی ہیں۔ بڑی بات کو چند جملوں میں سمجھانے کیلئے ہوتی ہیں۔ کہانیوں کی بہت ساری اقسام ہیں۔ ان میں ایک کامیابی کی کہانی ہے۔ آج دنیا میں کامیابی کے موضوع پر جتنی بھی تحقیق ہوئی ہے، اس سے پتا لگا کہ دنیا کی بہترین ومعاون کتاب اگر کوئی ہے تو وہ کامیابی کی کہانی ہے۔ ہزار کتابیں ایک طرف اور ایک فرد کی کامیابی کی کہانی ایک طرف۔

غیر معمولی زندگی

کامیابی کی کہانی میں طاقت یہ ہوتی ہے کہ اسے سننے کے بعد کئی لوگ موٹیویٹ ہوجاتے ہیں۔ بے شمار ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی زندگی میں تحریک آجاتی ہے اور وہ تحریک اس معیار کی ہوتی ہے کہ وہ زندگی میں ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ کامیابی یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص معذور ہو، زندگی میں بہت سارے چیلنجز کا سامنا ہو، مشکلات اور پریشانیاں ہوں، لیکن وہ ان سب کے باوجود کچھ کرکے دکھادے۔ دنیا میں غیر معمولی (ایکسٹرا آرڈینری) بننے کیلئے دو چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ آپ کسی بھی پروفیشن میں ہیں، کسی بھی پیشے میں ہیں، کسی بھی شعبے میں ہیں، دنیا کا کوئی کام کررہے ہیں، کچھ بھی ہیں تو سب

سے پہلی چیز رویہ اور دوسرا مہارت ہے۔

ہمیں غیر معمولی بننے کیلئے پہلے اپنے رویے میں خود تبدیلی لانی پڑے گی۔ ہمیں کامیاب کہانی بننے کیلئے ایک اچھا موٹیویٹر بننا ہے۔ اگر ہم اچھے موٹیویٹر نہیں بنتے تو پھر کبھی بھی غیر معمولی استاد نہیں بن سکتے۔ موٹیویشن دینے کیلئے پہلی شرط یہ ہے کہ پہلے خود موٹیوٹ ہوں، تبھی دوسروں کو موٹیویٹ کر سکیں گے۔ جب آپ کے پاس آپ کے کام کرنے کی وجہ تنخواہ نہ ہو بلکہ کوئی مقصد ہو تو پھر آپ موٹیویٹر ہیں، کیونکہ تنخواہ تو بہت چھوٹی شے ہے، یہ کچھ دنوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن موٹیویشن تنخواہ سے زیادہ طاقت رکھتی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو آپ کو اٹھاتی ہے، لے کر جاتی ہے، گرمی برداشت کرنے پر مجبور کرتی ہے، قربانی دینے کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور آپ کچھ کر گزرتے ہیں۔

پہلے موٹیویشن لیجیے، پھر دیجیے

میرے پاس موٹیویشن ہے، یہ کہنا بہت آسان ہے۔ ہم یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم عاشقِ رسولؐ ہیں۔ لیکن عاشقِ رسولؐ کا دعویٰ کرنا بہت آسان ہے، اندازِ رسولؐ اپنانا بہت مشکل ہے۔ آپ اندازِ رسولؐ اپنائیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ تپتی دھوپ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ایسی عورت سے بات کرتی ہے جو ذہنی طور پر اپاہج ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہہ رہے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ اس سے باتیں کر رہے ہیں، یہ تو ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کی میں نہیں سنوں گا تو کون سنے گا۔

معذور بچوں کو پڑھانے والے اساتذہ اصل میں عملی طور پر عاشق رسولؐ ہیں، کیونکہ یہ ان کے ساتھ کام کرتے ہیں جنھیں شعور ہی نہیں ہوتا۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ''احسان کرنے کا مزہ وہاں آتا ہے جہاں پر کسی کو شکریہ کا بھی شعور نہ ہو۔''

جب اللہ تعالیٰ یہ اعزاز دے دے تو پھر اس سے بڑی موٹیویشن اور کیا ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی قدرتی قوانین سے متاثر ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عام لوگوں سے زیادہ ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی اس مخلوق کیلئے کام کر رہا ہے، جس کا صلہ اس مخلوق نے نہیں دینا، صرف اللہ تعالیٰ نے دینا ہے، اس کیلئے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے۔

عقل والے پر لازم ہے کہ جس کے پاس عقل نہیں ہے، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے، اس کے ساتھ اچھا برتاؤ اپنائے۔ جب آپ کسی معذور بچے یا بالغ کے ساتھ خلوص سے بات کرتے ہیں، اس پر شفقت برتتے ہیں، درگزر کرتے ہیں، اچھا برتاؤ اپناتے ہیں تو اس سے آپ کے روحانی قد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہم روحانیت روحانیت کرتے رہتے ہیں، بابے تلاش کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں کتنی ہی بار ولی بننے کا موقع گنوا دیتے ہیں۔

رونا دھونا اجر ضائع کر دیتا ہے

ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہم کام بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی روتے بھی ہیں۔ زبان پر شکوہ رہتا ہے۔ یوں، کام کا لطف حاصل ہوتا ہے اور نہ اجر ملتا ہے۔ یہ عادت بنائیے کہ ہم نے موٹیویٹ رہنا ہے۔ اپنا رویہ بہتر اپنانا ہے اور خوش دلی کے ساتھ کام کرنا ہے۔ خوش دلی سے کیا ہوا کام بہت زیادہ اثر رکھتا ہے۔ ایسا کئی بار ہوتا ہے کہ قابلیت پیچھے رہ جاتی ہے، خلوص آگے آ جاتا ہے۔ اگر آپ خلوص والے ہیں، چاہ والے ہیں، نیت والے ہیں تو پھر آپ کا اجر بڑھ جائے گا۔ ہمارا ایمان ہے کہ خلوص کا صلہ آخرت میں ملے گا۔ لیکن آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا میں برکت کی صورت میں بھی ملے گا۔ اگر ہم یہ کریں گے تو ہمارے کاموں میں برکت آ جائے گی۔ کام صحیح ہونے لگیں گے، سکون ملنے لگے گا۔

بہت سے لوگ بہت بڑے کام نہیں کرتے، انھوں نے اپنی زندگی میں چھوٹے چھوٹے کام کیے ہوتے ہیں، لیکن ان کاموں کے پیچھے خلوص اتنا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان چھوٹے

چھوٹے کاموں کے اجر کا اثر یہ کرتا ہے کہ ان کی زندگی میں برکت آ جاتی ہے۔ ان کے بہت سے کام خود ہی ہونے لگتے ہیں۔ ان کے بچے باادب ہوگئے۔ ان کے رشتے بہ آسانی ہوگئے۔ ان پر کبھی محتاجی نہیں آئی۔ وہ سکون کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے۔ جبکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس پیسہ بہت ہے، شہرت ہے، کامیابیاں ہیں لیکن زندگی میں سکون اور برکت نہیں ہے۔ انھوں نے کام تو وہی کیے، لیکن کام کے پیچھے نیت وہ نہیں تھی جو برکت ڈالتی ہے۔

ہم کام کے سائز کو بڑا نہیں کر سکتے، ہم اپنی ہمت کے مطابق کام کر سکتے ہیں لیکن اس کے پیچھے موجود نیت کو بہت بڑا کیا جا سکتا ہے۔ بابا فیروزؒ کہتے ہیں، دنیا میں کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا، کاموں کی نیت کاموں کو بڑا بناتی ہے۔ کاموں کی نیت کاموں کو چھوٹا بناتی ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ عین ممکن ہے، بادشاہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں بہت چھوٹا ہو اور ممکن ہے، موچی اللہ تعالیٰ کے دربار میں بڑا مقرب ہو۔ اگر ہم اپنی نیت کو انقلابی نیت بنائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کامیاب کہانی بنانے کا موقع دیا ہے کہ وہ جسے دنیا کچھ نہیں سمجھتی، ہمیں اسے کچھ بنا کر دکھانا ہے، اسے اس قابل کرنا ہے کہ وہ زندگی کے بوجھ خود بھی برداشت کرے۔

نک وائے چچ وہ شخص ہے جو دنیا کے دس مقبول ترین ٹرینرز میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی نہ ٹانگیں ہیں اور نہ بازو ہیں۔ جو بچہ کسی چیلنجز کا شکار ہے، اگر وہ اس کی ویڈیو دیکھے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ اسے بہت زیادہ انرجی اور موٹیویشن ملے گی۔ اس کے علاوہ کوشش کریں کہ آپ کے کام سے متعلق دنیا میں جتنا کام ہو رہا ہے، اسے ضرور دیکھیں اور سیکھیں، کیونکہ جب کام آتا ہو تو آدمی خوشی خوشی کرتا ہے۔ لیکن کام نہ آتا ہو تو بد دلی پیدا ہو جاتی ہے۔

تھپکی زندگی بدل سکتی ہے

کندھے پر دی ہوئی تھپکی کسی کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ خامیاں نکال کر جو پہلے ہی مرا ہوا

ہے، اسے مت ماریے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ایک جملہ گولی سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ وہ توپ کے گولے سے زیادہ مہلک ہوسکتا ہے۔ کہی گئی بات کسی کو اڑا کر رکھ سکتی ہے۔ اس لیے کسی سے منفی بات مت کیجیے۔ اگر پڑھایا نہیں جاتا تو کوئی بات نہیں، لیکن بچے کو پیار اتنا کریں، اتنے خلوص کے ساتھ پیش آئیں، اتنا رویہ اچھا ہو کہ بچے کی زندگی بدل جائے۔

حسن البنا سے کسی نے پوچھا، آپ اتنے بڑے عالم ہیں لیکن آپ کتابیں تصنیف کیوں نہیں کرتے۔ انھوں نے جواب دیا، ''میں کتابیں تصنیف نہیں کرتا، میں انسانوں کی تصنیف کرتا ہوں۔'' میں ایسے لوگ پیدا کرتا ہوں جو پھر یاد رکھتے ہیں کہ ان کی زندگی میں ایک ایسا استاد آیا تھا جس نے اس کی زندگی بدل دی۔ حسن البنا ایک ایسے استاد تھے جو شراب خانے میں جاتے تھے تو شرابیوں سے کہتے تھے کہ دو منٹ میری بات سنو۔ وہ دو منٹ بات سنتے تھے، گلاس گرا دیتے تھے اور کہتے تھے آپ نے ہماری زندگی بدل دی۔

آپ کا رویہ ایسا ہو کہ جس کے بازو نہیں ہیں، اسے پر لگ جائیں، جس کی ٹانگیں نہیں ہیں، اس میں ہمت اور جان اتنی آجائے کہ وہ دنیا کو دیکھ کر کہے کہ میں اس دوڑ میں دنیا کو ہرا کر دکھاؤں گا۔ وہ بہ بانگ دہل اعلان کرے کہ میں ثابت کروں گا کہ ٹانگوں اور بازوؤں کے بغیر بھی بہت کچھ کرنے کے قابل ہوں۔

تزکیہ نفس اور مُرشد

''اپنے نفس کا بہترین تزکیہ یہ ہے کہ اللہ نے جو مال آپ کو دیا ہے،
اس میں سے محتاجوں کو دیں!''

جنید جمشیدؒ

مرشد کے ساتھ تعلق کوئی لکھت پڑھت کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ کسی کے کہنے یا کسی کی نصیحت سے نہیں ہے۔ جس طرح محبت پوچھ کر نہیں ہوتی اور کوئی رانجھا یہ نہیں کہتا کہ میں ڈگری لے کر آؤں گا تو پھر کسی ہیر سے محبت کروں گا، یہ معاملہ تو خود بہ خود ہوتا ہے۔ ایک شخص اپنے اندر یہ جذبات محسوس کرتا ہے کہ میری زندگی فلاں کے بغیر ادھوری ہے اور میری زندگی کی سمت متعین کرنے والا کوئی ہونا چاہیے۔ یہ احساس کسی ہادی، کسی مرشد یا کسی رہبر کی طرف بھگاتا ہے۔ اگر یہ احساس نہیں ہے تو بذات خود کمبختی ہے کہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ ممکن ہے، آدمی فزکس یا کیمسٹری کی پریکٹس کر رہا ہو، چار تجربوں کے بعد کوئی نتیجہ نکلنا ہو تو یہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ بننے والی کیا چیز ہے، لیکن اگر زندگی کا تجربہ الٹ ہو جائے تو نہ صرف اس کیلئے عذاب ہوگا بلکہ اس کے ساتھ منسلک لوگوں کیلئے بھی عذاب ہوگا۔

ہماری زندگی کا ایک بے ضرر پہلو ایسا ضرور ہونا چاہے کہ ہماری ذات سے کسی کو نقصان نہ پہنچے بلکہ انتہا یہ ہو کہ ہماری ذات سے فائدہ ہو۔ اپنی ذات کے ادھورے پن کو مکمل کرنے کیلئے جس شخص کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مرشد ہوتا ہے۔ مرشد اور مرید دونوں قدرت کا انتخاب ہوتے ہیں۔ یہ فیصلہ قدرت کرتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ ہمیں ماں کے پیٹ میں

ایک مدت تک رکھتا ہے اور اس عمل کو مکمل کرنے کے بعد دنیا میں لاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ یہ بھی بندوبست کرتا ہے کہ یہ میرا بندہ ہے، کہیں بھٹک نہ جائے۔ اس لیے، وہ ہمیں کسی ہدایت یافتہ شخص سے منسوب کر دیتا ہے۔ انسانی نفسیات کا سب سے خوبصورت پہلو یہ ہے کہ وہ صحبت سے سیکھتا ہے۔ اسی فیصد لوگوں کے مسکرانے کا انداز اُن کی ماں سے ملتا ہے۔ اس پر غور و خوض کیا گیا تو پتا لگا کہ جس چہرے کو ہم سب سے زیادہ دیکھتے ہیں، وہ شعوری اور لاشعوری طور پر ماں کا چہرہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے ماں کی مسکراہٹ بچے پر نقش ہوتی ہے۔

صحبت کی طاقت

انسان کے بہت سے اجزا کی بڑھوتی ان صحبتوں کی وجہ سے ہوتی ہے جن میں اس کا وقت گزرتا ہے۔ درحقیقت مرشد کا تعلق محبت کا تعلق ہوتا ہے۔ اس میں جبر نہیں ہوتا۔ یہ دل دینے والی بات ہوتی ہے۔ کسی جگہ پر اپنی عقل کا سمندر چھوٹی سی پوٹری لگتا ہے اور آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ اگر میں اندھا ہوں تو یہ راستہ بتانے والا ہے۔ اُس کا ویژن مجھ سے زیادہ ہے۔ اس کی بصیرت مجھ سے زیادہ ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''آپ کی زندگی میں ایک آواز ایسی ضرور ہونی چاہیے جسے آواز بغیر تحقیق کے مان جائیں اور وہ آواز مرشد کی ہوتی ہے۔''

مُرشد وہ ذات ہے جو آپ سے زیادہ آپ کے فائدے کو جانتی ہے۔ وہ آپ سے زیادہ آپ کو بھی جانتی ہے۔ جس راستے سے آپ گزر کر جانا چاہتے ہیں وہ اس راستے سے گزر چکی ہوتی ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''ہر مسافر کو رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر چلنے والے کو رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔'' لیکن ہر ایک کو رہبر کی ضرورت نہیں بھی ہوتی۔ یہ آدمی کو خود دیکھنا چاہیے کہ مجھے رہبر کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ اگر راستہ نہیں چاہیے تو پھر رہبر کیسا؟ اگر کوئی منزل نہیں ہے تو پھر رہ نما کون سا؟ ایک شخص نے چورا ہے

پر کھڑے بابا جی سے پوچھا، یہ راستہ کہاں جاتا ہے؟ بابا جی نے پوچھا تمہیں کہاں جانا ہے؟ اس نے جواب دیا، بس کہیں بھی چلا جاؤں گا۔ بابا جی نے کہا، ''پھر یہ نہ پوچھ کہ یہ راستہ کہاں جاتا ہے۔ پھر جو بھی راستہ ملتا ہے، اسی راستے پر چلتے جاؤ۔''

محبت کا راستہ

اللہ کا راستہ شوق کا راستہ ہے۔ یہ محبت کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کا شوق، اس کے راستے پر چلنے کا شوق بذاتِ خود ایک منزل ہے۔ یہ سفر نہیں ہے۔ اس کا انجام نہیں ہے۔

ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں رو رہا تھا۔ اس نے اپنے مرشد سے پوچھا کہ اس کا بھی کوئی نتیجہ نکلتا ہے؟ مرشد فرمانے لگے، یہ تو خود بہت بڑا نتیجہ ہے۔ کیا تم اس کے بعد نتیجہ لینا چاہتے ہو؟ لوگ تو ترستے ہیں کہ ہماری زندگی کے آنسوؤں میں کوئی ایک آنسو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ہو اور تم ہو کہ اس کا نتیجہ لینا چاہتے ہو۔ یہ سعادت دیکھو کہ تمہاری آنکھ سے کتنے آنسو ٹپکے اور ان میں کتنے آنسو تھے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ٹپکے۔

محبت کا معاملہ اصل میں استاد اور شاگرد کا معاملہ ہے۔ یہ ایک پیر اور مرید کا معاملہ ہے۔ لازم نہیں ہے کہ کسی کی نصیحت سکھائے۔ ممکن ہے، کسی پروسس سے گزارا جائے اور سبق مل جائے۔ کیونکہ خبر نہیں ہے کہ کس بستی میں جانے سے کیا سبق ملنا ہے۔ خبر نہیں، کس معمے کو حل کر کے کیا ملنا ہے۔ مرشد کے پاس ان کا ایک مرید آیا اور عرض کیا کہ حضور، میری طبیعت میں گداز نہیں ہے۔ کوئی ایسا معاملہ بتائیں تا کہ مسئلہ حل ہو جائے۔ مرشد نے کہا کہ تمہیں کچھ سال ریاضت کرنی پڑے گی، تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس نے پوچھا، مجھے کیا کرنا پڑے گا؟ مرشد نے کہا، فلاں موسم میں فلاں علاقے میں ایک پھول کھلتا ہے، اس میں

ایک یا دو قطرے عرق کے نکلتے ہیں۔ یہ شیشی لے جاؤ، اس کو بھر کے لاؤ۔ مرید چلا گیا۔ اسے شیشی کو بھرنے میں کئی سال لگ گئے۔ جب وہ شیشی بھر گئی تو وہ خوشی خوشی اپنے مرشد کے پاس جانے لگا۔ لیکن ابھی چلا ہی تھا کہ شیشی اس کے ہاتھ سے گر گئی اور محنت سے جمع کیا ہوا سارا عرق بہہ گیا۔ مرید رونے لگا۔ اسی دوران مرشد بھی آ گئے۔ انھوں نے پوچھا، کیا معاملہ ہے۔ اس نے جواب دیا، میری برسوں کی ریاضت ضائع ہوگئی۔ جب مرشد نے یہ سنا تو مسکرانا شروع کر دیا۔ مرید نے پوچھا، حضور میری ریاضت ضائع ہوگئی ہے اور آپ مسکرا رہے ہیں؟ انھوں نے آگے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے سے آنسو لیے اور فرمانے لگے کہ یہ آنسو اس عرق سے کئی گنا قیمتی ہے۔ مجھے یہی چاہیے تھے۔

فیض کب ملتا ہے

گداز، دل ٹوٹے بغیر نہیں ملتا۔ یہ معاملہ ہی تب ہوتا ہے کہ جب کوئی پھل یا محنت ضائع ہو جائے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''نم آنکھ خدا کی رحمت کی دلیل ہے۔'' آپؒ مزید فرماتے ہیں، ''رات جاگنے والا بد نصیب نہیں ہو سکتا۔'' کسی نے پوچھا، استاد جی، رات جاگنے سے بد نصیبی دور ہوتی ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کیلئے رات جاگنا ضروری ہے؟ آپؒ نے فرمایا، چاہے کسی کیلئے بھی کیوں نہ ہو، رات جاگنا بذاتِ خود ایک اعزاز ہے، کیونکہ دیکھنے والا اس پر نگاہ کرتا ہے۔

جب کوئی بندہ آہ و زاری کر رہا ہوتا ہے تو وہ ذات دیکھتی ہے کہ یہ اپنے معاملے میں کتنا سچا ہے۔ ممکن ہے، اس کا معاملہ صرف ایک ہی ہو اور وہ معاملہ یہ ہو کہ شراب بھی پی ہو، لیکن اس رات اللہ تعالیٰ کے نام کو خوشبو لگا کر محبت سے رکھا ہو اور اگلے دن دنیا کو پتا چل گیا کہ میرے بندے نے میری تکریم کی ہے، مجھے عزت دی ہے، اب مجھ پر لازم ہے کہ میں بھی اسے عزت دوں۔

کشف المحجوب میں ہے کہ مرشد کے پاس ایک عرصے سے اُن کے چاہنے والے مرید بیٹھے تھے۔ انہیں کچھ نہیں ملا۔ اسی دوران ایک شخص آیا۔ مرشد کے ساتھ ایک نشست ہوئی اور اس کو فیض مل گیا۔ فیض لینے کے بعد وہ صاحب واپس چلے گئے۔ جب مریدوں نے جو کئی سالوں سے مرشد کے پاس بیٹھے تھے، یہ منظر دیکھا کہ اُن میں سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت، ہمارا قصور کیا تھا؟ کیا ہم نے آپ کی خدمت نہیں کی؟ کیا ہم نے آپ کو وضو نہیں کرائے؟ کیا ہم نے ادب نہیں کیا؟ مرشد نے کہا کہ میں کیا کروں، تم گیلی لکڑیاں لے کر بیٹھے ہوئے ہو۔ اس بندے کی لکڑیاں خشک تھیں۔ خشک لکڑیاں لے کر جانے والا بذاتِ خود محترم ہوتا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''روحانیت میں، خدا کے راستے میں منزل تمہارا انتظار کر رہی ہوتی ہے، تم نہیں انتظار کرتے۔ اِدھر زیادہ بے تابی ہوتی ہے۔''

محبت کا دعویٰ آسان نہیں

یہ دعویٰ کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے محبت ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آپ سے محبت ہے۔ دیکھنے والا محبت کرسکتا ہے۔ جس کی آنکھ دیوار سے پار نہیں جاسکتی، جس کی سماعت کمرے سے باہر نہیں جاسکتی، جس کی آنکھ ستارے نہیں دیکھ سکتی، وہ کیا دعویٰ کرے گا کہ وہ خدا سے محبت کر رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم ہے کہ وہ آپ پر پڑی تو آپ کے اندر یہ احساس ٹھہر جائے کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔

جاننے والا محبت کرسکتا ہے، اَن جان کیا محبت کرے گا۔ جتنا وہ ہمیں جانتا ہے، ہم تو جاننے کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ یہ اُس کا حُسن کمال ہے، حُسن ظرف ہے اور حسن خیال ہے کہ کتھے مہر علی، کتھے تیری ثنا۔ اگر زمانہ چاہے تو وہ ذات کل کائنات میں نہیں سماتی؛ اگر سمانے پر آجائے تو بندۂ مومن کے دل میں سما جاتی ہے۔

سچی طلب فاصلے ختم کر دیتی ہے۔ وہ تیرہ سو سال کا پردہ ہٹاتی ہے اور غازی علم دین

شہیدؒ امر ہو جاتا ہے۔ یہی طلب سات سو سال کے فاصلے کو مختصر کر دیتی ہے۔ کہاں مولانا رومؒ اور کہاں حضرت علامہ اقبالؒ... یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک ایسا شخص جس کی نسلیں یہاں پر گزری ہوں اور کہاں اس کا تعلق۔ محبت اتنی طاقت رکھتی ہے کہ جسمانی موجودگی کی اہمیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور وقت کا فاصلہ سمٹ جاتا ہے۔ اگر سچی محبت نہ ہو تو بارگاہِ رسالتؐ کے پاس سے گزرنے والا محروم رہ جاتا ہے، جیسے ابو جہل۔ جبکہ دوسری طرف حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا ستارہ چمک جاتا ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں،

شوق ترا اگر نہ ہو، میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

حضرت واصف علی واصفؒ ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں، ایک صاحب اپنے مرشد کے پاس گئے اور کہا کہ مجھے قصیدۂ غوثیہ پڑھنے کی اجازت دیں۔ انھوں نے جیب سے ہزار روپے نکال کر کہا، انھیں رکھو، پھر کبھی آنا۔ اس نے کہا، آپ کی بہت مہربانی میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ مرشد نے کہا، ہاں یہی تو حل کرنا تھا۔ مرید نے کہا، میں قصیدۂ غوثیہ اس لیے پڑھنا چاہتا تھا کہ کوئی ہزار روپیہ مل جائے، یعنی ہم نے اپنی عبادت کے ساتھ دنیاوی ضرورت جوڑی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے سچے دل سے گڑگڑایئے اور اس سے کہیے کہ یہ میرا معاملہ ہے۔ یقین جانئے، آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا، اور آپ کا کام ہو جائے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ہو۔ اگر بالفرض، دیر ہو تو اس کی وجہ ہوتی ہے کہ ہم میں نقص ہوتا ہے۔ ہم میں اخلاص نہیں ہوتا۔ بسا اوقات جو چیز آنی ہوتی ہے ہم اس کو لینے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ بسا اوقات چیز موجود ہوتی ہے اور ہم اس پر متوجہ نہیں ہوتے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آئے اور عرض کی کہ یارسول اللہؐ، میں جہاد پر جانا

چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا تمہاری ماں ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس کی خدمت کرو۔ انھوں نے یہی بات دو تین دفعہ کی جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تیرے لیے جہاد سے افضل ماں کی خدمت ہے۔ ممکن ہے، ہمیں کوئی کہے کہ راستے کا پتھر ہٹادو جبکہ ہم نے فیصلہ کیا ہو کہ ہم نے پہاڑ ہی ہٹانا ہے۔ اسی طرح کوئی کہے کہ نماز پڑھ لو جبکہ ہم پوری تیاری کر کے بیٹھیں ہوں کہ ہم نے مسجد بنانی چاہیے۔ جو کہہ دیا جائے، بعض اوقات اسے من و عن قبول کر لینے ہی میں بہتری ہوتی ہے۔

سب سے بڑا رہبر

سچی طلب سب سے بڑا رہبر ہے، کیونکہ سچی طلب سچے رہبر تک لے جاتی ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''سچا مرید جھوٹے پیر کو بھی سچا کر دیتا ہے۔'' مزید فرمایا کہ ''جھوٹے پیر کو بھی نماز پڑھنی پڑتی ہے۔''

جو بندہ روحانیت لے کر آتا ہے، وہ ضائع نہیں جاتی۔ اس روحانیت کیلئے اس کی راتیں لگی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے وہ پیغام سینوں میں، کتابوں اور لوگوں کی گواہیوں میں زندہ رہتا ہے۔ اگر آدمی کا کسی کے ساتھ انتہائی دیانت داری کا معاملہ ہو تو اگلا بھی دیانت دار ہو جاتا ہے۔ وہ جتنی دفعہ دیانت داری برتے گا، اس کا صلہ اس کو ملے گا۔ جس رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو تیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کو اکھٹا کر کے دعا فرمائی کہ اے اللہ، یہ چلے گئے تو پھر کوئی تیرا نام لیوا نہیں رہے گا، وہ دعا اتنی قبول ہوئی کہ وہی تین سو تیرہ کی تعداد آج اربوں تک پہنچ چکی ہے۔ فیض والا معاملہ چل پڑتا ہے تو وہ رکتا نہیں ہے۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں چلتا رہتا ہے۔ فیض انتظار کرتا ہے کہ سات سو سال بعد رومیؒ کے اقبالؒ نے آنا ہے۔ حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ نے چند لوگوں کو مسلمان کیا ہوگا اور آج انھیں کی

نسلیں برصغیر میں نظر آ رہی ہیں۔ ذرا سوچئے، کسی کا بڑا مسلمان نہ ہوا ہوتا تو آج اس کی نسل بھی مسلمان نہ ہوئی ہوتی۔ یہ نسلیں حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ کے درجات بلند کرنے کیلئے کا کتنا بڑا ذریعہ ہیں!

محبت کا فیض

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری ایام میں مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہما نے پوچھا، یارسول اللہ، ان آنسوؤں کی کیا وجہ ہے؟ ہم سے کوئی گستاخی ہوگئی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے کہ "تم نے تو مجھے دیکھا ہے۔ میں ان لوگوں کو یاد کر کے رو رہا ہوں جنھوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا، لیکن وہ مجھے یاد کر کے روئیں گے۔" وہ کیا چیز ہے جو سینوں سے چلتی ہے، جو ایک سے دوسرے میں چلتی ہے۔ کتاب تو شاید علم کا مدفن ہے، لیکن نگاہ مخرج ہے، اس لیے فیض ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہوتا ہے۔ آج تک دنیا کی تاریخ میں کسی کو اتنی محبت سے یاد کیا ہی نہیں گیا جتنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیا گیا۔ ہماری عبادت کے کمزور درجے ہو سکتے ہیں، لیکن ہماری محبت کا قوی درجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں آنکھوں میں آنسو آ جائیں۔ یہی فیض ہے۔

دل کا قطب نما

اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ کس بندے کو کہاں لگانا ہے، اس لیے یہاں سارے مرشد بھی نہیں ہیں اور سارے مرید بھی نہیں ہیں، سارے مسلمان بھی نہیں ہیں، سارے ہندو بھی نہیں ہیں۔ اگر سارے ہی ڈاکٹر بن جائیں تو پھر یہ سسٹم نہیں چلے گا۔ یہ تو ان کی بات ہے جو روحانیت کے راستے پر بیٹھے ہیں۔ یہ سوال ان بیماروں کا ہے جو ڈاکٹر کی تلاش میں پھر رہے

ہیں۔ دو شخص آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے دوسرے سے کہا کہ فلاں صاحب بہت بڑے بزرگ ہیں۔ دوسرا شخص ان بزرگ کو چیک کرنے چلا گیا اور وہاں بیٹھ گیا۔ دوسرے دن پھر چلا گیا۔ وہاں بیٹھنے کی وجہ سے بزرگ سے اس کا رابطہ بن گیا۔ پھر کئی سال گزر گئے۔ وہ سوال لے کر جاتا، اسے جواب ملتا۔ بعد میں اس شخص نے کہا کہ پہلی بار مجھے یہ احساس اس دن ہوا کہ یہ میرے مرشد ہیں جس دن وہ شہر سے باہر گئے، کیونکہ اس دن مجھے وقت گزارنا مشکل ہوگیا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری زندگی میں کوئی کمی ہے۔

فزکس میں ایک ٹول کا استعمال کیا جاتا ہے جسے ''قطب نما'' (Compass) کہتے ہیں۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اگر اس کے پاس کوئی مقناطیس آئے تو وہ سمت چھوڑ کر مقناطیس کی طرف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مرشد بھی سمت بدل دیتا ہے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ہم آپؐ کی بارگاہ میں بیٹھے ہوتے ہیں تو ہمارے ایمان کی حالت اور ہوتی ہے، جب اٹھ جاتے ہیں تو ایمان کی حالت اور ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بارگاہ، وہ مقام جہاں پر آپ کے ایمان کی حالت اور ہو جائے وہاں سمت بدل جاتی ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''دنیادار کی مجلس میں بیٹھ کر دنیا یاد آتی ہے اور اللہ والے کی مجلس میں بیٹھ کر اللہ یاد آتا ہے۔'' پھر فرمایا، ''جس مجلس میں تمہاری آنکھ میں نمی آگئی، وہاں تمہارا کوئی معاملہ ضرور ہے۔'' آنسو تعلق کی علامت ہیں اور جب تعلق بن جاتا ہے تو اس وقت بے وجہ آنسو آجاتے ہیں۔ پھر پوری کائنات میں ایک ہی چہرہ نظر آتا ہے، کان میں صرف ایک ہی آواز سنائی دیتی ہے۔

حضرت واصف علی واصفؒ سے ایک شخص نے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے، جب آخری وقت ہوتا ہے تو اس وقت اپنوں کو کلمہ پڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ کیسے ہو جاتا ہے؟ آپؒ فرمانے لگے، ''تم تھوڑے دن گزارو۔'' کچھ دن گزرے کہ وہ شخص بندر روڈ پر جا رہا تھا۔ ایک ٹرالی سے ٹکر ہوگئی۔ وہ جیسے ہی نیچے گرا، اس کے منہ سے کلمہ نکل گیا۔ شام ہوئی تو وہ شخص آپؒ کی

مجلس میں آیا۔ آپؒ نے پوچھا، کلمہ پڑھ لیا تھا؟ حضرت بوعلی سینا ایک شخص کی نبض دیکھ رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ شہروں کے نام لو، بستیوں کے نام لو، گلیوں کے نام لو، محلوں کے نام لو، گھروں کے نام لو، گھروں کے لوگوں کے نام لو۔ یہ پوچھ لینے کے بعد فرمانے لگے کہ اس کو فلاں لڑکی سے عشق ہے۔

ہم لوگ استادوں، پیروں اور بزرگوں کے واقعات جب سنتے ہیں تو بسا اوقات وہ عقیدت ہوتی ہے۔ لوگ اسے عقیدہ سمجھ لیتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ مجھے اپنے والد صاحب سے محبت کرنے کا کوئی جواز چاہیے۔ بس، یہی کافی ہے کہ وہ میرے والد ہیں اور مجھے اُن سے محبت ہے۔ اکبر بادشاہ نے بیربل سے کہا، اعلان کر دو کہ جو سب سے خوبصورت بچہ ہے، اسے انعام ملے گا۔ دھوبن اپنا بچہ لے آئی۔ وہ کالا تھا۔ وجہ یہ تھی جس کا بچہ تھا، اسی کو اچھا لگتا تھا۔ سب سے اچھا اپنا استاد ہوتا ہے کہ اس کے پاس حصہ پڑا ہوتا ہے وہ نہ حصہ جانے دیتا ہے اور نہ آپ جا سکتے ہیں۔ نفسیات کہتی ہے کہ دنیاوی محبت جو لڑکے اور لڑکی کے درمیان ہوتی ہے، وہ عموماً اٹھارہ ماہ سے آگے نہیں جاتی۔ اگر چلی جائے تو وہ ضد بن جاتی ہے۔ پھر شادی محبت کی کم اور ضد کی زیادہ ہوتی ہے۔ استاد کے ساتھ محبت کا ایک وقت ہے، لیکن وہ تب تک ہے جب تک آپ کی تکمیل نہیں ہو جاتی۔ فیض مل جانا، فیض کا مکمل ہو جانا جدائی کی علامت ہے۔ پھر کہہ دیا جاتا ہے کہ اجمیر چلے جاؤ، لیکن وہ جاتے وقت کہہ جاتے ہیں،

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں راں پیر کامل کاملاں را رہ رہنما

حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، پاکستان اسی دن بن گیا تھا جس دن بابا فرید گنج شکرؒ نے اجودھن کا پاکپتن بنایا تھا۔

دولت کا راز

''دولت مندوں کی سوچ کے راز مجھ پر اُس وقت کھلے جب میں نے اپنے ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگی میں خودشناسی کے سفر کا آغاز کیا!''

ٹی ہاروایکر

لوگ امیر ہونا چاہتے ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ لیکن، حقیقتاً امیر وہ شخص ہے جس نے اپنے اندر کے خزانے کو دریافت کرلیا ہو، جس نے خود کو تلاش کرلیا ہو۔ جس شخص نے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کیا اور بہتر نتیجہ دیا، وہ شخص امیر ہے۔ امارت کا تعلق بینک بیلنس، پُرتعیش طرزِ حیات، مال و اسباب کی زیادتی، بڑے مکان یا نئی گاڑی کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق اپنی تلاش کے ساتھ ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی خواہش کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خواہش نہ ہو۔ چنانچہ جس کے پاس نوکری نہیں، وہ نوکری تلاش کر رہا ہے، جسے مل گئی ہے، وہ اچھے عہدے پر جانا چاہتا ہے، جو عہدے پر ہے وہ اس سے بڑا عہدہ لینا چاہتا ہے۔ کوئی ملک چھوڑنا چاہتا ہے تو کوئی ملک واپس آنا چاہتا ہے۔ کوئی پسند کی شادی کرنا چاہتا ہے تو کوئی پسند کی شادی کے فیصلے پر پشیمان ہے۔ انسان اس دنیا میں جتنی بھی خواہشیں رکھتا ہے، وہ تمام اس کے اندر ہوتی ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر پڑے ہوئے خزانے کو تلاش کیے بغیر ان خواہشوں کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔

ہمارے ہاں نوجوان اس لیے تعلیم حاصل کرتے ہیں کہ تاکہ وہ امیر ہو جائیں، لیکن وہ

تعلیم جو ان نوجوانوں کو خود شناس کر دے، اس تعلیم سے وہ محروم ہیں۔ دنیا میں انسانوں کی اکثریت اپنے دماغ، اپنی خداداد صلاحیتیں استعمال کیے بغیر قبرستان تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ وہ دماغ ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو کبھی تلاش نہیں کیا۔

کیا آپ کو یہ ادراک ہے کہ مصنوعہ (پروڈکٹ) اہم نہیں ہوتی، مشین اہم ہوتی ہے، کیونکہ مصنوعہ اگر ضائع بھی ہو جائے تو مشین سے اس چیز کو دوبارہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ جو نتیجہ دے رہا ہے، وہ خواہ پیسے کی شکل میں ہو، شہرت کی شکل میں ہو یا آسانیوں کی شکل میں ہو، اصل میں وہی Millionnaire ہے۔

امیر لوگ امیر کیوں تھے؟

ہم قابلیت کے بغیر نتیجہ چاہتے ہیں۔ ہر ٹرینر چاہتا ہے کہ ٹونی رابنس اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے۔ ہر کاروباری شخص چاہتا ہے کہ کسی دن بل گیٹس اس سے وقت مانگے۔ ہر دانشور چاہتا ہے کہ لوگ ٹکٹس لے کر مجھے سنیں۔ یہ سب خواہشیں ہیں جو ہر شخص میں پائی جاتی ہیں اور ہر شخص اپنے اندر کے میلینیر کو جانے بغیر یہ خواہش پوری کرنا چاہتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ دل دریا سمندروں ڈھونگے، یہ اصلی دولت مند ہے۔ اپنی اندر جھاتی مارنے والا امیر ہے۔ اپنے من میں ڈوب کر جو سراغِ زندگی پاتا ہے، وہ دنیا میں خوش حال رہتا ہے۔ تیرے اندر آپ حیاتی ہو کا راز جاننے والا میلینیر ہے۔ اپنے اندر کے اس میلنیر کو دریافت کیے بغیر ممکن نہیں کہ کوئی بڑا شاعر بن جائے، بڑا دانشور بن جائے، بڑا بزنس مین بن جائے یا بڑا رائٹر بن جائے۔

جن لوگوں نے ادارے بنائے، جنھوں نے ملک بنائے، جنھوں نے بڑے کام کیے، وہ حقیقتاً امیر لوگ ہیں۔ مثلاً قائداعظم محمد علی جناحؒ نے پاکستان بنایا۔ یہ بالکل درست بات ہے۔ کبھی آپ نے ان کی جناحؒ سے قائداعظمؒ بننے تک کی کہانی پڑھی ہے؟ آپ یہ

سوانح پڑھیں تو پتا چلے گا کہ وہ کتنے بڑے میلینیر تھے۔ اسی طرح، شیکسپیئر میلینیر ہے۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ میلینیر ہیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ میلینیر ہیں۔ حضرت وارث شاہؒ میلینیر ہیں۔ غالب میلینیر ہے۔ فیض میلینیر ہے۔ یہ وہ تمام لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اندر جھاتی ماری اور اپنے اندر کا خزانہ تلاش کیا۔

دولت کا مفہوم

یہ بات ہمیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ میلینیر کا مطلب یہ نہیں کہ جس کے پاس خوب پیسہ ہو یا بڑی بڑی جاگیریں ہوں۔ اگر آپ کے خیال میں ''دولت مند'' یا Millionnaire کی تعریف یہی ہے تو آپ غلط فہمی میں ہیں، آپ کو اپنی معلومات درست کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا ممکن ہے کہ کسی کو پیسہ کمانے کی انتہائی خواہش ہو تو اس کیلئے میلینیر بننے کیلئے پیسہ ضروری ہے۔ عین ممکن ہے کہ کسی کی خواہش پیسہ نہ ہو تو اس کیلئے میلینیر ہونا کچھ اور ہوگا۔ یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ اصل میں میلینیر کیا ہے۔

ہر ایک کا راستہ جدا ہے۔ ہر فرد کی منزل الگ ہے۔ کوئی کھیل میں چیمپئن بننا چاہتا ہے تو کسی کیلئے ٹاپ کرنا کمال ہے۔ کسی کیلئے منفرد کاروبار اہم ہے (خواہ اس میں زیادہ پیسہ نہ ہو) تو کوئی لکھاری یا ٹریز کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچنا چاہتا ہے۔ غرض، ہر شخص کی خواہش جدا ہے۔

دنیا میں کام کرنا اتنا اہم نہیں ہوتا بلکہ اہم یہ ہوتا ہے کہ کون سا کام کرنا ہے۔ استقامت میں برکت ہے، مگر اس سے بھی اہم یہ نکتہ ہے کہ آپ وہ کام مستقل مزاجی کے ساتھ کریں جو آپ کی جبلت اور فطرت کے مطابق ہو۔ یہ وہ کام ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دنیا میں بھیجا ہے۔ کیا آپ نے اپنے سے کبھی یہ سوال کیا ہے کہ ''میں جو کام کر رہا ہوں، کیا وہ میری جبلت کے مطابق ہے کہ نہیں ہے؟''

اگر قدرت نے کسی کو بزنس مین بنایا ہے اور وہ تدریس میں سر توڑ کوشش کرتا رہے تو وہ فیل ہو جائے گا۔لیکن اگر قدرت نے اسے بنایا ہی تعلیم کیلئے ہے تو وہ چاہے بزنس میں پی ایچ ڈی ہی کیوں نہ کرلے، وہ ایک دکان بھی نہیں چلا سکتا۔نوجوانوں کی کتنی بڑی تعداد آپ کے گرد ایسی ہے جو لیڈر شپ کی ڈگری لیتی ہے، لیکن ساری زندگی ملازمت کرتی رہتی ہے۔

خودشناسی طویل عمل ہے

خود کو جاننا ایک لمحے کی بات نہیں ہے۔ یہ ایک سفر کا نام ہے۔ تاہم، یہ ممکن ہے کہ ایک نشست میں اس سفر کا آغاز ہو اور اس کا انجام پانچ سال بعد آئے لیکن پہلا قدم اٹھانا اور چلنا پہلا کام ہے۔ یہ اہم نہیں کہ مجھے کہیں جانا ہے، بلکہ اہم تر یہ ہے کہ مجھے جانا ''کہاں'' ہے؟ یہ اہم نہیں ہے کہ مجھے منزل کا انتخاب کرنا ہے بلکہ اہم تو یہ ہے کہ میرے لیے ''کون سی'' منزل مناسب ہے؟

ان سوالوں کے جواب دو بنیادوں پر تلاش کیے جاتے ہیں۔ اول، ہمارا دماغ کیا کہتا ہے؛ دوم، ہمارا دل کیا کہتا ہے۔ پاکستانی قوم یہ سنتی ہے کہ دل کیا کہتا ہے، لیکن دماغ کیا کہتا ہے، شاید یہ کبھی نہیں سنا۔ دل سے جنون لینا چاہیے، ہم دل کی سنتے ہیں اور دماغ سے جنون چاہتے ہیں، حالانکہ دماغ کے پاس جنون نہیں ہوتا۔ اگر ان دونوں کا متوازن استعمال کیا جائے اور پھر کسی ماہر مشاور سے مشورہ کر لیا جائے تو آپ زندگی کے بہت سے مسائل سے خود کو بچانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ آپ اپنے اندر کے خزانوں کو دریافت کر کے اپنی دنیا کے میلنیر بن سکتے ہیں۔

اندر کے خزانے جاننے کی طریقے

1- وارن بفٹ سے کسی نے پوچھا، تم نے کب ڈھونڈا کہ تم دنیا کے اتنے بڑے بزنس

مین بنو گے۔ اس نے جواب دیا کہ میں پارک میں لوگوں کو دیکھتا تھا۔ تھوڑے سے پیسے پکڑتا، بوتلیں خریدتا اور تھوڑے سے نفع پر وہ چیزیں بیچ کر پلان بناتا تھا کہ مجھے دنیا کا سب سے بڑا بزنس مین بننا ہے۔ وہ لمحہ ہوتا تھا کہ جب میں بوتل پر منافع کا مارجن نکال کر سوچتا تھا کہ میں پڑھوں نہ پڑھوں، ہوں تو میں کاروباری!

2- زندگی میں ان تمام تعریفوں کی فہرست بنایئے جو زندگی میں اندر کے خزانے کی تلاش کے حوالے سے ملیں۔ جاوید چوہدری کہتے ہیں کہ جب میں نے ممتاز مفتی پر پہلا فیچر لکھا تو مفتی صاحب نے بلا کر کہا کہ تیری تحریر زمانہ پڑھے گا۔ میں نے جب اپنی تحریر کی طرف دیکھا تو سوچا کہ میری تحریر کہاں زمانہ پڑھے گا۔ میں نے تو کبھی لکھا ہی نہیں۔ یہ تو پہلی تحریر ہے، لیکن اسی پیشین گوئی نے مجھے کالم نگار بنا دیا۔ زندگی میں کسی کا جملہ ایسا ضرور ہوتا ہے جو آدمی کو جگا دیتا ہے۔ عین ممکن ہے، آپ کام کوئی کرر ہے ہوں، لیکن شاباشی کسی اور کام میں مل رہی ہو۔

3- ایسے کاموں کی فہرست بنایئے جنھیں کرتے ہوئے آپ کو تھکاوٹ محسوس نہ ہوتی ہو۔ کام تھکانے والی چیز ہے اور اگر کوئی ایسا کام ہے جو تھکاتا نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کام نہیں ہے، وہ محبت ہے اور محبت سے کوئی نہیں تھکتا۔

4- وہ کون سے لوگ ہیں جن میں بیٹھ کر توانائی ملتی ہے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں، میں نے دیکھا کہ بھیڑوں کے ایک گلے میں شیر کا بچہ رہنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ساری عادات بھیڑوں والی ہوگئیں۔ ایک دن اس نے شیروں کا جھنڈ کو دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے ایک شیر نکلا اور اس نے ایک بھیڑ کو چیر پھاڑ دیا۔ اس عمل سے اس بچے کے اندر کا شیر جاگ گیا۔ دنیا میں کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی اگر اُن کے ساتھ رہے تو موٹیویشن کا لیول انتہائی بلند ہو جاتا ہے۔

5- ان کہانیوں، ان کتابوں، ان فلموں کی فہرست بنایئے جن سے موٹیویشن ملتی ہے۔

6۔ ان خواہشوں کی فہرست بنائیے جن کیلئے دعا مانگتے ہوئے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

7۔ ان خوابوں کی فہرست بنائیے جن کے بارے میں آپ اکثر سوچتے رہتے ہیں۔

8۔ ان خیالات کی فہرست بنائیے جو آپ کو اکثر آتے رہتے ہیں۔

9۔ دنیا میں دوبارہ آنے کا موقع ملے تو کیا کریں گے؟

10۔ کس نام کے ساتھ دنیا میں جینا چاہتے ہیں؟ شناخت کیا ہوگی؟ شناخت انسان کی مجبوری ہے۔ یہ مادہ اللہ تعالیٰ نے صرف انسان کے اندر رکھا ہے، کسی اور مخلوق میں نہیں۔

11 جس شناخت کے ساتھ جینا چاہتے ہیں، اس کے ساتھ کون سی سروس جوڑنا چاہتے ہیں۔

وہ لوگ جو وسائل کا انتظار کرتے ہیں، وہ غلط کرتے ہیں۔ وسائل کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ارادہ اصل شے ہے۔ جب ارادہ سچا ہو تو جو کچھ اس وقت موجود ہے، اسی کے ساتھ کام شروع کر دیجیے۔ ہم لوگ اچھے وقت کا انتظار کرتے رہتے ہیں جبکہ اچھا وقت کبھی نہیں آتا۔ جس وقت میں آپ موجود ہیں، وہی سب سے اچھا وقت ہے۔ انسان عجیب مخلوق ہے کہ جب وہ دنیا میں رہ رہا ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ ابھی بہت وقت ہے۔ یہاں تک اسی دھوکے میں اس کی زندگی کا اختتام ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ فرماتے ہیں، ”جو کہتا ہے، میرا کل آئے گا تو میں کروں گا، اس کا کل کبھی نہیں آتا۔“ لہٰذا، آج آپ کے پاس جو ذرائع ہیں، انھیں کے ذریعے اپنی کشتی پار لگائیے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس پیسہ بہت ہے، لیکن خوشی نہیں ہے۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ خوشی کیوں نہیں ہے تو جواب دیتے ہیں، پیسہ تو آ گیا ہے، لیکن اندر کا ملینیر کہیں دب گیا ہے۔

ملینیر کون ہے

1۔ ملینیر وہ ہے جس کے پاس سکون اور خوشی ہے۔ جس کے پاس بینک بیلنس ہے، لیکن سکونِ قلب نہیں ہے، وہ ملینیر نہیں ہے۔ ملینیر وہ شخص ہے جس کے پاس

وسائل نہیں بھی ہیں، لیکن سکونِ قلب ہے۔

2- میلینیر وہ ہے جس کے پاس اطمینان ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''خوش نصیب انسان وہ ہے جو اپنے نصیب سے خوش رہے۔'' ہر کوئی اپنی زندگی تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ مجھے فلاں کی سی زندگی مل جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم زندگی تو تبدیل کرنا چاہتے ہیں، لیکن جس زندگی کو اپنانا چاہتے ہیں، اس کے مسائل کو نہیں اپنانا چاہتے۔ آدمی اپنی تکلیف کو دنیا کی سب سے بڑی تکلیف سمجھتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تکالیف کے علاوہ بھی بہت سی تکلیفیں ہوتی ہیں۔ دنیا کس کس تکلیف میں ہے، ہم سوچ بھی نہیں پاتے۔

3- اللہ تعالیٰ نے جو وسائل دیئے ہیں، ان کا ذائقہ چکھئے۔ اس سے بڑا میلینیر ہونا اور کوئی نہیں ہے۔ یہ دنیا ایسے انسانوں سے بھری پڑی ہے جن کے پاس بے شمار چیزیں ہوتی ہیں، مگر وہ ان سے لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔ جو آدمی اپنی زندگی سے مطمئن ہے، وہ امیر ہے۔

4- جو وسائل اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں ان کے ذائقے کو محسوس کیجیے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جب اُن کے پاس وسائل ہوتے ہیں تب وہ ان کے ذائقے کو محسوس نہیں کر پاتے اور جب ان کے پاس وسائل نہیں ہوتے، تب ان کی تمنا کرتے ہیں، یعنی فرصت کی نماز نہیں پڑھتے۔ جو اپنے موجودہ وسائل کو لطف نہیں لیتا، وہ میلینیر نہیں ہے۔ میلینیر وہ ہے جو سوکھی روٹی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

5- جس کے ہاتھ، پاؤں اور جسم کے دیگر اعضا سلامت ہیں، وہ انھیں محسوس کرتا ہے اور انھیں کام میں لاتا ہے تو وہ میلینیر ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ جب وہ کسی محروم کو دیکھتا ہے تو پتا لگتا ہے کہ یہ اعضا جن کی قیمت اربوں روپے ہے، اگر ان میں ذرا سی بھی تکلیف ہو جائے تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ جو انسان اربوں کے

ہاتھ پاؤں استعمال کر رہا ہے، وہ میلینر ہے۔

6- وہ شخص میلینیر ہے جو آج کے لمحے میں زندہ ہے۔ کل کا نہیں پتا۔ وہ تو جب آئے گی، تب دیکھا جائے گا۔ آج کے لمحے میں موجود رہ کر دیکھئے۔ لمحہ موجود سے وہ شخص محظوظ ہو سکتا ہے، جو موجودہ حالت کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ اس لمحے میں ہو رہا ہے، وہ سب کچھ ٹھیک ہے اور میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ یہ تسلیم کرنا اسے خوشی دیتا ہے۔ کبھی موجودہ لمحے میں موجود رہ کر دیکھئے۔ سکون ہی سکون ملے گا۔ ہم سکون کے لمحے کو کھولے بغیر یا تو ماضی میں رہ رہے ہوتے ہیں یا پھر مستقبل میں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''جو میرا دوست ہے، نہ اس کے پاس ماضی کا خوف ہے اور نہ مستقبل کا حزن ہے۔'' خوف اور حزن سے آزادی اللہ تعالیٰ سے دوستی کی علامت ہے۔

سچا سوال

جس شخص کا یہ سوال سچا ہے کہ مجھے خود کو جاننا ہے، اسے قدرت جواب دینا شروع کر دیتی ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارا یہ سوال ہی سچا نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے انسان کا خود شناسی کا سفر بڑھتا ہے، جواب ملنا شروع ہو جاتا ہے۔

تخیل میں سوچئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کہاں کہاں سے یہ فائلیں آ رہی ہیں کہ اے اللہ، مجھے امیر بنا دے، مجھے اولاد عطا کر دے، میرا کاروبار بڑھا دے؛ اور کہاں یہ فائل ہو کہ اے اللہ، ''میں اپنی تلاش کرنا چاہتا ہوں۔'' ان فائلوں میں یہ فائل علیحدہ رکھ لی جاتی ہے۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں، ''انسان کی دو پیدائشیں ہیں۔ ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جب وہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری پیدائش وہ ہوتی ہے جس دن وہ تلاش کرتا ہے کہ میں کیوں پیدا ہوا تھا۔''

اگر ہمارے دنیا میں آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا تو پھر جانے سے بھی کوئی فرق

نہیں پڑے گا، لیکن ہونا یہ چاہیے کہ آنے سے فرق پڑا ہے یا نہیں، جانے سے فرق ضرور پڑنا چاہیے۔

آج سے خودشناسی کو تہجد بنائیے۔ خودشناسی کو سجدہ بنائیے۔ خودشناسی کو دعا بنائیے۔ خودشناسی کو آنسو بنائیے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگئے کہ اے میرے مالک، جہاں اتنی خواہشیں تو نے پوری کی ہیں، اسی طرح میرے اندر کا میلینیر بھی مجھ پر آشکار کر دے۔ آمین۔

فیصلہ سازی - ایک اہم خوبی

''آپ کا فیصلہ ہی آپ کی منزل کا تعین کرتا ہے!''

ٹونی روبنس

فیصلہ... کامیابی اور ناکامی دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ فیصلے کے اثرات مستقبل کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ فیصلوں کی وجہ سے مستقبل متاثر ہوتا ہے... منفی بھی اور مثبت بھی۔ آج ہم زندگی کے جس مقام پر کھڑے ہیں، یہ شعوری یا لاشعوری طور پر ہمارے فیصلوں کا نتیجہ ہے۔ یہ فیصلے کبھی ماضی میں کیے تھے اور ان فیصلوں کے اثرات آج نتائج دے رہے ہیں۔

انسان کی خوش بختی اور بد بختی دونوں، بڑی حد تک فیصلوں سے جڑی ہوتی ہیں۔ اگر کسی قیدی سے پوچھا جائے کہ آپ یہاں پر کیسے پہنچے تو وہ جواب دے گا کہ مجھ سے ایک غلط فیصلہ ہو گیا تھا۔ اگر کسی کامیاب انسان سے پوچھا جائے کہ آپ یہاں کیسے پہنچے تو وہ جواب دے گا کہ میں نے کچھ فیصلے ایسے کیے تھے جنھوں نے مجھے اس مقام پر لا کر کھڑا کیا ہے۔ تاریخ کے جتنے بھی کامیاب یا پھر ناکام انسان ہیں، وہ فیصلوں کی وجہ سے کامیاب یا ناکام ہوئے۔ کامیابی کے حوالے سے جتنی تحقیق ہوئی ہے، وہ یہ مانتی ہے کہ کامیابی میں فیصلوں کا کردار بہت اہم ہے۔ نپولین ہل نے کامیابی کے موضوع پر پچیس سال تحقیق کی۔ وہ تحقیق بھی یہ بتاتی ہے کہ جتنے بھی کامیاب لوگ ہیں، ان کے فیصلے بہت معیار کے ہوتے ہیں۔ جبکہ جو لوگ ناکام ہیں، وہ اپنے فیصلوں میں کمزور ہوتے ہیں اور اس کمزوری کی وجہ سے وہ

ناکام ہو جاتے ہیں۔

قسمت کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ جس کو بدلا نہیں جا سکتا اور ایک حصہ وہ ہے جسے بدلا جا سکتا ہے۔ قسمت کا وہ حصہ جو بدلا جا سکتا ہے، اس کا انحصار فیصلوں پر ہوتا ہے۔ اگر فیصلے مضبوط اور واضح ہیں اور ان کو سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے تو پھر قسمت کا یہ حصہ خوش قسمتی میں بدل جاتا ہے۔ جو لوگ فیصلہ نہیں کر پاتے، انھیں خوف ہوتا ہے کہ کہیں ہم ناکام نہ ہو جائیں۔ جب تک آدمی اس خوف سے باہر نہیں نکلتا یا اس پر قابو نہیں پاتا، اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں کے پاس علم کی کمی ہوتی ہے، وہ بھی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ تاہم، علم رکھنے والے بھی اکثر اس مہارت سے فارغ ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فیصلہ کرنا سکھایا نہیں جاتا۔ ہمارے ہاں گھروں کا کلچر کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ سارے فیصلے والدین، خاص کر والد کرتے ہیں۔ کیا کھانا ہے، کیا پینا ہے، کیا پہننا ہے، کہاں داخلہ لینا ہے، کیا پڑھنا ہے اور کیا بننا ہے، یہ سب فیصلے والدین کرتے ہیں۔

بچے بڑے ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود فیصلہ کرتے وقت اپنے بڑوں سے پوچھتے ہیں۔ یہ ضرور اچھی بات ہے کہ بڑوں سے پوچھا جائے، لیکن بڑوں کی یہ غلطی کہ وہ فیصلے خود ہی کرتے رہیں اور بچوں سے فیصلہ نہ کرائیں تو اس سے اُن میں قوتِ فیصلہ نہیں آتی۔ جب قوتِ فیصلہ نہیں ہوتی تو وہ بچہ دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کی قوتِ فیصلہ کمزور ہوتی ہے، وہ کمزور شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ شعور کی پختگی اور شخصیت میں ٹھہراؤ فیصلہ سازی میں بہت معاون ہوتا ہے۔ جو آدمی کبھی فیصلہ نہیں کرتا، وہ سیکھ نہیں پاتا، یعنی سیکھنے کیلئے تجربہ کرنا بہت ضروری ہے۔ اِن تجربوں کی وجہ سے ہی کامیابی ملتی ہے۔

جو لوگ فیصلے کرنے کے بعد اپنا فیصلہ بدل لیتے ہیں، انھیں فیصلے کے معانی نہیں معلوم ہوتے، فیصلہ کا معنی یہ ہے کہ آدمی پہلے جس حالت میں تھا، اس حالت کو ختم کر کے نئی حالت میں لے جانے کیلئے عملی اقدامات کرے۔ جو لوگ قدم اٹھانے کے بعد اپنے قدموں پر قائم

نہیں رہتے، پیچھے ہٹ جاتے ہیں، وہ فیصلہ نہیں ہوتا۔ انھیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ فیصلے کیلئے خود پر اعتماد بہت ضروری ہے۔ وہ تمام لوگ جن کا دوسرے لوگوں پر اعتماد ہوتا ہے، لیکن اپنے آپ پر نہیں ہوتا، وہ مسئلے کو تکتے رہے ہوتے ہیں، حل کی طرف نہیں دیکھتے۔ ایسے لوگ کبھی اچھا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اگر وہ فیصلہ کر بھی لیں تو غلط کریں گے، کیوں کہ حل کی بجائے مسئلہ کی بنیاد پر فیصلہ کریں گے۔ اُن کی بنیاد غلط ہے۔

آدمی ہمیشہ اچھے فیصلے برے فیصلوں سے سیکھتا ہے، کیونکہ غلط فیصلوں کے بعد سبق ملتا ہے۔ جب یہ پتا لگ جاتا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا تو پھر اکثر فیصلے صحیح ہونے لگتے ہیں، کیونکہ وہ فیصلے تجربے کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کے سارے فیصلے ٹھیک ہوں۔ انسان ہونے کے ناتے اس میں سو خامیاں ہوتی ہیں۔ کوئی انسان کل سے واقف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ کل کو نہ جاننے کی وجہ سے کچھ فیصلے غلط ضرور ہوتے ہیں، لیکن اس کا قطعی مطلب یہ نہیں ہے کہ بندہ قدم ہی نہ اٹھائے اور کوئی فیصلہ ہی نہ کرے۔

فیصلہ سے پہلے مشورہ

جو لوگ فیصلہ کر کے بدل جاتے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ پہلے رکیں، معاملہ سمجھیں، غور کریں اور کسی سے مشورہ کریں۔ مشورہ کرنا سنت ہے اور اس میں بڑی قوت ہے۔ جب کسی سے مشورہ کیا جاتا ہے تو اس سے اس کی عقل بھی اس فیصلے میں شامل ہو جاتی ہے اور اس طرح فیصلے بہتر بھی ہو جاتے ہیں اور آدمی اپنے فیصلوں پر قائم بھی رہتا ہے۔

غلط فیصلے بھی کچھ نہ کچھ ضرور دے کر جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ برا وقت بہت کچھ چھین کر جاتا ہے، لیکن برا وقت بہت کچھ سکھا کر بھی جاتا ہے۔ غلط فیصلوں سے آدمی جو کچھ سیکھتا ہے، دراصل وہ قیمت ادا کرتا ہے۔ وہ قیمت عقل اور دانش کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہ عقل

ودانش آدمی کی زندگی کو قیمتی بناتی اور اس سے منسلک لوگوں کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ کا بندے پر بے شمار کرم ہے، بے شمار فضل ہے، وہاں عقل اور شعور کا مل جانا، دانش حاصل ہو جانا بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے۔

مناسب وقت کا انتظار

جو لوگ مناسب وقت کی تلاش میں رہتے ہیں، وہ کبھی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں، ''جو کہتا ہے، میں کل بدلوں گا، اس کا کل کبھی نہیں آتا۔'' مناسب وقت کا بہانہ بڑی نالائقی ہے۔ اگر آپ نے مناسب وقت میں فیصلہ کرنا ہے تو اس کیلئے دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک اس بات کی عادت نہیں ہونی چاہیے کہ میں مناسب وقت کا بہت زیادہ انتظار کیا جائے۔ کسی معاملے میں فیصلہ کرنے سے پہلے سوال کیجیے کہ اس فیصلہ کو کب تک ٹالا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک وقت ہے۔ اس کے بعد فیصلہ نہ کرنے سے نقصان ہوگا۔ یہ نقصان فیصلے میں تاخیر کی واضح علامت ہے۔ دوسری بات یہ کہ مناسب وقت وہ بہترین وقت ہوتا ہے کہ جب آدمی تکلیف میں ہوتا ہے، کیونکہ انسان تکلیف میں رہ کر سب سے زیادہ سیکھتا ہے کہ اب مجھے یہ غلطیاں نہیں دہرانی۔

جب بھی آدمی غلطیوں سے سیکھ کر فیصلہ کرتا ہے تو وہ تبدیلی کا وقت ہوتا ہے۔ آئیڈیل وقت وہ ہوتا ہے کہ جس وقت آدمی کے پاس علم آ جائے، شعور آ جائے، سمجھ آ جائے۔ بعض اوقات ہمیں تھوڑی سی ہمدردی چاہیے ہوتی ہے، تھوڑا سا ساتھ چاہیے ہوتا ہے، کندھا چاہیے ہوتا ہے، جب کندھا مل جائے، ساتھ مل جائے، عقل مل جائے اور ہمدردی مل جائے تو یہ بھی فیصلے کیلئے آئیڈیل وقت ہوتا ہے۔ فیصلے کا بہترین وقت وہ بھی ہوتا ہے کہ جب آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ میں فیصلے کے بعد اس کے نتائج کو سنبھال سکتا ہوں۔

بے شمار لوگ فیصلہ تو کر لیتے ہیں، لیکن اس کے نتائج کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں

نہیں رہتے، پیچھے ہٹ جاتے ہیں، وہ فیصلہ نہیں ہوتا۔ انھیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ فیصلے کیلئے خود پر اعتماد بہت ضروری ہے۔ وہ تمام لوگ جن کا دوسرے لوگوں پر اعتماد ہوتا ہے، لیکن اپنے آپ پر نہیں ہوتا، وہ مسئلے کو تکتے رہے ہوتے ہیں، حل کی طرف نہیں دیکھتے۔ ایسے لوگ کبھی اچھا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اگر وہ فیصلہ کر بھی لیں تو غلط کریں گے، کیوں کہ حل کی بجائے مسئلہ کی بنیاد پر فیصلہ کریں گے۔ اُن کی بنیاد غلط ہے۔

آدمی ہمیشہ اچھے فیصلے برے فیصلوں سے سیکھتا ہے، کیونکہ غلط فیصلوں کے بعد سبق ملتا ہے۔ جب یہ پتا لگ جاتا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا تو پھر اکثر فیصلے صحیح ہونے لگتے ہیں، کیونکہ وہ فیصلے تجربے کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کے سارے فیصلے ٹھیک ہوں۔ انسان ہونے کے ناتے اس میں سو خامیاں ہوتی ہیں۔ کوئی انسان کل سے واقف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ کل کو نہ جاننے کی وجہ سے کچھ فیصلے غلط ضرور ہوتے ہیں، لیکن اس کا قطعی مطلب یہ نہیں ہے کہ بندہ قدم ہی نہ اٹھائے اور کوئی فیصلہ ہی نہ کرے۔

فیصلہ سے پہلے مشورہ

جو لوگ فیصلہ کر کے بدل جاتے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ پہلے رکیں، معاملہ سمجھیں، غور کریں اور کسی سے مشورہ کریں۔ مشورہ کرنا سنت ہے اور اس میں بڑی قوت ہے۔ جب کسی سے مشورہ کیا جاتا ہے تو اس سے اس کی عقل بھی اس فیصلے میں شامل ہو جاتی ہے اور اس طرح فیصلے بہتر بھی ہو جاتے ہیں اور آدمی اپنے فیصلوں پر قائم بھی رہتا ہے۔

غلط فیصلے بھی کچھ نہ کچھ ضرور دے کر جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ براوقت بہت کچھ چھین کر جاتا ہے، لیکن براوقت بہت کچھ سکھا کر بھی جاتا ہے۔ غلط فیصلوں سے آدمی جو کچھ سیکھتا ہے، دراصل وہ قیمت ادا کرتا ہے۔ وہ قیمت عقل اور دانش کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہ عقل

ودانش آدمی کی زندگی کو قیمتی بناتی اور اس سے منسلک لوگوں کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ کا بندے پر بے شمار کرم ہے، بے شمار فضل ہے، وہاں عقل اور شعور کا مل جانا، دانش حاصل ہو جانا بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے۔

مناسب وقت کا انتظار

جو لوگ مناسب وقت کی تلاش میں رہتے ہیں، وہ کبھی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں، ''جو کہتا ہے، میں کل بدلوں گا، اس کا کل کبھی نہیں آتا۔'' مناسب وقت کا بہانہ بڑی نالائقی ہے۔ اگر آپ نے مناسب وقت میں فیصلہ کرنا ہے تو اس کیلئے دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک اس بات کی عادت نہیں ہونی چاہیے کہ میں مناسب وقت کا بہت زیادہ انتظار کیا جائے۔ کسی معاملے میں فیصلہ کرنے سے پہلے سوال کیجیے کہ اس فیصلہ کو کب تک ٹالا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک وقت ہے۔ اس کے بعد فیصلہ نہ کرنے سے نقصان ہوگا۔ یہ نقصان فیصلے میں تاخیر کی واضح علامت ہے۔ دوسری بات یہ کہ مناسب وقت وہ بہترین وقت ہوتا ہے کہ جب آدمی تکلیف میں ہوتا ہے، کیونکہ انسان تکلیف میں رہ کر سب سے زیادہ سیکھتا ہے کہ اب مجھے یہ غلطیاں نہیں دہرانی۔

جب بھی آدمی غلطیوں سے سیکھ کر فیصلہ کرتا ہے تو وہ تبدیلی کا وقت ہوتا ہے۔ آئیڈیل وقت وہ ہوتا ہے کہ جس وقت آدمی کے پاس علم آجائے، شعور آجائے، سمجھ آجائے۔ بعض اوقات ہمیں تھوڑی سی ہمدردی چاہیے ہوتی ہے، تھوڑا سا ساتھ چاہیے ہوتا ہے، کندھا چاہیے ہوتا ہے، جب کندھا مل جائے، ساتھ مل جائے، عقل مل جائے اور ہمدردی مل جائے تو یہ بھی فیصلے کیلئے آئیڈیل وقت ہوتا ہے۔ فیصلے کا بہترین وقت وہ بھی ہوتا ہے کہ جب آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ میں فیصلے کے بعد اس کے نتائج کو سنبھال سکتا ہوں۔

بے شمار لوگ فیصلہ تو کر لیتے ہیں، لیکن اس کے نتائج کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں

ہوتے۔ اگر آپ فیصلہ کر کے یہ کہنے کیلئے تیار ہو گئے ہیں کہ اب طوفان آئے، باد و باراں آئے، کچھ ہو جائے، میں نتائج قبول کروں گا تو پھر یہ جرات اور یہ ہمت فیصلے کیلئے مناسب وقت تخلیق کر دیتی ہے۔

ماہرین اور دانشور اس بات کے قائل ہیں کہ کبھی بھی غصے اور خوشی کی کیفیت میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے، یعنی وہ تمام حالتیں جس میں آدمی جذبات میں قید ہو، اس کیفیت میں کبھی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ وہ تمام فیصلے جو فرد نے شدید جذباتی کیفیت میں کیے جاتے ہیں، زیادہ تر ان پر پچھتانا پڑتا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''غصہ وہ شیر ہے جو پورے مستقبل کو بکرا بنا کر کھا جاتا ہے۔''

ناامیدی کی حالت میں بھی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس حالت میں اندر کی آنکھ ایسی تصویریں دکھا رہی ہوتی ہے جس سے لگتا ہے کہ مستقبل اچھا نہیں ہے۔ اس حالت میں ناامیدی کے جذبات غالب ہوتے ہیں۔

جب بھی فیصلہ کریں تو دیکھئے کہ ہمارے دماغ کا حقیقت پسندانہ حصہ کتنا متحرک ہے، کیونکہ وہ اعداد و شمار بناتا ہے، خطرات کا جائزہ لیتا ہے، مستقبل کا سوچتا ہے اور اندازہ لگاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کبھی جست لگانے کا فیصلہ کرنا ہو تو پہلے دیکھئے کہ زندگی میں پہلے جو چھلانگیں لگائی ہیں، اُن کا نتیجہ کیا رہا۔ پھر فیصلہ کیجیے، کیونکہ ان سے فیصلے کی قوت ملتی ہے۔ جب فیصلہ کرنا ہو تو اس کو کچھ وقت کیلئے روک لیں۔ تھوڑا سا وقت لے لیں، کیونکہ جن جذبات نے فرد کو قابو کیا ہوتا ہے، وہ ان سے باہر نکل آتا ہے۔

زندگی ایک لمحے میں بدل سکتی ہے

زندگی صدیوں میں، سالوں میں، مہینوں میں اور دنوں میں نہیں بدلتی بلکہ زندگی ایک لمحے میں بدل جاتی ہے اور وہ لمحہ وہ ہوتا ہے کہ جب آدمی فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے اپنی زندگی

بدلنی ہے۔ اگر دو سمتیں بنی ہوں، ایک پر ''اوسط'' لکھا ہوا اور ایک پر ''یادگار'' اور آپ کو فیصلہ کرنا ہو کہ مجھے باقی کی زندگی معیاری اور اعلیٰ گزارنی ہے تو اپنے اندر کی تصویر میں ''یادگار'' کو نشان زد کیجیے۔ اس دنیا میں مثالیں دینے والے بے شمار ہیں، لیکن مثال بننے والے بہت کم ہیں۔ مثال بننے والے انسان بنیں۔ کہا جاتا ہے، اس دنیا میں نہ کوئی کامیاب ہے اور نہ کوئی ناکام ہے۔ اس دنیا میں صرف انتخاب ہے اور انتخاب فیصلوں سے ہوتا ہے۔ اپنے فیصلوں میں اللہ تعالیٰ کو شامل کیجیے، کیونکہ جب آپ اللہ تعالیٰ کو شامل کرتے ہیں تو وہ آپ کے فیصلوں میں برکت ڈال دیتا ہے۔ وہ فیصلے نہ صرف اچھے نتائج دیتے ہیں، بلکہ ان فیصلوں سے دوسروں کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ دوسروں کو بدلنے کا فیصلہ چھوڑیے، خود کو بدلنے کا فیصلہ کیجیے، کیونکہ خود کے بدلنے سے کتنے ہی لوگوں کی زندگی بدل جائے گی۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ہم کتنے قیمتی انسان ہیں۔ جب ہم بدلتے ہیں تو کتنا کچھ بدل جاتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اپنے آپ کو بدلنے کا فیصلہ کیجیے۔

درست سمت

"اپنے خوابوں کی سمت پورے اعتماد سے بڑھو؛ اور ویسی زندگی گزارو، جیسی تم چاہتے ہو!"

ھنری ڈیوڈ تھوریو

انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے۔ جس طرح انسان اپنے جسم کو بہتر بناتا ہے، اسی طرح روح کو بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب یہ دونوں بہتر ہوں تو سمت درست ہوتی ہے۔ انسان کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ محرک ذہن ہے یا کوئی اور چیز ہے۔ مثال کے طور پر، جسم کو کرنٹ لگے تو بغیر کسی سوچ کے ہاتھ فوری طور پر پیچھے کی جانب حرکت کرتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ آخر کون سی ایسی چیز ہے جو سوچنے سے پہلے یہ فیصلہ کرواتی ہے کہ ہاتھ پیچھے کرنا ہے۔

نفس اور ذہن

بعض معاملات کے پیچھے ذہن ہوتا ہے، جبکہ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کے پیچھے نفس ہوتا ہے۔ جیسے ضرورت سے زیادہ چاہنا۔ یہ کام نفس لوامہ کا کام ہے۔ نفس لوامہ کی وجہ سے جبلت جانوروں جیسی ہو جاتی ہے۔ بعض کاموں کے بعد شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کام نفس عمارہ کراتا ہے۔ یہی نفس عمارہ پشیمانی بھی دیتا ہے اور ندامت بھی۔

بعض اوقات انسان چاہتا ہے کہ میں دوسروں کی مدد کروں، دوسروں پر روپیہ پیسہ نثار کروں، دوسروں کی خاطر اپنا وقت استعمال کروں، میری توانیاں دوسروں کیلئے استعمال

ہوں، میری وجہ سے کسی کا بھلا ہو۔ یہ کام نفس مطمئنہ کراتا ہے۔ نفسِ مطمئنہ انسان کو ہر حال میں مطمئن رہنے کو کہتا ہے۔

ہائی جیکر

انسان کے اندر بہت سارے ہائی جیکرز ہوتے ہیں اور وہ ہائی جیکرز اس کی سمت متعین کرتے ہیں۔ ایک طیارہ فضا میں پرواز کرتا ہے۔ اچانک ایک ہائی جیکر اٹھتا ہے، ہتھیار نکالتا ہے، پائلٹ کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ جہاں میں چاہتا ہوں، جہاز کو وہیں لے کر جاؤ۔ مسافروں کو کہہ دیا جاتا ہے کہ اگر کسی نے ہلنے کی کوشش کی تو جہاز تباہ کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد آواز آتی ہے کہ طیارہ اغوا ہو گیا۔ جس طرح ایک ہائی جیکر طیارہ اغوا کرتا ہے، اسی طرح انسان صحیح چل رہا ہوتا ہے کہ اچانک اس کے اندر سے ایک ہائی جیکر اٹھتا ہے جسے نفس لوامہ کہا جاتا ہے، وہ اسے اغوا کر لیتا ہے۔ اسے غصہ آتا ہے۔ وہ فیصلہ کرتا ہے اور سامنے کھڑے شخص کو قتل کر دیتا ہے۔ یوں زندگی کا طیارہ کریش ہو جاتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ انسان نے اپنے اس ہائی جیکر کو کنٹرول نہیں کیا ہوتا۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی سمت درست ہو، وہ کامیاب ہو، لیکن اس سے پہلے ہائی جیکر کو کنٹرول کرنا بہت ضروری ہے۔

انسان کی زندگی میں کئی طرح کے ہائی جیکرز ہوتے ہے۔ ان میں لالچ ایک اہم ہائی جیکر ہے۔ لالچ ہمیشہ اس شخص میں ہوتا ہے جو اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنا یا تو اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہوتا ہے یا پھر اس کی وجہ معاشرہ بنتا ہے۔ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے کا ایک محرک کرپشن ہے۔ کبھی اس بات پر غور نہیں کیا گیا۔ یہ کیوں ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید اس موضوع پر سمینار کرنے سے یہ ختم ہو جائے گی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ پانی کے لیک ہونے کی جگہ تلاش کر لی جائے، لیکن پیوند کسی دوسری جگہ لگایا جائے۔ جس معاشرے میں کرپشن کم ہوتی ہے، وہاں پر لوگ اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں۔ انھیں پتا

ہوتا ہے کہ کچھ ہو بھی جائے تو حکومت ہمارے بچوں کو سنبھالے گی، کیونکہ یہ اس کی ذمے داری ہے۔

غیر محفوظ کو محفوظ بنانے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ محنت کر کے ساری چیزیں جیسے گھر، گاڑی اور آسانیاں لائی جائیں کیونکہ جب آسانیاں آتی ہیں تو آدمی اپنے آپ کو محفوظ سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اندر توکل پیدا کیا جائے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے، کیونکہ جب توکل اور شکر ہوتا ہے تب بھی آدمی اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے۔ پہلا طریقہ تو تقریباً ناممکن ہے، دوسرا طریقہ بہت آسان اور عملی ہے۔

عادات کا ہائی جیکر

زندگی کا ایک بہت بڑا ہائی جیکر ہماری عادات ہیں۔ زیادہ تر عادات لاشعوری طور پر بنتی ہیں، لیکن جب شعور آتا ہے تو ہمیں یہ انتخاب (چوائس) مل جاتا ہے کہ کس عادت کو اختیار کیا جائے۔ بعض لوگوں کی شخصیت تو بہت شان دار ہوتی ہے، لیکن عادات ٹھیک نہیں ہوتیں۔ بعض کے والدین کا بہت نام ہوتا ہے، لیکن اولاد میں وہ عادتیں نہیں ہوتیں۔ بعض خود بہت اچھے ہوتے ہیں، لیکن ان کا برتاؤ ملازموں کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا۔ بعض عادتیں نسلوں تک چلتی رہتی ہیں۔ بعض پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہوتا ہے کہ ان کی عادات بادشاہوں والی ہو جاتی ہیں۔ عادات یا تو انسان کو بنا دیتی ہیں یا تباہ کر دیتی ہیں۔ انسان پہلے عادات بناتا ہے پھر وہی عادات انسان کو بناتی ہیں۔

جذبات کی ہائی جیکنگ

انسان کی زندگی میں جذبات بھی بہت بڑا ہائی جیکر ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے جذبات کا اظہار وقت پر نہیں کرتا۔ پھر ایک عمر گزر جانے کے بعد اس کا اظہار کرتا ہے، لیکن

اس وقت سوائے عزت کو خاک میں ملانے کے اور کچھ نہیں ملتا۔ جیسے بعض لوگوں کے پاس روپیہ، پیسہ، عزت، شہرت سب کچھ ہوتا ہے لیکن عمر کے آخری حصے میں جذبات میں آکر شادی کر لیتے ہیں یا میاں بیوی میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔ اچھا بھلا گھر برباد ہو جاتا ہے اور یوں وہ اپنے جذبات کے ہاتھوں اپنی عزت گنوا دیتے ہیں۔

اپنی سمت درست رکھنے کیلئے اپنے ہائی جیکروں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کیجیے۔

کتاب زندگی بدل دیتی ہے

کتابیں آدمی کی سمت بدل دیتی ہیں۔ بعض اوقات کتاب کا احترام اتنا ہوتا ہے کہ فیض ملنا شروع ہو جاتا ہے، جیسے بعض اوقات ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور اس تقدس و احترام کی وجہ سے زندگی میں ہدایت آجاتی ہے۔ اسی طرح سچی طلب، تلاش، محبت اور ادب سمت بدل دیتی ہیں۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے اپنی زندگی میں بہت کم روٹی کھائی۔ کسی نے پوچھا کہ آپ اتنا کم کیوں کھاتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی مقدار میں گندم کھائی تھی تو میری کیا مجال کہ میں اس مقدار سے زیادہ گندم کھاؤں۔ یہ ادب کی انتہا ہے۔

اچھے اور برے ساتھی

جب اللہ تعالیٰ کا کرم ہوتا ہے تو بندے کی زندگی میں اچھے لوگ آنا شروع ہو جاتے ہیں اور وہ اس کی سوچ کو مثبت کر دیتے ہیں۔ پھر اس مثبت سوچ سے اس کے ذریعے دوسروں کو اچھائی ملنا شروع ہو جاتی ہے۔ لالچی انسان کے پاس لالچ اتنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ والے لوگوں کو لالچی بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس سخی انسان دوسروں کو اپنی اچھی عادات منتقل کرتا ہے۔ وہ خاموشی سے نصیحت کرتا ہے۔ خاموشی سے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اس کا

برتاؤ اتنا اچھا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ والے لوگ بھی اچھے ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کے ملنے سے اندر کی کمینگی جاگ جاتی ہے جبکہ بعض لوگوں کے ملنے سے اندر کی روحانیت جاگ جاتی ہے۔ بعض لوگوں کے ملنے سے حیا آ جاتی ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''ایک شخص اچھی زندگی نہیں گزار رہا تھا۔ ایک دم نیک ہو گیا۔ کسی نے پوچھا، یہ اچانک کیا ہوا؟ اس نے جواب دیا، میری زندگی میں پیر صاحب آ گئے ہیں۔ اس نے کہا، کون سے پیر صاحب ہمیں بھی ان سے ملاؤ۔ اس نے جواب دیا، میرے پیر صاحب میری بیٹی ہے۔'' حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''اچھے لوگوں کی زندگی میں موجودگی اچھے مستقبل کی ضمانت ہے۔'' جب تک اپنے علم اور ادب کو اللہ تعالیٰ کا فضل کہیں گے، یہ قائم رہے گا لیکن جب یہ سمجھیں گے کہ یہ میرا کمال ہے تو پھر ناکامی شروع ہو جائے گی۔

درست ترین سمت

ہمارے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے رول ماڈل ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اپنوں کو اکٹھا کر کے دعوت دی اور کہا کہ اگر میں کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے دشمن کا لشکر ہے تو جواب میں انھوں نے کہا، ہماری جانیں آپؐ پر نثار، آپؐ سچے ہیں، صادق و امین ہیں۔ ان میں ایک شخص جس کا نام عمر بن ہشام (ابو جہل) تھا، اٹھا اور چل پڑا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی اور کہا کہ کیا آپ اس بات کو نہیں مانیں گے؟ اس نے کہا، میں تلوار لینے جا رہا ہوں، مجھے آپؐ پر اتنا یقین ہے کہ اگر اس پہاڑ کے پیچھے لشکر ہے تو تلوار لاتا ہوں اور اس لشکر والوں کی گردنیں اڑا دوں گا۔ مجھے تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اگلی بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی کہ اگر میں ''لا الہ الا اللہ'' قبول کرنے کا کہوں تو؟ اس پر ابو جہل نے کہا کہ میرے باپ داداؤں کا جو دین ہے، وہ یہ نہیں

ہے۔ میں ایک خدا کو نہیں مان سکتا۔

لیکن اسی محفل میں ایک نو سال کا بچہ (حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ) کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں مانوں گا۔ اس کے بعد ایک دوست (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے، میں مانوں گا۔ گھر کے اور چند لوگ یہ دعوت تسلیم کرتے ہیں۔ عظمت کی انتہا یہ ہے کہ آپ کے اپنے گھر والے آپ کو مانیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لیے کسی بھی لحاظ سے درست ترین سمت فراہم کرتی ہے۔

”کاش“ سے پہلے

اپنی زندگی کو سمت دیجیے، کیونکہ یہ ایک بار ملی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ یہ قدرت کا عطیہ ہے۔ جو ایک بار آ گیا، پھر نہیں آئے گا۔ انھی لوگوں کا نام زندہ رہے گا جو اچھے کام کریں گے اس لیے دلوں میں زندہ رہنے والے کام کیجیے۔ اپنے اندر سوال پیدا کیجیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوں، کیا میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزار رہا ہوں؟ اگر یہ سوال دل میں آ گیا تو پھر یہ زندگی، زندگی نہیں رہے گی، عبادت بن جائے گی۔ لیکن اگر یہ سوال نہیں ہوگا تو پھر گھڑیاں گزریں گی، دن گزریں گے، ہفتے گزریں گے، مہینے گزریں گے اور زندگی بھی گزر جائے گی۔

آخر میں صرف ایک چیز ہوگی... کاش!

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کاش اور افسوس سے بچائے۔ آمین

ٹائم مینجمنٹ

''آپ یہ واضح نہیں کر سکتے کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ البتہ آپ اپنے بڑے اہداف اور بڑی منزلوں کا فیصل کر سکتے ہیں!''

کلیمنٹ اسٹون

لوگوں کی اکثریت کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ وقت کتنا قیمتی ہے۔ انھیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ زندگی ایک بار ملی ہے اور اس میں بھی آدھی زندگی گزرنے کے بعد جا کر شعور ملا اور یہ شعور ملنے کے بعد بھی یہ نہیں دیکھا کہ وقت کو کہاں استعمال کرنا ہے۔ انسان جس طرح پیسے کے متعلق سوچتا ہے کہ اسے کہاں خرچ کرنا ہے، اس کا بہتر استعمال کیسے کرنا ہے، اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کیسے اٹھانا ہے، اسی طرح اسے چاہیے کہ وقت کی اہمیت کو بھی جانے۔

سید قاسم محمود مرحوم ادب کی دنیا کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ انھوں نے لٹریچر پر بہت کام کیا۔ ان کے آخری ایام میں ایوانِ اقبال، لاہور میں ان کے کام کے حوالے سے ایک پروگرام منعقد ہوا۔ اس میں ان کی کتابیں اور رسائل رکھے گئے۔ ایک بڑا ذخیرہ تھا جس نے خاصی جگہ گھیر لی۔ ایک شخص کا اتنا کام؟ کسی نے ان سے پوچھا کہ قاسم صاحب، آپ ایک فرد ہیں۔ آپ نے اداروں جتنا کام کیسے کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے تو کچھ نہیں کیا، بس میں نے وقت کو صحیح استعمال کیا ہے۔ شہید حکیم محمد سعید اُن کے گہرے دوست تھے۔ حکیم صاحب سید صاحب کی مثال دے کر کہا کرتے تھے کہ دیکھو، یہ جن ہے جن!

اگر ایک شخص ٹھان لے کہ اسے اپنا وقت قابو کرنا ہے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ

اٹھاتا ہے تو وہ کم وقت میں زیادہ کام کرنے کا ہنر سیکھ سکتا ہے۔

ہر انسان کو برابر کا وقت ملتا ہے

قدرت ہر شخص کو دن بھر میں 1440 منٹ، ہفتے میں سات دن، مہینے میں تیس دن اور سال میں 365 دن دیتی ہے، یعنی ہر ایک کو برابر کا وقت ملتا ہے۔ لیکن ہر ایک کا استعمال مختلف ہوتا ہے۔ لوگوں کا ایک ایسا طبقہ ہے جو بہت مصروف ہوتا ہے۔ وہ بہت خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ وقت کم ہے اور کام زیادہ ہے۔ جبکہ دوسری طرف ایک ایسا طبقہ بھی ہے جس کا وقت گزرتا ہی نہیں۔ ایسے لوگ اپنا وقت ٹی وی دیکھ کر، سو کر، سوشل میڈیا پر یا آوارہ گردی میں گزار دیتے ہیں۔

جو شخص تنظیم وقت کرنا چاہتا ہے، وہ سب سے پہلے یہ دیکھے کہ مجھ سے اپنا وقت کیوں قابو نہیں ہو رہا۔ سب سے پہلے وہ اس کی فہرست بنائے۔ جب فہرست بنے گی تو بہت سے ایسے کام نکلیں گے جو اس کے وقت کے ضیاع کا باعث بن رہے ہوں گے۔

پرائم ٹائم

ہر شخص کے چوبیس گھنٹوں میں کچھ وقت اس کا ''پرائم ٹائم'' ہوتا ہے۔ پرائم ٹائم وہ وقت کہلاتا ہے کہ جب آدمی کم وقت میں زیادہ معیار اور زیادہ مقدار کا کام کر سکتا ہے۔ مختلف افراد کیلئے پرائم ٹائم مختلف ہوتا ہے۔ کئی لوگوں کیلئے صبح سویرے کا وقت بہتر ہوتا ہے تو بعض لوگوں کیلئے رات کا۔ تاہم، اسلامی فلسفے کے مطابق، کام کرنے کا بہترین وقت تہجد سے لے کر زوال تک کا وقت ہے۔ قرآن میں بھی ہے کہ ہم دن کو کام کرنے کیلئے اور رات کو آرام کیلئے بنایا ہے۔ اس حوالے سے دنیا کے کامیاب ترین اور امیر ترین افراد کی زندگی کا مطالعہ کیا گیا تو پتا چلا کہ وہ لوگ دیر سے سوتے ہیں اور جلد اٹھتے ہیں۔ امریکا میں کی گئی تحقیقات

کے مطابق، عموماً دنیا کے امیر ترین افراد صبح تین سے چار بجے اٹھ جاتے ہیں اور پھر نہیں سوتے۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہی فطری طریقہ ہے۔

بہ ہر کیف، اپنے پرائم ٹائم کو جانچ کر اس کے مطابق اپنے کاموں کو ترتیب دیجیے۔ آپ کا جو بھی پرائم ٹائم ہے، اس میں وہ کام کیجیے جو آپ کی زیادہ توجہ مانگتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے کام جو نسبتاً کم توانائی اور توجہ کے طالب ہیں۔ اگر آپ پرائم ٹائم میں کم تر توجہ کا کام کریں گے تو باقی وقت میں زیادہ توجہ کا طالب کام کرنا پڑے گا۔ یوں، آپ کا وقت زیادہ لگے گا، مگر نتیجہ کم تر ہو گا۔

بڑی تعداد میں لوگ اپنی دفتری زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف، ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف اپنی ذاتی زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی فیملی کو ہی اصل زندگی سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کو اپنی زندگی کا اثاثہ سمجھتے ہیں۔ جو لوگ جس قسم کی زندگی کو اصل سمجھتے ہیں، وہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ اس میں گزارتے ہیں۔

جو نوجوان تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ان کی بہت بڑی تعداد یہ سمجھتی ہے کہ ہم جیسے ہی تعلیم سے فارغ ہوں گے، ہمیں فوراً جاب مل جائے گی، پھر ہمیں زیادہ وقت مل پائے گا۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا۔ جاب ملنے میں کچھ عرصہ لگتا ہے۔ ڈگری لینے کے بعد جو نوجوان جاب کا انتظار کرتے ہیں، ان میں نوے فیصد جاب ملنے تک فارغ رہتے ہیں، حالانکہ انھیں چاہیے کہ اس دوران وہ کوئی ایسا کام کریں جس میں بے شک تنخواہ کم ہو، معیار بھی وہ نہ ہو، مگر اس سے انھیں سیکھنے کو بہت کچھ ملے گا۔ انسان بنیاد کو نہیں دیکھتا، وہ بلندی کو دیکھتا ہے جبکہ بلندی کیلئے بنیاد کی مضبوطی ضروری ہے۔

سات ٹوکریاں

ہماری زندگی کے سات حصے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ زندگی کی سات ٹوکریاں ہیں اور اپنے وقت کو ان ساتوں ٹوکریوں میں رکھنا ضروری ہے۔ کسی ایک ٹوکری کو بھی نظر انداز کر دیا گیا تو زندگی متوازن نہیں ہے۔ جب زندگی متوازن نہیں ہوگی تو پریشانیاں جنم لیں گی۔ زندگی کی یہ سات ٹوکریاں کچھ یوں ہیں:

1- پہلی ٹوکری: اپنی ذات خمہ نہ لگایا جائے

اس میں دیکھا جاتا ہے کہ صحت کی طرف توجہ کتنی ہے، کیا سیلف ایمپروومنٹ ہو رہی ہے۔

2- دوسری ٹوکری: اپنی فیملی

اس میں دیکھا جاتا ہے کہ آپ کتنا وقت اپنی فیملی کو دے رہے ہیں اور اس میں کتنی بہتری ممکن ہے۔

3- تیسری ٹوکری: پروفیشن

اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ پروفیشن کیسا ہے اور پروفیشنل زندگی کیسی ہے۔

4- چوتھی ٹوکری: سوسائٹی

یہ سوشل سرکل ہے۔ اس میں دیکھا جاتا ہے کہ زندگی میں حلقہ احباب کتنے ہیں۔ کون سے مفید ہیں اور کون سے مضر ہیں۔ کتنوں کو رکھنا ہے، کتنوں کو نہیں رکھنا۔ کیا درکار وقت دیا جا رہا ہے یا ضرورت سے زیادہ وقت یہاں صرف ہو رہا ہے۔

5- پانچویں ٹوکری: خدمت

اس میں دیکھا جاتا ہے کہ دوسروں کی خدمت کی حوالے سے بھی کوئی کردار ادا ہو رہا ہے کہ نہیں۔ یا انسانیت کی خدمت کیلئے کوئی وقت مختص ہے۔

6- چھٹی ٹوکری: مذہب

اس کا تعلق روحانی نمو سے ہے۔ اس میں دیکھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کتنا تعلق ہے۔ کیا مادہ پرست ہو کر تو نہیں رہ گئے۔ کیا اللہ کے حقوق ادا کیے جا رہے ہیں۔ اللہ کیلئے کتنا وقت رکھا ہے۔

7- ساتویں ٹوکری: تنہائی

اس میں دیکھا جاتا ہے کہ انسان اپنے ساتھ کتنا وقت گزارتا ہے۔ انسان اپنے سے کتنی دیر ملاقات کرتا ہے۔ وہ خود سے باتیں کرتا ہے یا نہیں۔ وہ اپنے حقوق کو جانتا ہے کہ نہیں۔

یہ زندگی کے سات رنگ ہیں۔ خوش قسمت انسان وہ ہے جس کے اندر یہ سارے رنگ پائے جاتے ہیں۔ انھی سات رنگوں میں اپنے وقت کو متوازن طور پر تقسیم کرنا دراصل ٹائم مینجمنٹ ہے۔ عین ممکن ہے، کسی دن فیملی کو زیادہ وقت کی ضرورت ہو۔ اس دن دفتر سے چھٹی کرنا ہوگی۔ عین ممکن ہے، کسی دن آفس میں کام زیادہ ہو جس کی وجہ سے گھر والوں کو پورا وقت دینا مشکل ہو جائے گا۔ عین ممکن ہے، دوست تکلیف میں ہو۔ اس کو زیادہ وقت کی ضرورت ہو۔ عین ممکن ہے، آپ بیمار ہوں اس لیے اپنی صحت کیلئے زیادہ وقت چاہیے۔ عین ممکن ہے، آپ اپنے تئیں کُڑھ رہے ہوں اور ایسا لگ رہا ہو کہ زندگی میں کسی شے کی کمی ہے حالانکہ بہ ظاہر کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اس وقت آپ کو تنہائی کیلئے زیادہ وقت چاہیے۔

یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ وقت کہاں کہاں تقسیم کرنا ہے اور ابھی کہاں کہاں لگ رہا ہے۔ ترجیحات کا تعین بہت ضروری ہے۔

وقت کی کمی کا مسئلہ کن لوگوں کیلئے نہیں ہے؟

ایک خاص روٹین کے ساتھ کام کرنے والوں کیلئے ٹائم مینجمنٹ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ نو اور پانچ کے پھیرے میں رہتے ہیں۔ انھیں اپنے وقت کو ترتیب اور تنظیم کرنے کی

ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ واضح رہے، ٹائم مینجمنٹ اُن افراد کا مسئلہ ہے جو وقت کی کمی کا احساس رکھتے ہیں، جو اپنی ایک زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں، جو اپنے معمولی اوقات کو غیر معمولی نتائج میں بدلنے کیلئے پاگل ہوئے جاتے ہیں۔ جو اپنے اندر سوئے جن کو جگا چکے ہیں اور اب اس جن سے کام لینا چاہتے ہیں۔

جب یہ کیفیت ہو جاتی ہے تو پھر کام زیادہ ہوتا ہے اور وقت بہت کم۔

پرو ایکٹو کردار

دنیا کے کامیاب لوگوں کی عادات میں سے ایک عادت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ پرو ایکٹیو (Proactive) ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں والدین کو اپنے بچوں کا بیمہ کرانے کی بہت فکر ہوتی ہے، لیکن ان کی تربیت کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ اصل بیمہ ہے۔ پرو ایکٹیو کا مطلب ہے کہ آپ عمل کیلئے کتنے تیار ہیں؟ آنے والے اوقات کو کتنا پلان کیا؟ وقت کو ضائع ہونے سے کتنا بچایا؟ ایسے لوگ ہر وقت، ہر لمحہ اپنے آپ سے سیکھتے رہتے ہیں۔ جو آدمی اپنے روز و شب سے سیکھتا نہیں، وہ اپنے وقت سے زیادہ پاتا بھی نہیں۔

جو لوگ سیکھنے کا شوق رکھتے ہیں اور اپنے اندر تبدیلی کی لچک پیدا کر لیتے ہیں، ان کی ٹائم مینجمنٹ اچھی ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے بہ حیثیتِ قوم، ہم سیکھنے کو اہم نہیں سمجھتے۔ سیکھنے کیلئے کتاب کا مطالعہ اور حالات کا مشاہدہ اہم ذرائع ہیں۔ دنیا کے ذہین لوگ اپنی زندگی کی بدقسمتی اور خوش قسمتی کو معنی دیتے ہیں۔ جن لوگوں کی زبانوں پر ہر وقت گلہ شکوہ اور پچھتاوا رہتا ہے، یہ اس بات کی نشانی ہوتی ہے کہ وقت کا استعمال صحیح نہیں ہوا۔ مجھے ایک یونانی کہانی یاد آ گئی جس میں ہے کہ ایک شخص جب مرنے لگا تو اس کے سامنے تین لوگ آ گئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ تم ہمارے مجرم ہو۔ مرنے والے نے کہا، تم کون ہو، میں تمہیں نہیں جانتا۔ ان تینوں نے جواب دینا شروع کیا۔ ان میں سے پہلے نے کہا، میں وہ وقت ہوں

جو تمہیں ملا تھا لیکن تم نے مجھے ضائع کر دیا۔ دوسرے نے کہا، میں وہ توانائی ہوں جو تمہیں ملی تھی لیکن تم نے مجھے ضائع کر دیا۔ تیسرے نے کہا، ہم وہ ذرائع ہیں جو مالک نے بہانے بہانے سے تمہیں دیئے مگر تم نے ہمیں ضائع کیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ مرنے کے بعد انسان سے دنیا کے بارے میں پانچ سوال کیے جائیں گے۔ ان میں سے ایک سوال یہ ہوگا کہ اپنے وقت کو کیسے استعمال کیا۔ انسان جب اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مواقعوں کو ضائع کرتا ہے تو پھر یہی مواقع اس کے آخری وقت پر عذاب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ لہٰذا، وقت کو درست طریقے سے استعمال کرنا بہت ضروری ہے اور اس کیلئے ٹائم مینجمنٹ کی مہارت کا سیکھنا لازمی ہے۔

فطرت کے ہاں چھٹی نہیں

ترقی یافتہ ممالک کے لوگ اپنی چھٹی کو بھی پلان کرتے ہیں جبکہ ہم چھٹی والے دن لمبی تان کر سو جاتے ہیں اور پھر پورا دن برباد ہو جاتا ہے۔ یاد رکھیے، زندگی میں قانونِ قدرت کے تحت ''چھٹی'' کبھی نہیں ہے، صرف کاموں کی تبدیلی ہے۔

یہ زندگی اللہ تعالیٰ کا تحفہ ہے۔ اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا درست استعمال کرنا چاہیے۔ وقت اللہ تعالیٰ کا تحفہ اور انعام ہے۔ اس کو صحیح طریقے سے مینج کرنا چاہیے تاکہ زندگی میں آسانی پیدا ہو۔

نیو یارک میں پارکنگ پلازا انیس سو پچیس میں بننا شروع ہو گئے تھے، حالانکہ اس وقت پورے نیو یارک میں صرف پچیس گاڑیاں تھیں لیکن ان کی سوچ پروایکٹیو تھی۔ اس لیے انھوں نے یہ سوچ کر پارکنگ پلازا بنائے کہ آنے والے وقت میں یہاں پر گاڑیاں آئیں گی۔ چنیوٹ پاکستان کا واحد علاقہ ہے جہاں ہزاروں ارب پتی ہیں۔ ایک جگہ پر اتنے امیر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ تمام لوگ پروایکٹو لوگ تھے۔

اگر سیکھنے کی جستجو ہے تو انسان کی شخصیت تروتازہ ہے۔ اگر سیکھنے کی جستجو ہے تو انسان کی شخصیت میں چمک ہے۔ سیکھنے والا ہر وقت کھوج اور تلاش میں رہتا ہے۔ ایک تحقیق کے جن لوگوں کو سیکھنے کا شوق ہوتا ہے، ان کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ جب انسان یہ کہتا ہے کہ سب کچھ ختم ہو گیا تو پھر اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اب اس کا جینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

مارٹن لوتھر کنگ کہتا ہے کہ اگر آدمی نے کچھ کر کے دکھانا ہو تو اس کیلئے ایک زندگی کافی ہے، وگرنہ پانچ سو زندگیاں بھی مل جائیں تو وہ کچھ کر کے نہیں دکھا سکے گا۔

شوق کی تلاش

''میرے اندر کوئی خاص مہارت نہیں، بس میرا شوق اپنی انتہاؤں پر ہے!''

آئنسٹائن

کوئی نہیں چاہے گا کہ اس کی توانائیاں ضائع ہو جائیں۔ کوئی نہیں چاہتا کہ وہ ناکام ہو جائے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ اس کی زندگی بے مقصد ہو اور کوئی نہیں چاہتا کہ اسے کامیابی نہ ملے۔ ہر شخص ناکامی سے بچنے کیلئے غور و فکر کرتا ہے اور یہی غور و فکر اسے سنجیدگی کی طرف لے کر جاتا ہے۔

سنجیدگی کی سب سے پہلی نشانی یہ ہے کہ آدمی یہ دریافت کر لے کہ مجھے اپنی زندگی میں کس طرف جانا ہے، میرے لیے ہدایت کہاں پر ہے۔ اگر یہ احساسات نہ ہوں تو درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری کی نشانی ہے۔ وہ لوگ جنھیں خیال نہیں آتا، جو سوچ نہیں سکتے، ایسے لوگ صرف قبرستان میں پائے جاتے ہیں۔ زندہ انسان ہمیشہ اپنے آپ میں بہتری لانا چاہتا ہے، وہ اپنے آنے والے کل کو آج سے بہتر بنانا چاہتا ہے۔

محدود سوچ، محدود شعبے

زندگی کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں شعور نہیں ہوتا جبکہ دوسرے حصے میں شعور آتا ہے۔ عام طور پر لوگ شعوری زندگی میں یہ نہیں سوچتے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے کس کام کیلئے پیدا کیا ہے۔ زیادہ تر کی سوچ یہی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر یا انجینئر بن جائیں۔ یہ ذہن میں ہونا

چاہیے کہ دنیا میں صرف ڈاکٹر یا انجینئر ہی کے شعبے نہیں ہیں بلکہ اور بھی بہت شعبے ہیں۔ مگر لوگوں کی سوچ اتنی محدود ہے کہ وہ سوچتے ہیں کہ اگر میں ڈاکٹر یا انجینئر نہیں بن سکا تو میں ناکام ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے کام کرنے کے لامحدود راستے پیدا فرمائے ہیں، لیکن ان لوگوں کا انتخاب صرف دو راستوں تک محدود ہوتا ہے۔ انھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں ہوتا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ہمیں انجینئر بننے کیلئے پیدا کیا ہے؟ انہوں نے کبھی اپنے اندر کے آرٹسٹ کو نہیں دیکھا ہوتا۔ انھوں نے کبھی اپنے اندر کے سائنسدان کو نہیں دیکھا ہوتا۔ انھوں نے کبھی اپنے اندر کے ٹیچر کو نہیں دیکھا ہوتا۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں جانچا ہوتا کہ میرے اندر اصل ٹیلنٹ کیا ہے۔

دو چہرے

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ پہلی طرح کے لوگ وہ ہیں جنھیں صبح جلد اٹھنا عذاب لگتا ہے۔ انھیں اپنے کام سے کوئی محبت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کی زندگی میں کوئی چمک نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی میں بیزاری ہوتی ہے۔

دوسری طرح کے لوگوں کو اپنے کام سے محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت انھیں رات دیر تک جاگنے اور صبح جلد اٹھنے پر مجبور کرتی ہے۔ انھیں تھکاوٹ سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اپنے جسم سے نہیں بلکہ اپنی روح سے کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگ پہلے قسم کے لوگوں سے زیادہ چمک والے، متحرک اور شوق والے ہوتے ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی بیس سالہ تحقیق کے مطابق، اس دنیا میں ستانوے فیصد لوگ وہ کام کر رہے ہوتے ہیں جنھیں اُس کام کیلئے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہوتا۔ وہ شوق کے بغیر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ ظاہراً تو وہ زندہ ہوتے ہیں، لیکن حقیقتاً مردہ ہوتے ہیں۔ صرف تین فیصد لوگ وہ کام کرتے ہیں جو اُن کا شوق ہوتا ہے، جو اُن کا Passion ہوتا ہے، جس کیلئے وہ پاگل ہوئے جاتے ہیں۔

انسان کے دو چہرے ہیں۔ ایک چہرہ جو نظر آتا ہے جبکہ دوسرا چہرہ نظر نہیں آتا۔ وہ چہرہ کام کا چہرہ ہوتا ہے اور وہی اصل چہرہ ہوتا ہے، کیونکہ آدمی کی شناخت اس کا کام بناتا ہے۔ زندگی میں شناخت کیلئے سفر کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سفر بقول فائز حسن سیال کے، خودشناسی کا سفر ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

آپ کے اندر کا خزانہ

ہر شخص کے اندر ایک خزانہ ہوتا ہے اور وہ خزانہ شوق اور دلچسپی کا خزانہ ہے۔ انسان کی دلچسپی جس چیز میں ہوتی ہے، وہ خواہ کچھ ہی ہو، اس کو اس چیز کے متعلق ویسی معلومات، ویسی کتابیں، ویسی مجالس، ویسے دوست، ویسا ماحول اور ویسے ہیروز مل جاتے ہیں۔ چونکہ دلچسپی اور شوق مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ہر شخص کے ہیرو مختلف ہوتے ہیں۔ جو لیڈر ہو گا اس کیلئے محمد علی جناحؒ ہیرو ہوں گے، جبکہ جو مفکر ہو گا اس کیلئے حضرت علامہ محمد اقبالؒ ہیرو ہوں گے۔

انسان کا دوسروں سے متاثر ہونا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جو انسپائر ہوتی ہے۔ دوسری کوئی مخلوق کسی سے انسپائر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر انسپائریشن کا مادہ رکھا ہے اور اس خاصیت کی وجہ سے وہ اپنا شوق تلاش کرتا ہے۔ جس طرح ہر شخص اپنے جاننے والے کو پہچان لیتا ہے، اسی طرح جب اندر کے شوق کے متعلق چیزیں سامنے آتی ہیں تو وہ انھیں پہچان لیتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے اندر سے اسے جانتا ہے۔

اس سے بڑا جرم شاید اور کوئی نہیں کہ ایک شخص اپنی زندگی شوق کے بغیر گزار دے۔ شوق کے بغیر زندگی ایسے ہی ہے جیسے کانٹوں پر سونا اور تلواروں پر چلنا۔ اگر شوق سلامت ہو تو انسان کو رکاوٹ روک نہیں سکتی۔ حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں:

ایمان سلامت ہر کوئی منگے
عشق سلامت کوئی ہو

زندگی کا سب سے اہم سوال

شوق اللہ تعالیٰ کے دربار کی سوغات ہے۔ اسے کوئی کوئی پہچانتا ہے۔ کسی کسی کو اس کی شناخت ہوتی ہے۔ شوق کا پتا لگ جائے تو شخصیت میں اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ پھر انسان کو راستے کی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں لگتی۔ جیت اور ہار کی پروا ختم ہو جاتی ہے۔ دوسروں کی تنقید کا اثر نہیں رہتا۔ شوق والا معاوضے اور وقت کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ شوق کی مصروفیت میں اردگرد کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ شوق کے راستے پر چلنے والا مقابلہ نہیں کرتا۔ مقابلہ ہمیشہ تب ہوتا ہے کہ جب اپنی صلاحیتوں کا علم نہ ہو۔ شوق کا راستہ عبادت کا راستہ ہے، بلکہ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کا راستہ ہے۔ جس شخص کو اپنے شوق کا پتا لگ جاتا ہے وہ اپنے کام کو عبادت سمجھتا ہے۔ اس سے بڑا اور کوئی مقام نہیں ہے کہ اپنا کام عبادت لگنے لگے۔ اگر یہ نہیں تو کام عذاب لگتا ہے۔

انسانی زندگی میں سب سے قیمتی سوال یہ ہے کہ میرا شوق کیا ہے؟

یہ اتنا سنجیدہ اور اہم سوال ہے کہ جس کو بھی اس کا جواب مل گیا، پھر اسے خریدا نہیں جاسکا۔ شوق انسان کو خواب بنانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ سکون سے نہیں رہنے دیتا۔ شوق کی آگ سے پکی ہوئی ہانڈی بہت ذائقے دار ہوتی ہے۔ خلیل جبران کہتا ہے کہ وہ روٹی مزیدار نہیں ہوتی جس کے اندر شوق یا محبت نہیں ہوتی۔ ایک خاتون قلم کار برتن بناتی تھی۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تم برتن بناتی ہو۔ اس نے جواب دیا، ''نہیں، میں برتن نہیں بناتی، میں تو اپنے آپ کو بناتی ہوں۔'' اسی طرح شوق والا اپنے کام کو نہیں دکھاتا بلکہ اپنے کام کے ذریعے اپنے آپ کو دکھاتا ہے۔ وہ شوق کسی کام کا نہیں ہے جس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔ اور اگر شوق اور زمانے کی ضروریات مل جائیں تو یہ بہت خوش قسمتی کی بات ہے۔

کیا آپ زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں؟

جو لوگ اپنے شوق کو دریافت نہیں کرتے، وہ صرف زندگی کا سرکل پورا کرتے ہیں۔ انسان کی سب سے بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ سدا زندہ رہے۔ جینئس انسان وہ ہوتا ہے جو اپنے وقت اور کام کی سرمایہ کاری اس انداز سے کرے کہ اس کے جانے کے بعد بھی انسانیت اس سے استفادہ کرتی رہے۔ شوق سے کیا گیا کام آدمی کو امر کر دیتا ہے۔

زندگی میں مزہ پیدا کرنے کیلئے اپنا شوق دریافت کیجیے، کیونکہ بغیر شوق کے زندگی کا کوئی مزہ نہیں آئے گا۔ پینسٹھ سال کی زندگی میں انسان نوے ہزار گھنٹے کام کرتا ہے۔ اس کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ ان نوے ہزار گھنٹوں کو رو کر گزارہ جائے یا پھر انھیں اپنے شوق کی تکمیل کیلئے استعمال کر لیا جائے۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ "اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی..." ہماری زندگی کا راز ہمارے ہی اندر ہے۔ جب تک اس اندر کو تلاش نہیں کیا جائے گا، تب تک قرار نہیں آئے گا۔

چھوٹے انسان کی تقدیر دوسروں کے ہاتھوں پر لکھی ہوتی ہے جبکہ بڑے انسان کے ہاتھ پر زمانے کی تقدیر لکھی ہوتی ہے۔ حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی وجہ سے کتنے ہی انسانوں کی زندگی بدل گئی، کیونکہ ان کے ہاتھ پر زمانے کی تقدیر لکھی ہوئی تھی۔ جبکہ تمام جہانوں کی تقدیر ہمارے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر لکھی ہوئی ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہانوں کیلئے رحمت ہیں۔

ابھی، یہیں ٹھہریے اور اپنے آپ سے سوال کیجیے... آپ کا شمار کن لوگوں میں ہوتا ہے؟ کیا آپ نے اپنا شوق کھوج لیا ہے؟

ذہنی مضبوطی

''جب آپ وہ چیزیں چھوڑ دیتے ہیں جو آپ کو روکے ہوئے ہیں تو
آپ غیر معمولی کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں!''

ایمی مورن

انگریزی میں ایک کتاب 13 Things Mentally Strong People Don`t Do شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی مصنفہ ایمی مورن ایک ماہر نفسیات ہے۔ اس کتاب کا موضوع ذہنی صحت ہے۔ اس کتاب کا پس منظر یہ ہے کہ مصنفہ اپنی زندگی بڑی خوش و خرم گزاری رہی تھی کہ اچانک اسے دو قریبی احباب کی اموات کا سامنا کرنا پڑا جس میں ایک اس کا رشتے دار اور دوسرا اس کا شوہر تھا۔ ان غموں کی وجہ سے اس کی زندگی میں خوشیاں ختم ہو گئیں۔ پھر اسے ایک اور شخص ملا جس سے اس نے شادی کی۔ یہ شادی بہت خوب رہی۔ جب ایمی دوبارہ اپنی نارمل زندگی گزارنے لگی تو اس نے اُن لوگوں پر تحقیق شروع کی جو پریشانیوں اور مصیبتوں کا شکار ہونے کے باوجود ان سے نکل آتے ہیں۔ تحقیق کے بعد اس نے مذکورہ بالا کتاب لکھی۔ یہ بہت اہم بات ہوتی ہے کہ آدمی اپنے پروفیشن پر لکھے۔ وہ زیادہ پُر اثر ہوتا ہے، کیوں کہ اس میں اپنی زندگی کے حقیقی تجربات ہوتے ہیں۔

ذہنی طور پر مضبوط ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے خیالات، رویہ، نظریات اور جذبات اس کے کنٹرول میں ہوں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بات بات پر غصہ نکالتے نظر آتے ہیں، کیونکہ غصہ ان کے کنٹرول میں نہیں ہوتا۔ اگر بندے کا ردِعمل اس کے کنٹرول

میں نہیں ہے تو وہ ذہنی طور پر مضبوط نہیں ہے۔اس سے بڑی ذہنی مضبوطی اور کیا ہو سکتی ہے کہ تلوار دشمن کی گردن پر ہو اور وہ تھوک دے اور تلوار واپس ہو جائے اور کہا جائے کہ میں بدلہ نہیں لوں گا۔انھیں پتا تھا کہ اگر اس وقت تلوار چلی تو اس کو ایمان نہیں چلائے گا بلکہ غصہ چلائے گا،اور غصہ حرام ہے۔

ذہنی طور پر مضبوط لوگوں کی درج ذیل خصوصیات ہوتی ہیں:

1 خود پر ترس نہ کھانا

ذہنی طور پر مضبوط لوگوں کی پہلی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خود ترسی کا شکار نہیں ہوتے۔خود ترسی کی بیماری میں انسان اپنے آپ پر ترس کھانا شروع کر دیتا ہے۔جن لوگوں میں خود ترسی کی بیماری پائی جاتی ہے،وہ اپنے ہی مسئلوں کو سب سے بڑے مسئلے سمجھتے ہیں۔ اپنے آپ کو بدقسمت اور منحوس سمجھتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہی سب سے زیادہ مشکل میں ہیں۔ایسے لوگ اکثر شکایتیں کرتے نظر آتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ سب سے زیادہ محنت ہم کر رہے ہیں جبکہ ثمر دوسروں کو مل رہا ہے۔ایسے لوگ مثبت لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ایسے لوگ ان لوگوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو اُن کی تکلیفوں اور غموں کی حمایت کریں۔

خود ترسی سے بچنے کا بہترین حل یہ ہے کہ اپنی گفتگو کو مثبت بنائیں۔کم از کم وہ گفتگو ضرور ہونی چاہیے جو اپنے آپ سے ہو۔اگر ایسے دوست احباب ہیں جو متحمل مزاج اور مثبت ہیں تو اُن میں اٹھیں بیٹھیں اور اُن سے رائے لیں۔

2 اپنی طاقت کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھنا

رسول حمزہ کہتے ہیں کہ ادیب،شاعر،فلسفی،دانشور بسا اوقات محفل میں اکیلا ہوتا ہے،

اور بسا اوقات وہ تنہائی میں میلہ لگائے بیٹھا ہوتا ہے۔ یہ فوکس کا کمال لیول ہے کہ آدمی سب کے ساتھ ہو، لیکن وہ وہاں ہو جہاں وہ رہنا چاہ رہا ہے۔ اکثر بچے جن کے امتحانات ہو رہے ہوتے ہیں، وہ اپنے امتحانات کی تیاری میں اتنے گم ہوتے ہیں کہ اپنا ناپسندیدہ کھانا بھی کھا لیتے ہیں۔ ذہنی طور پر مضبوط لوگ اپنی طاقت کا ریموٹ کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ وہ یہ اختیار دوسروں کو نہیں دیتے۔ کسی کو اجازت نہیں ہے کہ وہ آپ کے موڈ پر اثر ڈال سکے۔ کسی کو اجازت نہیں کہ وہ آپ کا موڈ آف کر سکے۔ کسی کو اجازت نہیں ہے کہ وہ آپ کو شک میں مبتلا کر سکے۔ کسی کو اجازت نہیں ہے کہ وہ آپ کے نظریے کو بغیر کسی اپروچ کے بدل دے۔ کسی کو اجازت نہیں ہے کہ وہ آپ کے جذبات کو کنٹرول کرے۔

جن لوگوں کی طاقت دوسرے لوگ استعمال کرتے ہیں، ان میں یہ نشانیاں پائی جاتی ہیں: وہ تنقید کا زیادہ اثر لیتے ہیں۔ انھیں فیڈ بیک کی بہت زیادہ پروا ہوتی ہے اور کسی کے کہنے پر بہت جلد غصے میں آجاتے ہیں۔

3 تبدیلی قبول کرنا

جو لوگ ذہنی طور پر مضبوط ہوتے ہیں، وہ تبدیلی سے نہیں گھبراتے۔ وہ تبدیلی کو قبول کرتے ہیں۔ آج کل دنیا میں سب سے زیادہ چینج مینجمنٹ (Change Management) پڑھائی جا رہی ہے۔ ٹیکنالوجی اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے کہ چینج مینجمنٹ پڑھنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ بعض لوگوں کا تکیہ ہی بدل جائے تو انھیں نیند نہیں آتی، جبکہ بعض ہر جگہ خراٹے بھرتے نظر آتے ہیں۔ بعض طلبہ کا قلم بدل جائے تو وہ لکھ نہیں سکتے، جبکہ بعض بچوں کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ ان کا کام پر فوکس ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو سواری بدلنے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو گھر تبدیل کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ان کی در و دیوار سے محبت ایسی جڑی ہوتی ہے کہ وہ اُن سے نکل نہیں پاتے۔ ایسے لوگ جب بھی تبدیلی

میں نہیں ہے تو وہ ذہنی طور پر مضبوط نہیں ہے۔ اس سے بڑی ذہنی مضبوطی اور کیا ہو سکتی ہے کہ تلوار دشمن کی گردن پر ہو اور وہ تھوک دے اور تلوار واپس ہو جائے اور کہا جائے کہ میں بدلہ نہیں لوں گا۔ انھیں پتا تھا کہ اگر اس وقت تلوار چلی تو اس کو ایمان نہیں چلائے گا بلکہ غصہ چلائے گا، اور غصہ حرام ہے۔

ذہنی طور پر مضبوط لوگوں کی درج ذیل خصوصیات ہوتی ہیں:

1 خود پر ترس نہ کھانا

ذہنی طور پر مضبوط لوگوں کی پہلی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خود ترسی کا شکار نہیں ہوتے۔ خود ترسی کی بیماری میں انسان اپنے آپ پر ترس کھانا شروع کر دیتا ہے۔ جن لوگوں میں خود ترسی کی بیماری پائی جاتی ہے، وہ اپنے ہی مسئلوں کو سب سے بڑے مسئلے سمجھتے ہیں۔ اپنے آپ کو بدقسمت اور منحوس سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہی سب سے زیادہ مشکل میں ہیں۔ ایسے لوگ اکثر شکایتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب سے زیادہ محنت ہم کر رہے ہیں جبکہ ثمر دوسروں کو مل رہا ہے۔ ایسے لوگ مثبت لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ ایسے لوگ ان لوگوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو اُن کی تکلیفوں اور غموں کی حمایت کریں۔

خود ترسی سے بچنے کا بہترین حل یہ ہے کہ اپنی گفتگو کو مثبت بنائیں۔ کم از کم وہ گفتگو ضرور ہونی چاہیے جو اپنے آپ سے ہو۔ اگر ایسے دوست احباب ہیں جو متحمل مزاج اور مثبت ہیں تو اُن میں اٹھیں بیٹھیں اور اُن سے رائے لیں۔

2 اپنی طاقت کا کنڑول اپنے ہاتھ میں رکھنا

رسول حمزہ کہتے ہیں کہ ادیب، شاعر، فلسفی، دانشور بسا اوقات محفل میں اکیلا ہوتا ہے

اور بسا اوقات وہ تنہائی میں میلہ لگائے بیٹھا ہوتا ہے۔ یہ فوکس کا کمال لیول ہے کہ آدمی سب کے ساتھ ہو، لیکن وہ وہاں ہو جہاں وہ رہنا چاہ رہا ہے۔ اکثر بچے جن کے امتحانات ہو رہے ہوتے ہیں، وہ اپنے امتحانات کی تیاری میں اتنے گم ہوتے ہیں کہ اپنا ناپسندیدہ کھانا بھی کھا لیتے ہیں۔ ذہنی طور پر مضبوط لوگ اپنی طاقت کا ریموٹ کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ وہ یہ اختیار دوسروں کو نہیں دیتے۔ کسی کو اجازت نہیں ہے کہ وہ آپ کے موڈ پر اثر ڈال سکے۔ کسی کو اجازت نہیں کہ وہ آپ کا موڈ آف کر سکے۔ کسی کو اجازت نہیں ہے کہ وہ آپ کو شک میں مبتلا کر سکے۔ کسی کو اجازت نہیں ہے کہ وہ آپ کے نظریے کو بغیر کسی اپروچ کے بدل دے۔ کسی کو اجازت نہیں ہے کہ وہ آپ کے جذبات کو کنٹرول کرے۔

جن لوگوں کی طاقت دوسرے لوگ استعمال کرتے ہیں، ان میں یہ نشانیاں پائی جاتی ہیں: وہ تنقید کا زیادہ اثر لیتے ہیں۔ انھیں فیڈ بیک کی بہت زیادہ پروا ہوتی ہے اور کسی کے کہنے پر بہت جلد غصے میں آجاتے ہیں۔

3 تبدیلی قبول کرنا

جو لوگ ذہنی طور پر مضبوط ہوتے ہیں، وہ تبدیلی سے نہیں گھبراتے۔ وہ تبدیلی کو قبول کرتے ہیں۔ آج کل دنیا میں سب سے زیادہ چینج مینجمنٹ (Change Management) پڑھائی جا رہی ہے۔ ٹیکنالوجی اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے کہ چینج مینجمنٹ پڑھنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ بعض لوگوں کا تکیہ ہی بدل جائے تو انھیں نیند نہیں آتی، جبکہ بعض ہر جگہ خراٹے بھرتے نظر آتے ہیں۔ بعض طلبہ کا قلم بدل جائے تو وہ لکھ نہیں سکتے، جبکہ بعض بچوں کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ ان کا کام پر فوکس ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو سواری بدلنے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو گھر تبدیل کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ان کی درو دیوار سے محبت ایسی جڑی ہوتی ہے کہ وہ اُن سے نکل نہیں پاتے۔ ایسے لوگ جب بھی تبدیلی

کے بارے میں سنتے ہیں تو وہ اینزائٹی میں چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ Comfort zone سے باہر نہیں آتے۔ ایسے لوگ Discomfort کو پسند نہیں کرتے۔

4 تبدیل ہونے والی چیزوں پر فوکس کرنا

ذہنی طور پر مضبوط لوگ اپنا فوکس ان چیزوں پر رکھتے ہیں جنھیں وہ تبدیل کر سکتے ہیں۔ وہ طے کر لیتے ہیں کہ ہمیں صرف ان چیزوں پر کام کرنا ہے جو بدل سکتی ہیں۔ جو ہتھیار نتیجہ دے سکتا ہے، وہ طاقت میں ضرور آتا ہے۔

ذہنی طور پر کمزور لوگوں کے پاس بے شمار ایسی خواہشیں ہوتی ہیں جن کا اُن سے دُور دُور تک واسطہ نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ بہت سوں کو بدلنا چاہتے ہیں، لیکن خود کو نہیں بدلتے۔ ایسے لوگ ان چیزوں پر اپنی توانائی ضائع کرتے ہیں جن کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ پہلے ایسے لوگ سارا اخبار پڑھ کر ایسی خبروں پر تبصرہ کرتے تھے جنھیں وہ تبدیل نہیں کر سکتے، آج کل ایسے لوگ زیادہ تر فیس بک پر مل جائیں گے جو ایک سے ایک عجیب پوسٹ لگائیں گے، پھر انھی طرح کے کمزور ذہن رکھنے والے اس پر اس سے بھی عجیب کمنٹ کریں گے۔ پھر وہ ان کا جواب دیں گے۔ ان کے دن رات اسی کام میں گزرتے رہتے ہیں۔ وہ صرف اپنی ذہنی تسکین کرتے ہیں۔ اس حرکت سے رکنا، خود اُن کے اختیار میں نہیں ہوتا، کیونکہ یہ اُن کی عادت بن چکی ہوتی ہے۔

5 ہر ایک کو خوش کرنے کی کوشش نہ کرنا

ذہنی طور پر مضبوط لوگوں میں ہر ایک کو خوش کرنے کی فکر و خواہش نہیں ہوتی، کیونکہ وہ یہ حقیقت جانتے اور مانتے ہیں کہ ہر ایک کو خوش نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ایک کا زاویہ نظر اپنا ہے اور وہ اپنے زاویہ نظر سے دیکھتا ہے، اس لیے اس کی تسلی تشفی نہیں کی جا سکتی۔ ایسے لوگ ہر

ایک کو جواب نہیں دیتے۔ وہ صرف یہی کہتے ہیں کہ وقت جواب دے گا۔ مزا ہی اس بات میں ہے کہ مخالفت ہو، تنقید ہو، لیکن اس کے باوجود آدمی آگے بڑھتا چلا جائے۔

یہ لوگ دوسروں کی خفگی کی بجائے اپنی منزل کو سامنے رکھتے ہیں۔ یہ زندگی کا اصل لطف ہے۔ سب کو خوش نہیں کیا جاسکتا، بس انسان اللہ کی خوشی اور اپنی خواہش کو سامنے رکھے اور جو ویژن اس نے طے کیا ہے، تمام تر مخالفتوں اور تمام تر تنقیدوں کے باجود وہ آگے بڑھتا چلا جائے۔ کنواں کھودے، لیکن پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھیے کہ کون پانی پی رہا ہے۔ اس بات سے آزاد ہوجائے کہ آپ کی چیزوں اور آپ کے کاموں سے لوگ کس طرح فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

6 تخمینی خطرات لینا

ذہنی طور پر مضبوط افراد تخمینی خطرات (Calculated Risks) لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ جن افراد کی زندگی میں اکثر و بیشتر چیلنج رہتے ہیں وہ ذہنی طور پر صحت مند اور نارمل رہتے ہیں۔ وہ ڈپریشن کا شکار نہیں ہوتے، کیونکہ چیلنج انھیں ذہنی اور جذباتی طور پر تازہ رکھتا ہے، زندہ رکھتا ہے، لڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ پھر اسے ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کیلئے تیار کرتا ہے۔ جس کی زندگی میں کوئی چیلنج نہیں ہوتا، وہ عمومی طور پر ڈپریشن کا شکار ہوجاتا ہے۔ اگر ساری کامیابیاں اکھٹی ہی مل جائیں تو ذہنی طور پر نارمل رہنا مشکل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ وہ خطرات سے بہت گھبراتے ہیں۔

ذہنی طور پر مضبوط افراد اپنے فیصلے خود کرتے ہیں، مشاورت ضرور کرتے ہیں، لیکن فیصلہ خود کرتے ہیں۔ خطرات لینے والوں کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔ رسک کی بات کرتے ہوئے گھبراتے نہیں ہیں۔ اپنے عصاب کو قابو میں رکھتے ہیں۔ البتہ بعض لوگ اپنی بے وقوفی کو رسک کہہ رہے ہوتے ہیں۔ وہ کشتیاں جلانے والی باتیں کرتے ہیں۔ یہ باتیں طارق بن زیاد کیلئے تو اچھی لگتی ہیں، لیکن ہر شخص طارق بن زیاد نہیں ہوتا۔

7 ماضی میں نہ رہنا

ذہنی طور پر مضبوط لوگ اپنے ماضی میں نہیں رہتے۔ جن لوگوں کے پاس صرف اچھا ماضی ہوتا ہے، اُن کا حال اکثر مشکل ہو جاتا ہے۔ انھیں بیماری لگ جاتی ہے جسے نرگسیت کہتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر وقت ماضی کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا فن پروان نہیں چڑھ پاتا۔ ایسے لوگ یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ کاش ماضی دوبارہ آجائے۔ ایسے لوگوں کے پاس ماضی کے پچھتاوے ہوتے ہیں، یادیں بھی ماضی کی ہوتی ہیں، افسانے بھی ماضی کے ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو کا زیادہ تر حصہ ماضی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ماضی سے سیکھ کر آگے نکلا جائے۔ ذہنی طور پر مضبوط لوگ یہ گر جانتے ہیں۔

ماضی میں رہنے والوں میں زیادہ تر مشہور لوگ ہوتے ہیں جنھیں ماضی میں ان کے کسی کام کی وجہ سے شہرت ملی، لیکن اب وہ گم نامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ شہرت بہت خطرناک شے ہے۔ یہ انسان کو اُڑا کر رکھ دیتی ہے۔ اگر برتن اس قابل نہیں ہے کہ وہ شہرت کو ہضم کر سکے تو پھر دعا یہ ہونی چاہیے کہ شہرت نہ ملے۔ یہ تکبر کی طرف لے کر جانے کا سب سے خطرناک راستہ ہے۔ یہ ذہنی نمو اور شخصیت میں بہتری کو روکنے والی سب سے خطرناک چیز ہے۔ ماضی سے نکلنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنا حال اچھا کیجیے۔ اپنے حال میں رنگ بھریے۔ اپنے حال کو پُر لطف بنائیے۔

8 غلطی کو بار بار نہ دہرانا

ذہنی طور پر مضبوط لوگ ایک ہی غلطی بار بار نہیں دہراتے۔ آدھ گھنٹہ نکالیے اور ماضی کی اُن غلطیوں کی فہرست بنائیے جن کی وجہ سے آپ کو بہت زیادہ تکلیف یا خفت اٹھانا پڑی۔ اپنے سامنے اپنے آپ کو رکھیں۔ جو لوگ ذہنی طور پر مضبوط نہیں ہوتے، وہ اکثر ایک جگہ پر

پھنس جاتے ہیں، کیونکہ انھوں نے یہ سیکھا ہی نہیں ہوتا کہ کیسے اپنی غلطیوں سے بہتری لانی ہے۔ ذہنی طور پر مضبوط افراد اپنی غلطیوں سے سیکھنے کی جرات رکھتے ہیں۔ جو آدمی اپنی غلطی سے سیکھتا ہے، وہ دوسروں سے آگے نکل جائے گا۔ ذہنی طور پر کمزور لوگ تجزیہ کرنے کو وقت ضائع کرنا سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی غلطی کو دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ اپنی عادت کی وجہ سے بغیر تجزیہ کیے آگے بڑھتے ہیں اور پھر وہی غلطی کرتے ہیں۔ نتیجتاً، وہی ٹھوکر کھاتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ تر ڈپریشن میں رہتے ہیں۔

9 حسد سے بچنا

ذہنی طور پر مضبوط لوگ دوسروں کی کامیابیوں پر حسد نہیں کرتے۔ جو شخص حسد کرتا رہتا ہے، وہ اپنی توانائی ضائع کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے، جیسے آگ سوکھی لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ انسان کی روحانی بیماریوں میں غالباً حسد سب سے خطرناک بیماری ہے۔ چالیس سال کی عمر میں پہنچ کر پیچھے مڑ کر دیکھیں تو آپ کو اپنی عمر کے کئی لوگ ملیں گے جو اپنے کامیاب ساتھیوں پر تنقید کر رہے ہوتے ہیں۔ جب آدمی یہ سوچتا ہے کہ ہمارا ساتھی آگے کیسے نکل گیا؟ اسے مواقع کیسے مل گئے؟ ہمارے ہی ساتھ گپ شپ کرنے والا کیوں کر ہم سے منفرد ہو گیا؟ تو اس کا مطلب ہے کہ وہ شخص ذہنی طور پر مضبوط نہیں ہے۔ ایسے لوگ بے وجہ تنقید کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ کامیاب لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ''کسی کو عزت دے کر دیکھو، اگر وہ اہل ہوگا تو وہ اور اچھا ہو جائے گا؛ اہل نہیں ہوگا تو اپنی کمینگی کا اظہار ضرور کرے گا۔'' جو شخص آپ کی عزت نہیں کرتا، اس کی عزت کرنا شروع کر دیجیے۔ اگر پھر بھی ٹھیک نہ ہو تو سمجھ جائیے کہ اس میں کمینگی کی خصلت ہے۔

10 ہار نہیں ماننا

ذہنی طور پر مضبوط لوگ پہلی ناکامی کے بعد اپنی جدوجہد نہیں چھوڑتے۔ وہ اپنی پہلی ناکامی کو آخری ناکامی نہیں سمجھتے۔ جو شخص اپنی پہلی ناکامی کو آخری ناکامی سمجھے گا، وہ کڑھے گا اور اندر ہی اندر جلے گا۔ جب بھی آدمی پہلی غلطی سے سیکھ کر آگے بڑھتا ہے، وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ ذہنی طور پر مضبوط لوگوں میں مستقل مزاجی ہوتی ہے۔ اگر انھیں کئی دفعہ بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے تو وہ ہر بار اتنے ہی جنون کے ساتھ دوبارہ جدوجہد شروع کر دیتے ہیں۔

11 اپنی تنہائی سے نہ ڈرنا

ذہنی طور پر مضبوط لوگ اپنی تنہائی سے نہیں ڈرتے۔ تنہائی میں انسان کی ملاقات اپنے آپ سے ہوتی ہے۔ اگر آدمی کا کردار اچھا نہیں ہے تو جب اس کی تنہائی میں اپنے آپ سے ملاقات ہوتی ہے تو اسے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ اچھا انسان ہے تو اس کو تنہائی میں خوشی محسوس ہوگی۔ جب بھی انسان اپنے آپ کو اندر سے مکمل محسوس کرے گا، وہ تنہائی سے محظوظ ہوگا۔

12 یقین ہونا کہ دنیا کچھ بگاڑ نہیں سکتی

ذہنی طور پر مضبوط لوگوں کو یقین ہوتا ہے کہ دنیا ان سے کچھ چھین نہیں سکتی اور نہ ان کا کچھ بگاڑ سکتی ہے۔ ذہنی طور پر کمزور لوگ سمجھتے ہیں کہ ساری دنیا ہماری مخالف ہے۔ ایسے لوگ اپنی کوئی چیز شیئر نہیں کرتے۔ ایسے لوگ کچھ بتاتے نہیں ہیں۔ وہ جن منصوبوں پر کام کر رہے ہوتے ہیں، وہ بالکل شیئر نہیں کرتے۔ اگر آپ کا ارادہ سچا ہے، خواہش سچی ہے تو

ساری دنیا کی طاقتیں آپ کی معاون ومددگار ہو جاتی ہیں۔

13 جلد نتیجہ نہ چاہنا

ذہنی طور پر مضبوط لوگ جلد نتیجہ نہیں لینا چاہتے۔ وہ اپنی کوشش کا نتیجہ اپنی خواہش کی بجائے قوانین فطرت کے حوالے کرتے ہیں۔ نظامِ قدرت میں کوئی کام جلدی نہیں ہوتا، ہر شے کا ایک وقت ہوتا ہے اور نتیجہ اپنا وقت پورا کرنے پر آتا ہے۔ زندگی میں عادت بنائیے کہ جلد نتائج نہیں لینے۔ جلدی نتیجے میں گوبھی آلو ہی بنتے ہیں، لیکن اگر نتیجہ صبر اور اطمینان سے ہو تو درخت بنتا ہے۔ اگر زندگی میں بڑا کر کے دکھانا ہے تو پھر بڑی چیزوں کو جاننے کیلئے بڑا وقت چاہیے۔ جس کا کام بڑا ہوتا ہے، اس کے کام کو زمانہ سراہتا ہے۔ جلد باز آدمی اپنے ذہن کی توانائی صرف اس بات پر لگا تا رہتا ہے کہ کب نتیجہ آئے گا جبکہ مضبوط ذہن رکھنے والا انسان اپنی ذہنی توانائی کو بچائے گا۔ پودا لگائے گا۔ مڑ کر نہیں دیکھے۔ آگے چلا جائے گا۔ جو آدمی پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہتا ہے، وہ نیا کام نہیں کر سکتا۔ ایڈیسن کہتا ہے کہ ''میں نے اپنی کوئی بھی ایجاد کی، اس ایجاد کی وجہ یہ تھی کہ میں پچھلی ایجاد بھول چکا تھا۔ اگر وہ مجھے یاد رہتی تو میں اس کے عظمت کے مینار پر ہی کھڑا رہتا اور نئی ایجاد نہ کر سکتا۔''

آپ اپنے آپ کو ذہنی طور پر مضبوط کرنا چاہتے ہیں تو ایمی مورِن کے مشورے کے مطابق، درج بالا تیرہ کام نہ کیجیے۔

فکری ارتقا

''نہ وہ انواع بچتی ہیں جو مضبوط ہیں اور نہ وہ انواع بچتی ہیں جو ذہین ہیں؛ صرف وہ انواع بچ پاتی ہیں جو اپنے اندر تبدیلی لاتی ہیں!''

چارلس ڈارون

1979ء میں ایک کتاب ''دی ہنڈرڈ'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔ اس کتاب نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ اس کتاب کے مولف مائیکل ایچ ہارٹ نے اپنی اس کتاب میں پہلی بار دنیا کو یہ بتایا کہ انسانی تاریخ میں دنیا کو سب سے زیادہ کن لوگوں نے متاثر کیا اور اُن کی ترتیب کیا ہے۔ اس کتاب کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں سب سے زیادہ اثر کس نے ڈالا، کس کے افکار نے دنیا کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اس ترتیب میں پہلا نام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اس ترتیب کے مطابق دوسرا نمبر نیوٹن کا ہے۔

مصنف کتاب شروع کرنے سے پہلے بتاتا ہے کہ میں نے شخصیات کو ترتیب دینے میں کون سے معیارات اپنائے۔ کتاب کی ابتدائی فہرست میں چارلس ڈارون کا نام بھی شامل ہے۔ اس کے نظریہ نے بھی دنیا کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس نے ارتقائی نظریہ پیش کیا۔ مسلمانوں نے نظریہ پر بہت زیادہ تنقید کی۔ اس میں بھی زیادہ تر وہ مسلمان شامل ہیں جنھوں نے بیالوجی نہیں پڑھی۔ زیادہ تر لوگ اس نظریے کے کچھ نکات پڑھتے ہیں، باقی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ڈارونزم کا اہم ترین نقطہ یہ ہے کہ آج تک وہی چیزیں بچی ہیں جو بہترین ہیں، کوشش کرنے والی ہیں اور ارتقا پذیر ہیں۔ اس میں ڈارون نے طاقتور چیزوں کو شامل

نہیں کیا۔ اس نے ان کے بارے میں یہ ثبوت دیا ہے کہ ڈائنا سورز بہت طاقتور تھے، لیکن ان کا وجود نہیں رہا، لیکن ایسے بہت سے جان دار ہیں جو بہ ظاہر کمزور تھے مگر انھوں نے زمانے کے پیچ وخم میں خود کو بچالیا۔ اس کی بہترین مثال لال بیگ یعنی کاکروچ ہے۔ اگر کاکروچ کو اس کے سائز اور بناوٹ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی کوئی ویلیو نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کو بچاؤ کرنے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ہزاروں سال سے موجود ہے۔

ڈارون کے نظریہ کا خاص نکتہ

چارلس ڈارون کے نظریے کی سب سے اہم بات ''ارتقا'' ہے۔ وہ اپنے نظریے میں جسمانی ارتقا کے ساتھ ساتھ فکری ارتقا کی بات بھی کرتا ہے۔ فکری ارتقا کا مطلب ہے کہ لوگوں کی اپنی سوچ وقت کے ساتھ ساتھ بہتر ہوتی ہے۔ انسان کو وقت کے ساتھ ساتھ اپنی فکر میں بہتری لانی چاہیے۔

لیکن المیہ یہ ہے کہ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارے برصغیر کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں پر سماجی معیارات بہت زیادہ ہیں جو اتنے سخت ہیں کہ ان سے باہر نکل کر سوچنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مثال کے طور پر، جہیز دیا یا نہیں دیا، لاج رکھی یا نہیں رکھی، بھرم رکھا یا نہیں رکھا۔ برصغیر کے ان معیارات پر ایک قلم کار نے مغرب میں جا کر ایک ناول لکھا جس پر اسے بہت بڑا انعام دیا گیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اگر تم برصغیر میں ہوتے تو کیا کر رہے ہوتے۔ اس نے کہا، میں اپنی بہن کا جہیز تیار کر رہا ہوتا۔ ہماری زندگی کا بہت بڑا حصہ فکری ارتقا کی بجائے ان مسائل میں گزر جاتا ہے۔ یہ مسائل فکری ارتقا کو روک دیتے ہیں۔

نااہل نوجوانوں کی فوج در فوج

ہمارے نوجوانوں کی ساری زندگی کیریئر بنانے میں لگ جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں

پڑھے لکھے افراد کی فوج در فوج موجود ہے، لیکن وہ کماتے نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوکری نہیں ہے اور نوکری اس لیے نہیں کہ ڈگری تو ہے، ٹیلنٹ نہیں ہے۔ خود سے کام کرنے کا سلیقہ ہنر نہیں ہے۔ انھوں نے خود ساختہ معیار بنایا ہوا ہے کہ اس تعلیم کے بعد کم از کم اتنا بڑا افسر تو بننا چاہیے، لیکن وہ اکثر اس افسر بننے کے اہل نہیں ہوتے۔ ہماری زندگی کا ایک بڑا حصہ تعلیم حاصل کرنے، رٹے لگانے، ڈگری لینے، جی پی اے کی دوڑ، اسائنمنٹ، یادداشت کی بنیاد پر آگے بڑھنے پر لگ جاتا ہے۔

روٹین کی عادی قوم

ہم جس دوڑ میں پڑے ہوئے ہیں، اگر اس میں جیت بھی جائیں تو گھر مل جائے گا، نوکری مل جائے گی، گاڑی آجائیگی، لوازمات پورے ہو جائیں گے، لیکن اگر فکری ارتقا کی بات کی جائے تو ہم روزمرہ روٹین کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ فکری ارتقا کا خیال ہی نہیں آتا۔ فکری ارتقا کا مطلب ہے کہ یونیورسٹی چھوڑ کر کسی دانشور کو تلاش کیا جائے، نصاب کی کتابوں کے علاوہ بھی کتابیں خرید کر ان کا مطالعہ کیا جائے یا لائبریری جا کر وہ کتابیں پڑھی جائیں جو فکری ارتقا کی بات کرتی ہیں۔

یہ گمان کیا جاتا ہے کہ ایک شہر جس کی آبادی ایک کروڑ ہے، اگلے بیس سال بعد بھی ننانوے لاکھ کی تقدیر نہیں بدلنی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فکری ارتقا نہیں ہو رہا۔ لوگوں کی وہی سوچ ہے جو برسوں پہلے تھی اور برسوں بعد بھی وہی رہے گی۔

اگر فکری ارتقا کے نتیجے میں آپ ایک جملہ بھی کہنے کے قابل ہو جائیں تو تاریخ میں نام زندہ رہ جاتا ہے۔ ہم کتنے ہی عمر دراز لوگوں کو دفنا کر آتے ہیں لیکن اگر ان کے افکار کی بات کی جائے تو کچھ نہیں ملے گا۔ دنیا میں جس طرح انسانوں کی زندگی ہے، ایسے نظریات کی زندگی ہے۔ ایسے آئیڈیاز کی بھی زندگی ہے۔ افکار کی بھی زندگی ہے۔ فکروں نے راج کیا

ہے۔زہر کا پیالہ پیتے وقت سقراط کے مسکرانے کی وجہ یہ تھی کہ اسے پتا تھا کہ یہ مجھے مار رہے ہیں، میری فکر کو نہیں مار سکتے کیونکہ میری فکر سچ پر مشتمل ہے۔آج ہزاروں سال بعد بھی سقراط کی سوچ اور جملوں کے بغیر ایم اے فلسفہ مکمل نہیں ہوسکتا۔اس معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ یہاں پر فکری ارتقا میں تاخیر ہو جاتی ہے۔یہاں روٹی، پانی، بجلی اور گیس کے مسائل میں لوگ اتنے خوار ہوتے ہیں کہ کولھو کے بیل بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے بڑے ذہین و فطین لوگ لمبی عمر گزارنے کے بعد بھی اسی حالت میں پڑے ہوتے ہیں کہ انھیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

شوق کو یاد نہیں کرنا پڑتا

اس معاشرے کا دوسرا المیہ یہ ہے کہ یہاں پر سیکھنے کا مزاج نہیں دیا جاتا۔جس چیز میں آدمی کا شوق ہوتا ہے، اسے یاد نہیں کرنا پڑتا۔جس چیز کو یاد کرنا پڑے یا تو اس کے پیپر ہوتے ہیں یعنی جبر ہوتا ہے یا پھر مجبوری ہوتی ہے، لیکن جب چیزوں کو یاد کرنے کی بجائے رکھتے جائیں اور وہ خود بہ خود اپنی جگہ بناتی جائیں تو پھر وہ چیزیں شوق والی ہوں گی اور یہ شوق کا سفر ہوگا۔یہ ایسے ہی ہے جیسے وہ فلمیں جنھیں دیکھنے کا ہمیں شوق ہوتا ہے۔انھیں یاد نہیں کرنا پڑتا، وہ خود یاد ہو جاتی ہیں۔جبکہ کئی فلموں کو دیکھ کر بیزاری ہونے لگتی ہے۔

جب یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ میں جو ہوں، جیسا ہوں، سب ٹھیک ہے تو پھر نئی چیز اندر نہیں آسکتی۔بہتری کی طرف نہ جانے کا مزاج بہت خطرناک ہے۔پروگریسو لوگ فکری ارتقا کی طرف جاتے ہیں۔انھیں کسی دانشور یا اسکول کی ضرورت نہیں پڑتی۔وہ خود اپنی تلاش کو اس طرف لے جاتے ہیں۔

ہم جھوٹ کیلئے لڑ رہے ہوتے ہیں۔ہم حق کی تحقیق نہیں کرتے، کام نہیں کرتے، کوشش کر کے کسی مقام پر نہیں پہنچے ہوتے اور لڑتے ایسے ہیں جیسے سب سے بڑے مجاہد

ہیں۔ یہ مزاج اچھی اور نئی چیز اندر آنے نہیں دیتا۔ جو طبقہ پروگریس اور بہتری کے خلاف ہے، اگر یہ دنیا ان پر رہتی تو آج بھی انسان کسی غار کنارے بیٹھا ہوتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ انسان کے مزاج میں پروگریس ہے۔ انسان نے صرف ایک جڑی بوٹی پر اکتفا نہیں کیا۔ آج میڈیکل سائنس ہر دن نئی دریافت کر رہی ہے، ہر دن نیا علاج آ رہا ہے۔

کتابِ حیات

روزانہ ڈائری لکھنے کی کوشش کیجیے۔ آٹھ دس صفحے لکھ لیں تو کچھ عرصہ بعد یہ ڈائری پڑھیے۔ یقیناً، آپ اپنے افکار پر اعتراض اٹھائیں گے۔ جو لوگ ڈائری لکھتے ہیں، جلدی ارتقا کی طرف جاتے ہیں۔ اسی لیے ماہرین کامیابی کے لیے Life Book بنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔

جب آپ اپنے افکار لکھ کر ان پر اعتراض اٹھاتے ہیں تو انھیں بہتر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ افکار کی بہتری کا عمل تیز تر ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگ پڑھ جاتے ہیں، لیکن ان سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ انھیں کسی فیلڈ کے انتخاب میں مشکل ہوتی ہے۔ رٹے لگانے سے، پوزیشن لینے سے زندگی گزارنے کا فن نہیں آتا۔ پھر اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ پڑھے لکھے جاہلوں کی فوج پیدا ہو جاتی ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اگر زندگی کا اچھے طریقے سے سامنا نہیں ہے تو پھر فکری ارتقا نہیں ہوگا۔

اداسی یا روشنی

زندگی کے بعض مسائل کا حل باہر نہیں ملتا، اس کیلئے عقل درکار ہوتی ہے۔ اگر فکری ارتقا ہوگا تو مسائل کو حل خود بہ خود ودیعت ہوتا ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جنھیں بدلا نہیں جا سکتا۔ جب آدمی ان چیزوں کو بدلنے کی فکر کرتا ہے تو اپنی توانائی ضائع کرتا ہے جس کی وجہ سے

فکری ارتقا نہیں ہو پاتا۔ رجنیش کہتا ہے کہ پتا نہیں، زندگی موت کے بعد ہوگی کہ نہیں لیکن اہم چیز یہ ہے کہ زندگی، زندگی میں بھی ہے کہ نہیں ہے۔ بہت سارے لوگ زندگی مُردوں کی طرح گزار رہے ہوتے ہیں۔ انیس سے ستائیس سال کی عمر کے درمیان کئی لوگوں میں اداسی زیادہ ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کا فکری ارتقا نہیں ہوا ہوتا۔ فکری ارتقا نہ ہونے کے باعث مایوسی اور اداسی پیدا ہوتی ہے، لیکن جیسے ہی فکری ارتقا ہوتا ہے، مایوسی سے لڑنا آجاتا ہے اور روشنی ملنے لگتی ہے۔

فکری ارتقا کے بعد

جب کسی شخص کے اندر فکری ارتقا ہوتا ہے تو اسے یہ تجسس ہوتا ہے کہ میں اپنی فکر کو کیوں کر بہتر کر سکتا ہوں۔ اس میں جستجو پیدا ہوتی ہے۔ یہ جستجو اسے دوسرے اہل دانش کے پاس لے جاتی ہے۔ فکری ارتقا رکھنے والے کے پاس افکار ہوتے ہیں۔ وہ افکار دینے لگتا ہے جس سے سوئے ہوئے مسلز متحرک ہو جاتے ہیں اور پھر بہتر نتیجہ آنے لگتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم دانش کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ اگر دانش کی کتابیں پڑھنا شروع کی جائیں تو بہتری آنا شروع ہو جاتی ہے۔ ایک اہم چیز غور و فکر ہے۔ جب ہم غور و فکر کرتے ہیں تو پتا لگتا ہے کہ ابھی تو بہت کچھ ہے جو ہم نے دیکھا ہی نہیں ہے۔ علم کی شان ہے کہ جوں جوں علم بڑھتا ہے، اپنی جہالت کا احساس بڑھتا ہے۔

اپنی فکری ارتقا کے بعد ہی دوسروں کے فکری ارتقا کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اگر خود ہی پیاسے بیٹھے ہیں تو دوسروں کو کیا سیراب کریں گے۔ خود بہتر ہوئے بغیر دوسروں کو بہتر نہیں کیا جا سکتا۔

علم نہ ہونے کی وجہ سے ہم کنفیوژ ہوتے ہیں۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو پاکستان کیلئے کچھ بڑا کرنا چاہتے ہیں، لیکن وہ اپنے لیے بھی کچھ نہیں کرتے۔ جو شخص اپنی غربت

دُور نہیں کر سکتا، وہ کسی دوسرے کے خواب کیوں کر پورے کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ پہلے اپنے مسائل حل کرنا ہے، پھر دوسروں کی باری آتی ہے۔ میسلو کہتا ہے کہ دنیا کی بڑی آبادی اپنے بچاؤ کیلئے جی رہی ہے۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو فکری ارتقا کی طرف جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے بنیادی مسائل حل کر لیتے ہیں یا پھر ان کی پروا چھوڑ دیتے ہیں۔

جو فرد فکری طور پر پروان چڑھتا ہے، اسے پھر گھر، گاڑی اور پیسے میں خوشی نہیں ملتی۔ اس کا وزڈم ان چیزوں سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو ذہن دیا ہے، وہ میرے لیے کافی ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کے پاس جو اللہ کی عطا ہے، وہی اس کیلئے کامیابی ہے۔ اپنے گھر سے نکل کر دیکھئے، آپ کو لاتعداد کروڑ پتی ملیں گے۔ لیکن اشفاق احمد تلاش کریں تو پورے ملک میں ایک ہی ملے گا۔ بات یہ ہے کروڑ پتی بننا بہت آسان ہے، دانشور بننا بہت مشکل ہے۔

فکری ارتقا والے چند لوگ ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو مرتے نہیں۔ جو آگے جاتے ہیں۔ جو اپنے افکار کی وجہ سے زندہ رہتے ہیں۔

سی ایس ایس امتحان

"جب تک کوئی کام کر نہیں لیا جاتا، ناممکن لگتا ہے!"

برصغیر میں جب برطانوی راج تھا تو اس وقت انگریز نے اپنے قوانین کو مضبوط رکھنے کیلئے بیوروکریسی کا نظام متعارف کرایا۔ انگریز تو چلا گیا، لیکن یہ نظام آج بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ پاکستان میں موجود ہے۔ اس نظام کے نام تو بدلے گئے، لیکن اپنے اختیارات اور مراعات کے لحاظ سے یہ آج بھی اسی طرح موجود ہے۔ گویا، روح نہیں بدلی گئی، صرف ڈھانچا تبدیل کیا گیا ہے۔

غلط فہمی

ہمارے ہاں سی ایس ایس کا امتحان ایک متھ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سی ایس ایس اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہا جاتا ہے، لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے جتنا اسے سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ ان دونوں کے درمیان ہے۔ اگر مکمل توجہ ہو تو اس امتحان کی تیاری چھے ماہ سے ایک سال میں کی جاسکتی ہے۔ لیکن تیاری سے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ طالب علم کی تعلیم کیا ہے۔ اگر امتحان دینے سے پہلے صرف گریجویشن ہے تو پھر چھے ماہ کی تیاری کے بعد اسے امتحان دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اگر ایم ایس سی یا ایم اے ہے تو پھر چھے ماہ کی تیاری کے بعد یہ امتحان دیا جاسکتا ہے۔

جو نوجوان بھی یہ امتحان دینا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ جس اکیڈمی یا ادارے میں سی

ایس ایس کی تیاری کیلئے جائے تو سب سے پہلے کسی ایک موضوع پر چار سے پانچ صفحے لکھ کر چیک کرائے۔ اس سے پتا چل جاتا ہے کہ امیدوار کہاں کھڑا ہے اور اسے کتنی تیاری کی ضرورت ہے۔ پھر تیاری کے دوران جتنا زیادہ ممکن ہو سکے، لکھنے کی پریکٹس کی جائے۔

انگلش میں مہارت

بنیادی طور پر یہ امتحان انگلش زبان کا امتحان ہوتا ہے اور زیادہ تر امیدواروں کے فیل ہونے کی وجہ بھی انگلش ہی ہوتی ہے۔ ستر سے اسی فیصد انگلش میں فیل ہوتے ہیں۔

ان کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ سب سے پہلے انگلش مضمون، پھر انگلش جنرل اور پھر اسلامیات کا مضمون آتا ہے۔ اس امتحان میں یہ چیز بھی عجیب ہے کہ اگر ایک امیدوار سارے پیپروں میں ستر فیصد نمبر بھی لے جائے، لیکن انگلش کے مضمون میں ایک نمبر سے بھی رہ جائے تو اس کو فیل سمجھا جاتا ہے۔

جس کا سی ایس ایس کرنے کا ارادہ ہے، اسے چاہیے کہ سب سے پہلے انگلش کی گرامر لے اور اس میں Pair of words سے تیاری شروع کرے۔ اس طرح تیاری کرنے سے اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ جمع ہونا شروع ہو جائے گا اور ساتھ ہی اسپیلنگ کی غلطیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد Idioms آتے ہیں۔ ان میں کچھ مشہور ایڈیمز ہیں۔ وہ ہر حال میں آنے چاہئیں۔ پھر دوسری کیٹیگری کے ایڈیمز ہیں، انھیں یاد کیا جائے۔ میرا کہنے کا مطلب ہے کہ انگلش پر گرفت زیادہ سے زیادہ مضبوط کی جائے۔

لکھنے کی صلاحیت بہت ضروری ہے

جو طالب علم اکیڈمی میں اس امتحان کی تیاری کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو سب سے بڑا دھوکا یوں دیتے ہیں کہ انھیں جو پڑھایا جاتا ہے جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اگلے دن وہ لکھ

کرلائیں تو نصف طلبہ اس دن غیر حاضر ہو جاتے ہیں۔ اگر بہت اچھا پڑھا ہو، لیکن لکھنے کی پریکٹس نہ ہو تو پہلے سوال پر ہی زیادہ وقت لگ جاتا ہے اور پھر وقت ضائع ہوتا ہے اور یوں فیل ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

درست مضامین کا انتخاب

انگلش زبان ٹھیک ہونے کے بعد اگلا مرحلہ مضامین کے انتخاب کا ہے۔ مضامین دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک نیچرل سائنسز جس میں فزکس، کیمسٹری، زولوجی، میتھ وغیرہ آتے ہیں۔ ان مضامین میں زیادہ نمبر آنے کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دیگر مضامین ہیں جن میں زیادہ نمبر آنا مشکل ہوتا ہے۔ جیسے، برصغیر کی تاریخ کا مضمون کبھی بھی اچھے نمبر دلانے والا مضمون نہیں رہا۔ اس میں یہ مسئلہ ہے کہ اس میں رائے مختلف ہے۔ مثال کے طور پر، سرسید احمد خاں ایک شخصیت ہیں۔ ایک امیدوار جب ان کے بارے میں اپنی رائے دیتا ہے تو اس رائے کے متعلق کم از کم دو سے تین مکاتب فکر موجود ہیں۔ سرسید احمد خان کے متعلق ایسی کتابیں موجود ہیں جن میں لکھا ہوا ہے کہ ان کی ساری ہمدردیاں اور ذہنی رجحان انگریزوں کی طرف تھا، جبکہ بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جن میں لکھا ہے کہ اگر سرسید احمد خاں نہ ہوتے تو بات آگے نہیں چل سکتی تھی۔ یہاں پر امیدوار کو اپنا مضمون ہر لحاظ سے پورا کرنا ہوتا ہے۔

اسی طرح ماحولیاتی سائنس نیا مضمون ہے۔ اس مضمون میں زیادہ لکھنے کے نمبر ہیں اور نہ ہیڈنگ کے۔ البتہ ان مشکلات کو نئے قوانین نے آسان کر دیا ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ یہ مضمون نہیں رکھنا، یہ رکھنا ہے۔ اب قوانین ہی ایسے بنا دیے گئے ہیں کہ بعض مضامین لازماً اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ مثلاً، انٹرنیشنل ریلیشن اور پولیٹیکل سائنس میں سے کسی ایک کو لازماً رکھنا پڑتا ہے، یعنی یہ دونوں مضامین لازمی مضمون کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

مضامین کے انتخاب میں ترتیب ہونی چاہیے کہ فرض کیجیے، اگر انٹرنیشنل ریلیشن مضمون ہے تو ساتھ انٹرنیشنل لا ہونا چاہیے۔ جب یہ دونوں مضامین رکھ لیے تو پھر ان کے ساتھ برٹش اور یورپین ہسٹری بھی ٹھیک رہے گی۔ اسی طرح، اگر جغرافیہ ہے تو اس کے ساتھ انوائرمینٹل سائنس، ٹاؤن پلاننگ ہونا چاہیے۔ دراصل اس طرح مضامین کی ترتیب دوسرے مضامین میں معاونت کرتی ہے۔

کچھ طلبہ کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ انھیں وہ مضمون رکھنا پڑ جاتا ہے جو انھوں نے کبھی پڑھا ہی نہیں ہوتا جس کی وجہ سے انھیں تیاری میں زیادہ مسائل درپیش آتے ہیں۔ ایسے میں گھبرانا نہیں چاہیے۔ انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ میں نے دوسرے مضمون میں ایک اور ایم اے کرنا ہے، کیونکہ سی ایس ایس کے امتحان کیلئے ایک ایم اے جتنی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔

انگلش کے بعد ایک اہم چیز دنیا کا نقشہ ہے۔ ایک نقشہ لیجیے اور اسے دیوار پر لگا لیجیے۔ اس کے سامنے کھڑے ہو جائیے اور دیکھئے کہ پاکستان کے اردگرد کون کون سے ممالک ہیں۔ ان کی سمت کیا ہے۔ نقشہ اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ ایوری ڈے سائنس میں ایک لازمی پورشن ہوتا ہے جس میں ورلڈ افیئر، کرنٹ افیئرز، پاکستان افیئرز، انٹرنیشنل ریلیشن، ہسٹری وغیرہ کا اس نقشے سے تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سرمایہ داری نظام، کیپٹلزم، کیمونزم، سوشلزم، نیو ورلڈ آرڈر، کلیش آف سول لائزیشنز، امریکا اور اس کا بین الاقوامی کردار وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے معلومات ہونی چاہئیں۔

اسلامیات کو ہلکا نہ لیجیے

سی ایس ایس میں طلبا کی بہت بڑی تعداد اسلامیات میں فیل ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طلبہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں تو اپنے دین کے بارے میں پتا ہے، اس لیے اس کی تیاری

کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسلامیات کے علاوہ دیگر مذاہب کا بھی پتا ہونا چاہیے۔ ہندوازم، بدھ ازم، سکھ ازم، یہودیت، عیسائیت اور اسلام... سب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات ہونی چاہئیں۔ ایک طالب علم کو اسلام اور دوسرے مذاہب کا موازنہ کرنا آتا ہو۔ پھر ہر مضمون کی کم از کم ایک ایسی کتاب کا مطالعہ جو اِن تمام باتوں کا احاطہ کرتی ہو، ضروری ہے۔

سی ایس ایس امتحان کیلئے گروپ اسٹڈی کرنی چاہیے۔ اس سے یہ آسانی ہوتی ہے کہ گروپ میں کسی کو ایک مضمون کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں ہے تو دوسرے کے بتانے سے اس کے علم میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ نفسیات یہ کہتی ہے کہ آدمی جب دوسرے کو بتاتا ہے تو وہ انسان کی یادداشت میں زیادہ بہتر محفوظ ہوتا ہے، پھر وہ بات بھولتا نہیں ہے۔

اچھی تیاری کیلئے بہتر ہے کہ جو کچھ پڑھا ہے، اس کا بار بار ٹیسٹ دیا جائے۔ اس سے تیاری میں آسانی ہوگی۔

اختیاری مضامین (Optional) بدل گئے ہیں۔ لازمی مضامین وہی ہیں۔ برصغیر کی تاریخ کے پہلے دو سو نمبر ہوتے تھے، اب سو کر دیے گئے ہیں۔ انٹرنیشنل ریلیشن کے بارے میں سب سے زیادہ معلوم ہونا چاہیے۔ پاکستان افیئر کے سو نمبر ہیں۔ اس میں بھی ستر سے اسی نمبر کا تعلق انٹرنیشنل ریلیشن سے ہے، جبکہ انٹرنیشنل ریلیشن کے خود دو سو نمبر ہیں۔ پھر انٹرنیشنل لا آجاتا ہے۔ نئے مضامین میں Gender Studies نیا مضمون آیا ہے۔ یہ خواتین کے حقوق کے بارے میں ہے۔ یہ مضمون قدرے آسان ہے۔ اسی طرح، سوشیالوجی بھی آسان مضمون ہے۔ پہلے لوگ عربی اور فارسی رکھتے تھے، ان کے دو سو نمبر ہوتے تھے۔ اب ان دونوں مضامین کے سو نمبر کر دیے گئے ہیں۔ علاقائی زبان پر بھی ضرور نظر رکھیے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحبان کی اپنی زبان سے وابستگی ہوتی ہے اور وہ اپنے مضمون کو پروموٹ کرتے ہیں۔

اگر کسی طالب علم کا سائنس کا بیک گراؤنڈ ہے تو اس کو چاہیے کہ انوائرمینٹل سائنسز نیا مضمون ہے، اسے منتخب کریں۔ اس کے ساتھ ٹاؤن پلاننگ رکھیں۔ اس سے ایک مضمون کا پڑھا ہوا دوسرے مضمون میں کام آتا ہے۔

عام طور پر جو شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے سی ایس ایس کا امتحان دینا ہے تو سب سے پہلے اس کے عزیز رشتہ دار، دوست احباب اپنا رویہ بدل لیتے ہیں۔ وہ اس کے خیر خواہ نہیں رہتے۔ اس وجہ سے اس پر غیر ضروری دباؤ آجاتا ہے۔ اس شخص کو چاہیے کہ وہ اس مخمصے سے بچ کر رہے۔ جب موٹیویشن کا لیول نیچے آئے تو پڑھنے کا طریقہ کار بدل لیں۔ عموماً رات کو جاگ کر پڑھنے سے اخلاقی سپورٹ مل جاتی ہے وہ سوچتا ہے کہ ساری دنیا سوئی ہے اور میں پڑھ رہا ہوں۔ اس سے موٹیویشن بلند ہو جاتی ہے۔ اگر گھر میں کوئی پڑھا لکھا ہے تو اس کو اپنی پڑھائی کے متعلق بتائیے۔ اس سے بھی موٹیویشن ملتی ہے۔ ارد گرد جو لوگ اس امتحان کی تیاری کر رہے ہوں، ان سے ملیں یا جن کے ساتھ آپ کا مقابلہ ہے، انھیں دیکھیں کہ وہ کس لیول تک جا رہے ہیں۔ اس سے موٹیویشن بلند رہے گی۔

اخبار کا مطالعہ کیجیے

روز ایک انگلش اخبار ضرور پڑھنا چاہیے، لیکن اس کو ذہن پر سوار نہ کیا جائے کہ مجھے روز اخبار پڑھنا ہے بلکہ اس عمل سے لطف اندوز ہوں۔ جو شخص امتحان دینا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ خود سے تیاری کرنے کی بجائے کسی اچھے استاد سے پڑھے اور تیاری کرے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ایک روٹین بن جائے گی۔ لیکن کسی ایسی جگہ نہ جائیں جو سبز باغ دکھاتے ہوں۔ اگر کسی سے تیاری نہیں کرنا چاہتے تو کم از کم انگلش کی تیاری کسی اچھے استاد سے ضرور کریں، کیونکہ نوے فیصد طلبہ کیلئے انگلش کی تیاری ضروری ہوتی ہے۔

امتحان کا دباؤ

اگر سی ایس ایس کے امتحان میں بیس ہزار امیدوار درخواست دیتے ہیں تو تین چار ہزار لوگ امتحان میں بیٹھتے ہی نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس امتحان کے دباؤ کو برداشت نہیں کر پاتے۔ جو امتحان دینا چاہتا ہے، اسے سمجھنا چاہیے کہ اس امتحان کے تین چانس ہیں۔ اگر نہ دیا، یہ تب بھی ضائع ہو جائے گا، اور دینے کے بعد پاس نہ ہو سکا، تب بھی ضائع ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ امتحان دیا جائے۔ جس شخص کے ذہن میں یہ بیٹھ جائے کہ اگر پاس نہ ہو سکا تو کیا ہوگا، اس سے دماغ پر دباؤ آ جاتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی آدھی توانائی ضائع ہو جاتی ہے، کیونکہ جلدی، گھبراہٹ اور غصہ ان تین حالتوں میں انسان غلطی کرتا ہے۔ اگر ان تینوں کو کنٹرول کر لیا جائے تو تیاری آسان ہو جاتی ہے۔

ذہن میں یہ بات رہنی چاہیے کہ ابھی تو پہلا چانس ہے، اس کے بعد دو چانس اور ہیں۔ اگر پاس نہ ہو سکا تو کوئی بات نہیں، مجھے اس سے کم از کم یہ فائدہ تو ہوگا کہ امتحان دینے کا تجربہ ہوگا۔ اگر کامیاب نہ ہوا تب بھی میں لیکچر شپ میں جا سکتا ہوں یا کوئی دوسرا امتحان دے سکتا ہوں۔ یوں مایوسی نہیں ہوگی اور موٹیویشن بلند رہے گی۔ یہ ذہن میں ہونا چاہیے کہ میں دنیا کے بہترین امتحان کی تیاری کر رہا ہوں۔ اس سے بھی تحریک ملے گی۔ اس کے علاوہ اپنے اساتذہ کے پاس جائیں تو وہ بھی حوصلہ افزائی کریں گے۔

اچھا طالب علم اختیاری مضامین میں فیل نہیں ہوتا۔ فیل ہونے کا زیادہ خطرہ انھیں دو مضامین میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، ایک مضمون سوشیالوجی ہے۔ وہ ستر نمبر نہیں دیتا، لیکن یہ ساٹھ سے نیچے بھی نہیں دے گا کیونکہ روزمرہ کی باتیں اس کورس کا حصہ ہوتی ہیں۔ اس لیے اس مضمون کی تیاری دوسرے مضامین کی نسبت جلد ہو جاتی ہے۔ اس مضمون میں وقت کی جو بچت ہوتی ہے، وہ وقت کسی اور مضمون کو دیا جا سکتا ہے۔

زندگی بدلنے والا امتحان

جن طلبہ کو امتحان پاس کرنا ہوتا ہے ان کے اندر جستجو اور عزم بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، ایک طالب علم کو استاد ایک کتاب پڑھنے کو دیتا ہے۔ طالب علم وہ کتاب دو دن میں پڑھ کر واپس کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے یہ کتاب بہت اچھی لگی ہے، مجھے اس طرح کی اور کتاب دیں۔ جبکہ دوسری طرف وہ طالب علم ہوتے ہیں جو کتاب کا کچھ حصہ پڑھنے کے بعد استاد سے یہ کہتے ہیں کہ سوال کس طرح کا آئے گا۔ دونوں طرح کے طلبہ کا رویہ ظاہر کر دیتا ہے کہ کون امتحان پاس کرے گا اور کون نہیں۔ واضح رہے، جو طالب علم سی ایس ایس میں سوال کا لفظ استعمال کرتا ہے، وہ جرم کرتا ہے۔ طالب علم کو یہ کہنا چاہیے کہ ٹاپک کیا ہے۔

آج طلبہ نے کئی طرح کی آلائیشیں پالی ہوئی ہیں جیسے موبائل، سوشل میڈیا وغیرہ۔ انھیں ان سب کو چھوڑ دینا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اخبار کا مطالعہ کریں اور اپنی تیاری پر فوکس کریں۔ سب سے اہم بات یہ کہ سی ایس ایس امتحان کی تیاری سے لطف اٹھائیں۔ اگر طالب علم نے یہ سمجھ لیا کہ مجھے تو اتنا پڑھنا پڑے گا تو وہ دباؤ میں آجائے گا۔ اس امتحان کی تیاری کے دوران آدمی اتنا کچھ سیکھ جاتا ہے کہ اس کے بعد اگر وہ سی ایس ایس نہ بھی کر سکے، لیکن ایک اچھا لیکچرر ضرور بن سکتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ سی ایس ایس میں ننانوے فیصد انتخاب میرٹ پر ہوتا ہے۔ ایسے طلبہ بھی تھے جن کے پاس پہننے کو جوتے نہیں تھے، انھوں نے بھی سی ایس ایس پاس کیا۔ ایسے طالب علم بھی تھے جو ٹیوشن پڑھاتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سی ایس ایس کی تیاری بھی کرتے تھے۔ ایسے بھی تھے جنھوں نے مشکلات کے باوجود سی ایس ایس کیا۔ ایسے لوگوں کی مشکلات ہی ان کی طاقت بنتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کسی کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے

ہے ہو،اس کے پاس ہر طرح کی آسائشیں ہوں لیکن وہ امتحان میں رہ جائے۔

سی ایس ایس ایک مزاج ہے جس میں آدمی پڑھتا ہے، لکھتا ہے اور سیکھتا ہے۔ اس امتحان میں کامیابی اسی کو ملتی ہے جو آخر تک تیاری کرتا رہتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے چار ماہ دل لگا کر تیاری کی ہے، اب ذرا کمر سیدھی کر لی جائے، پھر نئے جذبے سے تیاری کروں گا تو ایسے شخص کیلئے امتحان پاس کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

منصوبہ بندی ضروری ہے

جس نوجوان کو یہ امتحان دینا ہے، وہ سب سے پہلے اس کی پلاننگ کرے۔ سب سے پہلے وہ مضامین کو ترتیب دے۔ یہ دیکھے کہ میرا کون سا مضمون پہلے سے بہتر ہے، کون سا مضمون میرے لیے نیا ہے۔ مثال کے طور پر، بعض لوگ لٹریچر میں بہت اچھے ہوتے ہیں۔ انھیں ایوریڈے سائنس میں مشکل پیش آتی ہے جبکہ بعض کیلئے ایوریڈے سائنس کا مضمون آسان ہوتا ہے۔ نوے کی دہائی کے شروع میں یہ امتحان صرف انجینئرز اور ڈاکٹرز کا ہوا کرتا تھا۔ اس کا راز یہ تھا کہ ان کا ایک اپنا مضمون ایوریڈے سائنس سو نمبر کا ہوتا تھا، باقی جتنے مضمون ہوتے تھے، وہ سارے نئے ہوتے تھے۔ ان کا بیٹھ کر پڑھنے کا ردھم اتنا زیادہ بنا ہوتا تھا کہ وہ اس کی وجہ سے یہ امتحان پاس کر جاتے تھے۔ انجینئرز نے میتھ اور فزکس تو پڑھا ہوتا تھا، وہ اس کے ساتھ جغرافیہ پڑھتے تھے جس کی وجہ سے انھیں آسانی ہو جاتی تھی۔ اب مضامین اور گروپس کو بدل دیا گیا ہے۔ اب یہ امتحان سب کیلئے ایک جیسا ہو گیا ہے۔ اب اس میں ڈاکٹرز یا انجینئرز کو اس طرح فائدہ نہیں رہا۔ اب جنھوں نے سوشل سائنس پڑھی ہے، انھیں زیادہ فائدہ ہے۔

امیدوار کو سلیبس اور وقت کا پتا ہونا چاہیے کہ مجھے کتنے وقت میں کون سا مضمون کرنا ہے۔ کبھی یہ کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ سو فیصد سلیبس کی تیاری کر لی جائے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔

جو یہ کرتا ہے وہ اپنے آپ کو صحیح طریقے سے منظم نہیں کر پاتا۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی سال ایک سوال عجیب سا آ گیا تو سارے طلبہ اس سوال کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ خاص مضامین ہیں، ان کی بہت اچھے طریقے سے تیاری کرنی چاہیے۔ ان کے بارے میں تھوڑا سا رسک لینا چاہیے۔ پلاننگ میں انگلش اور اسلامیات کو سب سے اوپر رکھیے۔ اگر ایسا کر لیا گیا تو یہ مقابلے سے باہر ہونے سے بچائے گا۔

سی ایس ایس امتحان کی تیاری کیلئے لاہور ایک بہترین جگہ ہے۔ اس شہر میں اکیڈمیاں ہیں، لائبریریاں ہیں جہاں کا ماحول بہت اچھا ہے۔ ایک صحت مند مقابلہ بازی کا ماحول ملتا ہے۔ انفرادی استاد بھی مل جاتا ہے اور گروپ اسٹڈی کرانے والا بھی مل جاتا ہے۔ تھوڑی سی دنیاداری کم کیجیے۔ اپنے تعلقات میں کمی لائیے اور اپنی تمام تر توجہ صرف امتحان کی طرف رکھیے۔ سی ایس ایس امتحان ایک فل ٹائم جاب ہے۔ کچھ طلبہ یہ کہتے ہیں کہ ہم دیکھیں گے، لیکن جب وہ تیاری کرتے ہیں اور امتحان دیتے ہیں تو فیل ہو جاتے ہیں۔ بعد میں پچھتاتے ہیں۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ سوچتے ہوئے تیاری کرنی چاہیے کہ میں سیکھ رہا ہوں۔ اس مزاج کے ساتھ ہی کامیابی ممکن ہوتی ہے۔

اگر کسی نے ایم اے کیا ہے تو میرا مشورہ ہے کہ اسے ایک دفعہ سی ایس ایس امتحان دینے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا ردھم بنے اور کامیاب ہو جائیں۔

کامیابی کی قیمت

''مجھے کامیابی کی قیمت معلوم ہے: عزم، سخت محنت، اور جو چاہتے ہیں اسے ہوتے ہوئے دیکھنے کا صبر!''

فرینک لائڈ رائٹ

انسان جتنی بڑی کامیابی کی طرف جاتا ہے، اسے اتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ قیمت ''اسٹریس'' یا ذہنی دباؤ ہے۔ یہ قیمت ادا کیے بغیر کامیابی نہیں ملتی۔ لوگ تھوڑی سی قیمت ادا کر کے بڑی کامیابی کی تمنا کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے جسے فیل ہونا ہے، وہ بھی ٹاپ کرنے کی توقع لگا کر بیٹھا ہوتا ہے۔ یہ دھوکا ہے۔ انسان سب سے بڑا دھوکا اپنے آپ کو دیتا ہے۔ اکثر ایسا مزاج کی وجہ سے ہوتا ہے۔

انسان شروع میں کمزور تھا۔ آندھی آتی اسے اڑا کر لے جاتی تھی۔ سانپ آتا، اسے مار کر چلا جاتا۔ شیر کھا لیتا۔ سیلاب بستیاں اجاڑ دیتا اور جو لباس اس نے زیب تن کیا ہوتا، وہ تازہ پتوں کا ہوتا جسے جانور کھا جاتے۔ یہ وہ سارے مسائل تھے جن کا سامنا انسان کو تھا، کیونکہ وہ کمزور تھا۔

انسانی نفسیات

صوفی انسان کی نفسیات کو بہت اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے ذریعے اسلام پھیلا۔ صوفی کو پتا ہوتا ہے کہ اگر میں انسانوں کو ترازو میں تولوں گا تو میری

جیب خالی رہے گی۔ اسے پتا ہوتا ہے کہ میں کھوٹا سکہ جیب میں ڈالوں گا تو کچھ عرصہ بعد وہ کھرا ہو جائے گا۔ یہ ایک آرٹ ہے۔ حضرت میاں محمد بخشؒ کے ایک شعر کا مفہوم ہے کہ "جو کمزور ہوتا ہے، اس کا زور نہیں چلتا۔ اس کے پاس صرف دو آپشن ہوتے ہیں۔ پہلا بھاگ جاؤ اور دوسرا معافی مانگ لو۔" اس لیے شروع کے انسان نے یہ دونوں کام بہت کیے ہیں۔ سیلاب آتا تو علاقہ چھوڑ دیتے اور پہاڑوں پر چڑھ جاتے۔

انسان کی بنیادی نفسیات میں ہے کہ جب بھی اس کی اوقات سے باہر کا مسئلہ ہوتا ہے، یا تو وہ بھاگ جاتا ہے یا پھر مان جاتا ہے۔ انسان کے جین میں ایک بات چھپی تھی کہ بھاگ جانا، تھک جانا، معافی مانگ لینا، ہار مان لینا لیکن آج کا انسان ترقی کرتے کرتے آخر کار جس مقام پر پہنچا ہے، اسے سمجھ آ گیا ہے کہ ہمت بھی کوئی چیز ہے۔ کھڑے ہو جانا قیمت ہے۔ لڑنا ایک قیمت ہے۔ اس کے بغیر عظمت نہیں ہے۔ عظمت کے مناروں کی کتابیں پڑھیے، دنیا کے جتنے بڑے نام ہیں، ان کی زندگیوں کو پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ ان کی عظمت کے پیچھے ایک قیمت ہے۔ حضرت امیر خسروؒ تاریخ کی ایسی کمال شخصیت ہیں جن کے اشعار کی تعداد ساڑھے تین لاکھ ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جہاں سے شعر آتے ہیں، وہ درد کہاں سے آتا ہے، کیونکہ بنانا مشکل نہیں ہوتا۔ وہ جو بنانے والا ہوتا ہے، وہ بڑی مشکل میں ہوتا ہے۔

دوسری انسانی نفسیات یہ ہے کہ الزام لگانا، بچ جانا، برا بھلا کہنا، انگور کھٹے ہیں۔ یہ نفسیات بھی شروع سے ہے۔ انسان کوشش کرتا تھا، لیکن ہوتا نہیں تھا اور کہتا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ اس کی جبلت میں ہے۔ جس طرح پیدا ہونا اور ایک خاص وقت آنے پر چلنے لگنا، ایک عمر کے بعد بلوغت کا آ جانا، بالوں کا سفید ہو جانا، بوڑھا ہو جانا، دانتوں کا گر جانا، سب اس کے جینز میں تحریر ہے۔ اسی طرح انسان کے مزاج کا ایک حصہ اس کی فطرت ہے اور وہ بھی اس کے جینز میں تحریر ہے۔

بغیر مشقت کے کچھ نہیں ہوتا

دنیا کے ہر مزاج کا انسان ہر کام میں تھوڑا بہت ضرور بھاگے گا۔ وہ پہلے بچنے کی کوشش کرے گا۔ منور صابر صاحب کہتے ہیں کہ عام آدمی انسانوں کو نہیں کھول سکتا، لیکن جس کا کام ہوتا ہے، لوگ اس کے سامنے خود کھل جاتے ہیں۔ کتابوں میں انسانی نفسیات پڑھنے کے بعد جب آپ انسانوں کو پڑھتے ہیں تو آپ کو سمجھ آتا ہے کہ دنیا کے بڑے لوگ بہت ہشیار تھے۔ وہ صحیح دانشور تھے۔ انھوں نے دلوں کو فتح کرنے کا راز پالیا تھا۔ انھیں پتا لگ گیا تھا کہ انسان سوچتا کیوں ہے، اس کے سوچنے کے اسباب کیا ہیں، انسان کس صورتحال میں کس طرح کا برتاؤ اپناتا ہے۔ یہ موضوع پوری سائنس ہے جسے عرفِ عام میں باڈی لینگویج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر لاتعداد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اگرچہ، یہ کتابیں پڑھنے سے اس کی معلومات تو ملتی ہیں، لیکن یہ ہنر نہیں آتا۔ اس پر یہ زعم، دو چار کتابیں پڑھ کر لوگ اس خودفریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم انسانوں کو پڑھنا جانتے ہیں۔ الامان والحفیظ۔

کامیابی کا کلیہ

عظمت کے سفر میں انسانی مزاج کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ انسان جب بھی عظمت کی طرف جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ کام پر فوکس کرتا ہے۔ جب آدمی پوری یکسوئی کے ساتھ ایک کام شروع کرتا ہے تو پھر قدرت بھی انعام کے طور پر اسے منزل عطا کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر، قائداعظم محمد علی جناحؒ نے پاکستان بنایا۔ اگر آپؒ پاکستان کے بنانے کے ساتھ اور کام بھی کر رہے ہوتے تو یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی ایک منزل پر پہنچ پاتے۔ ذرا غور کیجیے کہ محمد علی جناح کیسے قائداعظم بنے۔ جس طرح پاکستان بننے کا عمل تھا بالکل اسی طرح جناح سے قائداعظمؒ بننے کا عمل تھا۔ ایک شخص اگر ایک کروڑ روپیہ کمائے تو ایک کروڑ اتنا قیمتی نہیں ہوگا جتنا کمانے والا ہوگا، کیونکہ تخلیق کا یہ اصول ہے کہ مخلوق ہمیشہ خالق کے سامنے عاجز

رہتی ہے۔ اصول ہے کہ جس مشین سے جو چیز بن کر نکلے گی وہ چیز اہم نہیں ہوگی بلکہ مشین اہم ہوگی، کیونکہ چیز دوبارہ بن سکتی ہے، اس طرح جو ایک بار کامیاب ہوسکتا ہے وہ دوبارہ بھی کامیاب ہوسکتا ہے، جس کو ایک بار عظمت کا ذائقہ ملا ہے، وہ دوبارہ بھی عظمت حاصل کرسکتا ہے۔

فوکس کامیابی کا کلیہ ہے۔ فوکس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے۔ فوکس کا مطلب ہے کہ تن، من، دھن ایک شے پر لگا دیا جائے۔ فوکس کا مطلب ہے کہ اپنی بے شمار خواہشات کو ذبح کر دینا اور ذبح کرنے کے بعد فقط ایک چیز پر تمام توانائیاں لگا دینا۔ سابق وزیر اعلیٰ حنیف رامے میں کئی خصوصیات تھیں۔ وہ سیاستدان تھے، شاعر تھے، مصور تھے۔ ان کے علاوہ ان کے پاس اور بڑا ہنر تھا۔ ایک دفعہ وہ حضرت واصف علی واصفؒ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ کوئی نصیحت فرمائیں۔ آپؒ نے جواب دیا، آپ ایک کام کریں۔ جس طرح ہانڈی میں ایک چیز پکتی ہے، اسی طرح آپ کے پاس جتنے ہنر ہیں، ان میں سے ایک کو ہانڈی میں ڈالیں، باقیوں کو چولھے میں ڈال دیں۔ انھوں نے اس بات کو اس وقت تو نہ سمجھا، مگر جب بات سمجھ آئی تو کہا کہ مجھے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کرنا۔ پوچھا گیا، کیوں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اس قبرستان میں بہت بڑا آدمی دفن ہے۔

لگانے کا راستہ

بعض اوقات آپ نصیحت کو سننے کے بعد فوری نہیں مانتے، لیکن نصیحت کرنے والے کو مان جاتے ہیں۔ بعض اوقات نصیحت فوری اثر نہیں کرتی۔ اس کا اثر کچھ عرصہ بعد ہوتا ہے۔ لیکن جس نے نصیحت کی ہوتی ہے، اس کا پتا لگ جاتا ہے۔ عظمت کیلئے سب سے اہم چیز فوکس ہے۔ فوکس آنے کے بعد دن اور رات کا پتا نہیں چلتا۔ سچی کامیابی کا راستہ کمانے کا راستہ نہیں ہے، بلکہ لگانے کا راستہ ہے۔

محنت اور محبت

اللہ تعالیٰ نے آج تک کسی کی محنت اور کسی کی محبت ضائع نہیں کی ہے۔ محبت کا دوسرا نام شوق ہے، کیونکہ محبت حاصل نہیں ہوتی بلکہ محبت سے فوکس ملتا ہے۔ بھارت میں لوگ فوکس حاصل کرنے کیلئے چالیس دن کے اوشو کو جوائن کرتے ہیں جس میں دس دن بے لباس رہنا پڑتا ہے، دس دن مانگ کر کھانا پڑتا ہے، دس دن خاموشی ہوتی ہے، جبکہ آخری دس دن نصیحت ہوتی ہے۔ کسی نے گرو سے کہا کہ چالیس دن کا کوئی شارٹ کٹ ہے۔ گرو نے جواب دیا، بڑا آسان شارٹ کٹ ہے۔ اگر تجھے سچی محبت ہوئی ہے اور محبت ملی نہیں ہے تو وہ چالیس دن کے اوشو کا جو انجام ہے، وہ تمہیں مل جائے گا۔ اس نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو درد چالیس دن بعد پیدا ہوتا ہے، وہ آدمی کو مل جاتا ہے۔ کتنا عجیب ہے کہ دس دن خاموش رہنا جیسے ہی بولنے کا خیال آئے تو فوراً ذہن میں آئے کہ نصیحت ہے، بولنا نہیں ہے۔

اگلا قدم

فوکس کے بعد اگلا کام قربانی ہے، کیونکہ فوکس قربانی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منزل نظر آ رہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے آدمی موجود چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ فوکس آدمی کو ایک غیر معمولی رویے کی طرف لے جاتا ہے۔ ایسے میں اسے تکلیف میں راحت کا احساس ہوتا ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں، ''خدا کرے زخم دور ہی نہ ہو کبھی... بڑا مزہ ہے کلیجے پہ تیر کھانے میں''۔ آدمی کو جو آنسو اور اضطراب چاہیے، وہ ٹوٹے ہوئے برتن سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

فوکس کی وجہ سے جو رویہ پیدا ہوتا ہے، اس کے تحت آدمی سب کچھ لگا دیتا ہے۔ دنیا کے جتنے بڑے لوگ ملیں گے، وہ تھوڑے سے ابنارمل نظر آئیں گے۔ بڑے لوگوں سے

مراد وہ لوگ ہیں جو ایک پردیس سے گزر کر بڑے بنے ہیں۔ اس میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے منتخب کیا ہوتا ہے۔

حقیقی فوکس نفع اور نقصان کے تصور کو بدلتا ہے۔ اگر نفع اور نقصان کا تصور بدلا نہیں ہے تو پھر فوکس نہیں ہے۔ فوکس کا مطلب ہے کہ پہلے آپ کھا کر خوش ہوتے تھے، اب کھلا کر خوش ہوتے ہیں۔ پہلے حاصل کا نام کمائی تھی، اب دینے کا نام کمائی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لاتے ہیں اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھتے ہیں کہ آج گھر میں کیا بچا ہے۔ اس دن بکری ذبح ہوئی تھی جس کے چند ٹکڑے بچ گئے تھے، باقی بانٹ دیے گئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، آج یہی بچا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو بانٹ دیا وہی بچا ہے۔ حضرت صوفی برکت علیؒ فرماتے ہیں، ''مال رکھنے کیلئے دنیا کی سب سے محفوظ جگہ غریب کی جیب ہے۔'' آپ رکھ کر دیکھیں، دس گنا واپس آئے گا۔ ہم مال کو ان تجوریوں میں رکھتے ہیں جہاں اس کی چوری کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

نفع اور نقصان کا تصور بدلنے کے بعد بسا اوقات ایک چیز کی نمو بہت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے باقی تمام چیزیں دب جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر، پروفیشنل باڈی بلڈر چونکہ اپنے مسلز بنانے پر بہت زیادہ فوکس کرتا ہے تو اس کا جسم تو بہت اچھا بن جاتا ہے، مگر اس کا آئی کیو اچھا نہیں ہوتا۔ اس کا سارا فوکس اپنے جسم بنانے کی طرف تھا۔ جس طرح جسم کو ورزش کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح ذہن کو بھی ورزش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہن کی ورزش نیا سوچنا اور غور وفکر کرنا ہے۔ مائیکل انجیلو جب مجسمہ بناتا تو اس کو وقت کا احساس ہی نہیں رہتا تھا۔ جب مجسمہ بن جاتا تو پتا چلتا کہ پندرہ دن گزر چکے ہیں۔ کئی دفعہ وہ جب اپنے بوٹ اتارتا تو اس کے ساتھ کھال بھی اتر جاتی تھی۔ یہ فوکس کی انتہا تھی۔

بعض اوقات انسان کسی چیز کے بنانے میں اتنا گم ہوتا ہے اور جب وہ چیز بنا لیتا ہے تو حیران ہوتا ہے کہ یہ تو میرے گمان میں نہیں تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی خوبصورت

چیز بن جائے گی۔

دو تخلیقیں

کہا جاتا ہے کہ دنیا کی ہر شے دو بار بنی ہے۔ایک بار انسانی دماغ میں اور دوسری بار دنیا میں۔موسیقی دنیا کی مشکل تخلیقات میں سے ہے، کیونکہ موسیقی کیلئے صرف سات راگ ہیں اور انھی راگوں سے اربوں دھنیں تخلیق ہوئی ہیں اور روزانہ ہو رہی ہیں۔

یہ بھی انسانی تاریخ ہے کہ عموماً دنیا کے بڑے دماغ دنیا کو کئی عشروں تک اپنی بات سمجھا نہیں سکے۔ مثلاً، حضرت علامہ اقبالؒ کا خودی کا تصور کئی سال تک سمجھ نہیں آ سکا جس کی وجہ سے ان پر فتویٰ لگا۔ جب آپ عظمت کے سفر میں آگے جاتے ہیں تو پھر زمانہ آپ سے متفق نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آدمی تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب یہی عظمت حضرت خواجہ غلام فریدؒ کو ملتی ہے تو وہ فرماتے ہیں:

کیا سناواں حال دل دا
کوئی محرم راز نہ ملدا

حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں:

سن واصف شیشہ کی کیندا
توں وی کلا میں وی کلا

یہ وہ احساس ہے جب آپ عظمت میں بہت آگے چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں اب کس سے بات کروں۔ پھر لوگوں کو سمجھانے کیلئے اس سطح سے نیچے آنا پڑتا ہے۔

کامیابی کی قیمت

تنہائی کے بعد الزامات اور تہمتیں لگنا شروع ہوتی ہیں۔ عظمت کے نتیجے میں وہ انگلی

اٹھتی ہے جو سمجھ ہی نہیں پایا ہوتا۔ یہ کامیابی کی سب سے بڑی قیمت ہے۔

زمانہ ہمیشہ وقت کے دانشور سے پیچھے ہوتا ہے، اس لیے عظمت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ عظمت بغیر قیمت کے نہیں ملتی اور جو بغیر قیمت کے ہوتی ہے، وہ عظمت نہیں ہوتی۔ البتہ وہ دکھاوا ہو سکتا ہے۔ سقراط کے سامنے جب زہر کا پیالہ رکھا گیا تو وہ مسکرانے لگا اور کہا کہ یہ مجھے مار دیں گے، لیکن میرے افکار کو نہیں مار سکتے۔ عظمت کیلئے انسان موت کو بھی گلے لگا لیتا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''عظمت کے سفر کا کمال یہ ہے کہ موت انسان کو مار دیتی ہے اور بڑے انسان کی موت اس کو اور بڑا بنا دیتی ہے۔'' حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ جب دنیا سے چلے گئے تو اُن کی کمر کو دیکھا گیا جس پر نشانات تھے۔ یہ نشانات اناج کی بوریوں کے اٹھانے سے پڑ گئے تھے جو وہ غریبوں کے گھر تک خود اٹھا کر پہنچاتے تھے۔ ان کی وفات کی رات محتاجوں کو آٹا نہیں ملا تھا۔ عظمت یہ ہے کہ آدمی کی موت اسے اور عظیم بنا دے۔

رویوں میں تبدیلی

''اپنے ہر دن کا آغاز پُرسکون، پُرشکر اور خوش گوار رویے سے کرو،
آنے والے ایام خوشحال اور کامیاب ہوں گے!''

نارمن ونسنٹ پیل

انسان کے دنیا میں آنے کے بعد جس شخصیت کے ساتھ پہلا تعلق بنتا ہے وہ اس کی ماں ہوتی ہے۔ ماں ایک رویے کا نام ہے، کیونکہ اس کی شفقت بچے کو بتاتی ہے کہ وہ اس کی ماں ہے۔ ماں سے شفیق دنیا میں اس کیلئے کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

زندگی کی ابتدا کا طویل عرصہ ایسا ہوتا ہے جس میں انسان میں پرکھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی وہ جو کچھ سنتا، دیکھتا ہے، قبول کرلیتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی شخصیت میں خاص رویے پیدا ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ پھر وہی رویے اس کی ذات کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ وہ رویے غلط بھی ہوسکتے ہیں اور صحیح بھی۔ مثال کے طور پر آدمی جب غلطی کرتا ہے تو اس کے جواب میں اسے ڈانٹ پڑتی ہے۔ اب ڈانٹ ایک رویہ ہے۔ ممکن ہے، یہ رویہ ٹھیک نہ ہو یا اتنی مقدار میں ٹھیک نہ ہو، جتنی مقدار میں ملا ہو۔

زندگی کے مختلف ادوار میں رویوں کی تشکیل

زندگی کے مختلف ادوار ہیں۔ ایک دَور میں انسان اپنے والدین کے زیرِ سایہ ہوتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ اسے آزادی مل جاتی ہے۔ اس وقت جو کچھ اس نے لاشعوری طور پر

سیکھا ہوتا ہے، اس کے اظہار کا موقع مل جاتا ہے بقول شیکسپیئر، زندگی ایک اسٹیج ہے اور ہر شخص اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ زندگی کے معاملات میں جب انسان دوسروں کے ساتھ پیش آتا ہے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا رویہ اچھا ہے یا اس کا رویہ برا ہے۔ جب اس کی وجہ تلاش کی جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ اس نے شروع میں لاشعوری طور پر جو رویے سیکھے تھے، وہ اس کی ذات کا حصہ بن گئے۔ بچپن میں چونکہ انسان کو سمجھ بوجھ نہیں ہوتی اور نہ اس کے پاس پرکھنے کا کوئی پیمانہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کے اندر کسی بھی قسم کا رویہ پیدا ہو سکتا ہے۔ تاہم، انسان کو چاہیے کہ جب شعور آئے تو ان رویوں پر غور و خوض کرنا شروع کر دے، کیونکہ شعور کا دَور بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اسی دَور میں وہ اپنی زندگی کے انتخاب کرنے کے قابل خود ہوتا ہے۔

چند منفی اور تخریبی رویے

جو منفی رویے کسی فرد کے مزاج کا حصہ بن جاتے ہیں، ان میں ایک رویہ دوسروں کی خامیاں تلاش کرنے کا رویہ بھی ہے۔ اس رویے کو زندگی سے نکال دینا چاہیے۔ یہ رویہ انسان کو تنہا کر دیتا ہے۔ بابا جی اشفاق احمدؒ فرماتے ہیں، ''مکھی کی چھیاسی آنکھیں ہوتی ہیں، لیکن بیٹھتی پھر بھی وہ گندگی ہی پر ہے۔'' لوگوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو اپنی ساری ذہانت دوسروں کی خامیاں تلاش کرنے میں لگا رہے ہوتے ہیں۔ کسی نے بڑی خوبصورت بات کہی کہ اپنے بارے میں کبھی برا نہ سوچو، کیونکہ یہ کام آپ کے رشتے دار بہت پہلے سے آپ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ دوسروں کی بلاوجہ بے عزتی کرنا، ایک ایسا رویہ ہے، جس میں آدمی چھلانگیں لگاتا ہے اور ایسی ایسی حرکتیں کر جاتا ہے کہ حیرانگی ہوتی ہے۔ ایسے رویے کو بھی زندگی سے نکالنے کی ضرورت ہے۔

ایک رویہ یہ ہے کہ کام کی بات نہیں سیکھنی، بلکہ بے مقصد ہی ہانکنی ہے۔ لوگوں کو دنیا جہان کے بارے میں پتا ہوتا ہے جبکہ اپنے بارے میں لاعلم ہوتے ہیں۔ اس رویے کو بھی

زندگی سے نکال دینا چاہیے۔

بعض لوگ زندگی میں ابھی کچھ بنے ہوتے نہیں، لیکن پہلے سے ہی محسوس کرانا شروع کر دیتے ہیں جیسے کئی افسروں کے بچے اپنے آپ کو افسر محسوس کراتے ہیں۔ کسی وزیر کا بچہ پطرس بخاری صاحب کے پاس رزلٹ معلوم کرنے چلا گیا۔ اس وقت رزلٹ آنے میں ایک دو دن باقی تھے۔ بچے نے ان سے کہا کہ رزلٹ تو کل آنا ہے، لیکن آپ مہربانی کریں اور مجھے آج ہی رزلٹ بتا دیں۔ پطرس صاحب نے کہا، میں تو رزلٹ آج نہیں بتا سکتا۔ بچے نے کہا، آپ کو پتا نہیں میں کس کا بیٹا ہوں۔ پطرس صاحب نے کہا، مجھے نہیں پتا۔ بچے نے پھر کہا کہ آپ کو نہیں پتا میں کس بیٹا ہوں۔ پطرس صاحب نے اس بچے کے والد کو فون کیا اور کہا کہ آپ کا بیٹا پاگل ہو گیا ہے۔ بار بار مجھے کہہ رہا ہے، آپ کو پتا نہیں کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ اگر کہیں ایسا رویہ ہے تو اسے بھی نکال دینا چاہیے۔

رویوں کی درستی کیوں کر؟

اپنے رویوں کی فہرست بنائیے۔ روزانہ دن کے پانچ واقعات لکھیے۔ مثال کے طور پر، آپ دفتر میں بیٹھے تھے، کسی نے آ کر کہا کہ آپ کی گاڑی کا شیشہ کوئی توڑ گیا۔ آپ فوری اس کا ردِ عمل ظاہر کریں گے۔ آپ کا یہ ردِ عمل ایک رویہ ہے۔ اسے لکھ لیجیے۔ اسی طرح اور معاملات پر جو رویے ہوں انھیں لکھیے۔ روز ایسا کرنے سے آپ کے تیس پینتیس رویے سامنے آ جائیں گے۔ اس میں سے کچھ رویے ایسے ہوں گے جو دوبارہ آئے ہوں گے۔ جو رویے دوبارہ آئے ہوں، انھیں اس فہرست میں کاٹ دیجیے۔ جب یہ کانٹ چھانٹ ہو جائے گی تو یہ بیس سے زیادہ نہیں بنیں گے۔ اب ان رویوں پر غور کیجیے کہ ہمارے پاس ایک ہفتہ ہے۔ ہفتے میں سات دن ہیں اور ان سات دنوں بیس رویوں کا استعمال ہوتا ہے۔ پھر ان کا جائزہ لیجیے اور دیکھئے کہ ان میں سے کون سے ایسے ہیں جنھیں سیکھنا ہے اور کون سے

ہیں جنھیں چھوڑنا ہے، کون سے رویے ہیں جنھیں قائم رکھنا ہے۔

تاریخ کے روشن رویے

رویے سیکھنے کے حوالے سے ہمارے پاس تاریخ میں شان دار مثالیں موجود ہیں۔ ان کو دیکھ کر مثبت اور تعمیری رویے سیکھے جاسکتے ہیں، ان میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے رویے کی اعلیٰ ترین مثال یہ ہے کہ اگر جنگ میں پانی آرہا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہ زخمی ہیں۔ اس شدید حالت میں کہ جب موت سامنے ہے، ایک صحابی دوسرے کو کہہ رہا ہے کہ آپ پانی پی لیں۔ دوسرا تیسرے کو کہہ رہا ہے آپ پی لیں۔ تیسرا چوتھے کو کہہ رہا ہے کہ آپ پی لیں، یہاں تک کہ سارے صحابہ شہید ہو جاتے ہیں۔ یہ رویہ نہایت قربانی کا رویہ ہے۔ اسی طرح، ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے ہاں مہمان آتا ہے۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں، مگر مہمان کا اکرام ضروری ہے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ اسے کھانا پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی چراغ گل کر دیتے ہیں تاکہ وہ کھاتا رہے اور ہم نہ کھائیں۔ وہ یوں ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے مہمان کے ساتھ خود بھی کھانا کھا رہے ہیں۔ یوں، مہمان سیر ہو کر کھانا کھالیتا ہے۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تربیت تھی جس سے یہ رویے پیدا ہوئے۔

منافقت نہ کیجیے

ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم بہ ظاہر معاف تو کر دیتے ہیں لیکن اندر ہی اندر غصے سے بھرے ہوتے ہیں۔ یہ بہت بڑا تضاد ہے۔ اس تضاد کو ختم کیجیے۔ معافی کا جواز تلاش نہ کیجیے۔ اگر آج آپ کسی کو معاف کرتے ہیں تو ہو سکتا ہے، کل کوئی آپ کے بیٹے کو معاف کر دے۔ ورنہ، اللہ کا وعدہ تو کہیں نہیں گیا کہ آپ جب اللہ کی رضا کیلئے کسی انسان کو معاف کریں گے تو اللہ آپ کی خطاؤں اور گناہوں سے درگزر کر دے گا۔

لالچ بھی ایک عام رویہ ہے۔ اپنی زندگی سے لالچ ختم کیجیے اور ہاتھ کھلا رکھیے۔ دوسروں کو اپنے کھانے میں شامل کیجیے۔ اگر ایسی عادت بن جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ دل میں وسعت پیدا کر دے گا۔ انسان کیلئے سب سے مشکل کام اپنی کمائی سے دوسروں کو کھلانا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں امیر ہوں گا تو میں اپنا دستر خوان وسیع کروں گا۔ یہ غلط رویہ ہے۔ اگر آج غربت میں ہاتھ نہیں کھلا تو پیسہ آنے پر تو بالکل نہیں کھلے گا۔

درج ذیل باتوں کو اپنا کر اپنے رویوں میں بہتری لائی جا سکتی ہے:

دوسروں کو آسانیاں دیجیے اور اپنی آسانیوں میں شامل کیجیے۔ یہ توفیق ہے اور یہ توفیق اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو دیتا ہے۔ جس کیلئے کچھ نہیں کر سکتے، کم از کم اس کیلئے دعا ضرور کیجیے۔ کسی کی تکلیف دیکھ کر کبھی خوش نہ ہوں بلکہ اس کی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کیجیے۔ آسانیاں بانٹیں گے تو آسانیاں ملیں گی۔

دوسروں کے بارے میں غلط اندازے لگانا چھوڑ دیجیے۔ روز محشر بندہ جانے اور اس کا اللہ جانے۔ ویسے بھی زندگی مختصر ہے۔ اگر وہ بھی دوسروں کے بارے میں غلط اندازے لگانے میں صرف کر دی تو پھر خود کو جج کرنے کا وقت ہی نہیں ملے گا اور آخرت میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مددگار بنئے۔ لوگ بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ پتا نہیں کہ ہم سے منسلک فرد کل کو کہاں پہنچ جائے۔ اگر آج کسی کی زندگی ہمارے اچھے رویے سے بن رہی ہے تو اس نیکی کی ایک اینٹ ضرور لگائیے۔ پھر یہی نیکی ایک زنجیر کی صورت اختیار کر لے گی اور صدقہ جاریہ بن جائے گی۔

دنیا کو ٹھیک کرنے کی فکر کرنے کی بجائے اپنے آپ کو ٹھیک کرنے کی کوشش کیجیے۔ اگر آپ ٹھیک ہو گئے تو دنیا خود بہ خود ٹھیک ہونا شروع ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آسانیاں عطا کرے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا کرے۔ آمین

اَن جان دوست

''آپ کا مستقبل آپ کے ماضی جیسا نہیں ہونا چاہیے!''

• ٹونی روبنس

یہ ٹونی روبنس کی کتاب Notes from a Friend کا خلاصہ ہے، جس میں ٹونی روبنس نے اپنا فلسفہ بیان کیا ہے۔ ٹونی روبنس کا شمار دنیا کے ان اسپیکرز میں سے ہے، جس نے دنیا بھر میں لاکھوں لوگوں کی زندگیوں کو بدل ڈالا۔ یہ حجم کے اعتبار سے چھوٹی سی کتاب ہے، لیکن اس کا انداز عوامی ہے۔ اس کتاب کو بآسانی ایک دو نشستوں میں ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کا آغاز ایک گھر کی کہانی سے ہوتا ہے، جس میں غربت و افلاس نے ڈیرے ڈالے ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے گھر میں ہر وقت میاں بیوی کی لڑائی رہتی ہے اور اس لڑائی کی وجہ سے اُن کا بچہ ہر وقت سہا سہا رہتا ہے۔ بچہ ایک دن کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ ایک دن میرے والدین آپس میں لڑ رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک شخص ہاتھ میں گفٹ لیے کھڑا تھا۔ اس نے وہ گفٹ مجھے دے دیا۔ جب میرے والد نے دیکھا تو اس نے اسے لینے سے انکار کر دیا، لیکن جب اس شخص نے اصرار کیا تو وہ گفٹ ہم نے لے لیا۔ جب ہم نے یہ تحفہ کھولا تو اس میں ایک پرچی تھی، جس پر لکھا ہوا تھا، ''یہ آسانی آپ پر اس لیے ہو رہی ہے کہ کبھی اسی طرح کسی اَن جان نے یہ تحفہ بھیجنے والے پر آسانی کی تھی۔ آج اسی آسانی کا بدلہ کسی انجان پر اتار رہا ہوں۔''

اس کہانی کا فلسفہ یہ ہے کہ ہم پر کسی نے نیکی کی ہوتی ہے، ہم اس کا جواب دینے کیلئے

کسی انسان کو تلاش کرتے ہیں اور اس پر نیکی کرتے ہیں اور اس طرح نیکی کا سفر جاری رہتا ہے۔ ٹونی روبنس کہتا ہے کہ یہ کہانی کسی اور کی نہیں ہے، میری اپنی ہے۔ میرے گھر میں غربت اور افلاس تھی، لیکن میری زندگی اس بے لوث انسان کے تحفے کی وجہ سے بدل گئی۔ اس تحفے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ''جب تک انسان اپنے قابل نہ ہو جائے، تب تک وہ دوسروں کے قابل بھی نہیں ہوتا۔'' ہمیں مدد وصول کرنے سے مدد کرنے تک کا سفر طے کرنا ہوتا ہے۔ اگر ہم مدد لینے والے کو مدد دینے والا بنا دیں تو ہم نے معاشرے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔

حالات کا سامنا

ٹونی روبنس کہتا ہے کہ آپ کی زندگی میں جتنے بھی ناپسندیدہ حالات کیوں نہ ہوں، اصل میں وہ حالات ہی آپ کو آگے بڑھنے کا موقع دے رہے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے آدمی کا ایسے حالات سے پالا پڑ جاتا ہے جو وہ نہیں چاہتا۔ اصل میں اس کے پیچھے قدرت کی یہ حکمت کارفرما ہوتی ہے کہ اس نے آپ کے اندر وسعت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح گاڑیوں کو ٹھیک کرنے کیلئے اوزار اور ہتھیار ہوتے ہیں، اسی طرح قدرت کے پاس جو جو اوزار ہیں، وہ حالات کی صورت میں ہوتے ہیں۔ قدرت اس طرح کے حالات پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی جن چیزوں میں کمزور ہوتا ہے، ان حالات کی وجہ سے اس کی وہ چیزیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات ایک فرد کے ساتھ کوئی حادثہ یا واقعہ ایسا ہوتا ہے کہ جس سے اس کی سوچ بدل جاتی ہے اور اسی سوچ کی وجہ سے اس کی زندگی بدل جاتی ہے۔

جو حالات ناپسندیدہ ہیں اور ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔ ہمیں ان کے متعلق مان لینا چاہیے کہ یہ ہماری ہی بہتری کیلئے ہیں۔ جس طرح آپریشن ہو رہا ہو تو اُس وقت مریض کو یہ

شعور نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، کیونکہ وہ بے ہوش ہوتا ہے، لیکن آپریشن ہونے کے بعد پتا چلتا ہے کہ اس ناسور کا نکالنا کتنا ضروری تھا۔ اسی طرح بعض حالات بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ لیکن بعد میں کسی جگہ جا کر پتا لگتا ہے کہ یہ ہماری بہتری کیلئے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ دوسروں کو بدلنے کا سوال اور دوسروں کو بدلنے کی تمنا اس شخص کی نہیں ہونی چاہیے جس نے خود کو نہیں بدلا۔ جو آدمی اپنی بہتری کیلئے کچھ کرنے کے قابل ہے، وہی دوسروں کیلئے کچھ کر سکتا ہے۔

خواب کی تعبیر کیسے؟

یہ کتاب آپ کو سوچنے اور محسوس کرنے کا نیا زاویہ دیتی ہے۔ درحقیقت، خواب کا مکمل ہونا اور اس کا مکمل چاہنا ہی کافی نہیں ہے۔ ہمیں خواب کو تعبیر بنانے کے طریقہ کار کا بھی علم ہونا چاہیے۔ اور اگر خواب حاصل نہیں ہو رہا تو ہمارے اندر پوری گنجائش ہونی چاہیے کہ ہم طریقہ کار کو تبدیل کریں۔ جو شخص بار بار ایک ہی غلطی کرتا ہے، دراصل وہ غلطی سے سیکھتا نہیں ہے اور جو شخص غلطی سے سیکھ جاتا ہے، اسے احساس ہوتا ہے کہ میں نے اس کی قیمت ادا کی ہے۔ قدرت اتنی سخت استاد ہے کہ وہ بار بار وہی عمل دہراتی ہے اور اس وقت تک دہراتی رہتی ہے جب تک آدمی سیکھ نہیں جاتا۔ ماضی گزرا ہوا وقت ہوتا ہے اور اس میں بے شمار تجربات ہوتے ہیں۔ یہ تجربات غلطیوں سے آتے ہیں۔ پھر انھی تجربات کی مدد سے آدمی اپنے مستقبل کو بہتر کرتا ہے۔ ماضی کے معنی کو بدل دیجیے۔ زیادہ تر لوگوں کیلئے ماضی کا معنی پچھتاوا ہوتا ہے۔ خوبصورت بات یہ ہے کہ ماضی کا معنی تجربہ بن جائے اور پھر یہی تجربہ بہتر مستقبل میں معاون ثابت ہو۔

اپنے اچھے دوست بنیں۔ جو اپنا اچھا دوست نہیں ہوتا، وہ کسی کا بھی اچھا دوست نہیں بن سکتا۔ کبھی بھی رکنے والا چلنے والے کا اچھا دوست نہیں بن سکتا۔ چلنے والا ہی چلنے والے کا

دوست بنتا ہے۔ اُڑنے والا ہی اڑنے والے کا دوست بنتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ عزائم مختلف ہوں، لیکن بڑی بات یہ ہے کہ سارے چلتے رہیں۔ چلتے رہنا اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے مقصد کو سامنے رکھنا بڑے اعزاز کی بات ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ فلاں شخص ہماری اڑان کو ممکن بنا دے اور پھر ہم اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ لیکن جب غور کیا جاتا ہے تو اس کے پر کٹے ہوئے ملتے ہیں۔ پھر پتا چلتا ہے کہ یہ تو اڑنے والی مخلوق ہی نہیں ہے۔ بعض انسان اڑنے والوں کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں اور چلنے والوں کے ساتھ اڑنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہے۔ غلط قدم اس اعتبار سے بہت قیمتی ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ مجھے اپنے طریقہ کار کو بدل لینا چاہیے۔ جو شخص غلط قدم اٹھانے کے بعد اپنا طریقہ کار تبدیل نہیں کرتا، وہ بہت احمق ہے۔ غلطی کو غلطی نہ ماننا، بہت بڑی غلطی ہے۔ غلطی کو غلطی سمجھ لینا اور غلطی سے سیکھ لینا عقل مندی ہے۔ جبکہ غلطی پر قائم رہنا جمود کی نشانی ہے۔

تبدیلی کا جذبہ

جتنے لوگ کچھ کر کے دکھاتے ہیں، ان میں تبدیل کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ جس میں یہ مادہ جتنا کم ہوتا ہے، وہ اتنا ہی زیادہ جمود کا شکار ہوتا ہے اور جس میں یہ مادہ جتنا زیادہ ہوتا ہے، وہ اتنا ہی متحرک ہوتا ہے۔ تبدیلی کا جذبہ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ بعض اوقات انسان اپنے آپ سے شروع کرتا ہے اور زمانہ بدل دیتا ہے۔ بعض اوقات انسان فتح خود کو کرتا ہے اور پھر پتا لگتا ہے کہ اس نے دنیا کو فتح کر لیا ہے۔ یہ عجیب و غریب بات ہے کہ بڑے پڑھے لکھے لوگ اعلیٰ تعلیم کے بعد بڑے عہدوں پر بیٹھنے کے باوجود کچھ نہیں کر پاتے۔ اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ ان میں تبدیلی کا جذبہ نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف عام سے لوگ وسائل نہ ہونے کے باوجود اپنے جذبۂ تبدیلی کے ذریعے بڑی تبدیلی لے آتے ہیں۔ ہمیں تبدیلی کے جذبے کو جگانا ہوتا ہے۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ برف کی طرح پگھلتا رہتا ہے۔ اس برف کو سنبھالنے میں جتنی

دیر ہوگی، یہ اتنی ہی کم ہوگی۔ بعض اوقات انسان کے ہاتھ میں برف ہوتی ہے، لیکن وہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ جب خاصی دیر بعد وہ ہاتھ کی طرف دیکھتا ہے تو اس وقت تک برف پگھل چکی ہوتی ہے۔ پھر اس کیلئے تبدیل کرنا ممکن نہیں رہتا۔

جذبے کا صحیح وقت پر استعمال بہت ضروری ہے۔ اگر یہ صحیح وقت پر استعمال ہو جاتا ہے تو یہ اس قدر کارآمد ہے کہ اس سے پوری زندگی بدل جاتی ہے۔

ٹھہری ہوئی ٹرین

دنیا میں خوش بخت، خوش قسمت اور خوش نصیب انسان وہ ہوتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ان کا مستقبل ماضی کی طرح نہ بنے۔ بعض لوگ ایک ایسی ٹرین میں بیٹھے ہوتے ہیں جو ٹھہری ہوتی ہے۔ وہ جتنی دیر مرضی بیٹھے رہیں، وہ کسی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ اگر آپ اپنا مستقبل بدلنا چاہتے ہیں تو اس ٹرین میں سوار ہونا پڑے گا جو چل رہی ہے۔ مسئلہ ہمیشہ کیلئے نہیں آتا، لیکن انسان کی نفسیات ایسی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ تکلیف شاید ہمیشہ کیلئے ہے۔ مسئلہ اصل میں انسان میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ انسان آگے بڑھتا ہے۔ جاوید چوہدری کہتے ہیں، قدرت ہماری زندگی کی ڈش میں پانچ سو ہزار مسئلے رکھ دیتی ہے۔ ہم نے ان مسئلوں کو حل کرنا ہوتا ہے۔ جب آدمی انھیں حل کرتا ہے تو قدرت کو اس کی یہ ادا پسند آجاتی ہے۔ پھر قدرت ایک دن اس کے سامنے بڑا مسئلہ رکھ دیتی ہے۔ وہ اس کو بھی حل کر لیتا ہے۔ پھر قدرت اسے انعام دیتی ہے اور وہ انعام یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا اس کو نیوٹن کے نام سے، آئنسٹائن کے نام سے اور حضرت امام غزالیؒ کے نام سے جاننا شروع کر دیتی ہے۔

آپ یوں تو اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل روزانہ ہی حل کرتے ہوں گے اور عشروں سے حل کرتے چلے آ رہے ہوں گے، لیکن جس دن کوئی بڑا اور غیر معمولی مسئلہ حل کر ڈالا، اس دن آپ کی زندگی بھی غیر معمولی ہونا شروع ہو جائے گی۔ اس دن آپ کے

روشن مستقبل کی جانب آپ کا سفر شروع ہو جائے گا۔

انسان کے پاس سب سے بڑی طاقت فوکس کی طاقت ہے۔ فوکس کیا ہے؟ ہمارا فوکس اسی طرح ہوتا ہے جس طرح فرض کیجیے، کمرے میں اندھیرا ہو اور ہاتھ میں ٹارچ ہو۔ آپ کی ٹارچ کا رُخ جس طرف ہوگا، آپ کا فوکس اسی طرف ہوگا۔ چنانچہ ہمیں پوری دنیا میں وہی نظر آتا ہے جس پر ہم فوکس کرتے ہیں۔ بعض اوقات فوکس ہی اتنا عجیب وغریب ہوتا ہے کہ آدمی کہتا ہے کہ مجھے عجیب وغریب نظر آرہا ہے۔ باباجی اشفاق احمدؒ اپنے استاد سے کہتے ہیں کہ مکھی کی چھیاسی آنکھیں ہوتی ہیں۔ استاد نے جواب دیا لعنت ہے، ایسی مکھی پر جس کی چھیاسی آنکھیں ہیں، لیکن پھر بھی وہ گندگی پر بیٹھتی ہے۔ زیادہ تر لوگوں کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ وہ مسائل تلاش کرتے رہتے ہیں۔ وہ وہاں فوکس کرتے ہیں جہاں فوکس کرنے کا کوئی حل نہیں ملتا۔ ہمیں حل کی طرف فوکس کرنا چاہیے۔ جب بندہ حل کی طرف فوکس کرتا ہے تو مسئلے کو حل کرنے کے نئے نئے طریقے سامنے آنے لگتے ہیں۔ فوکس اس مجنوں کی طرح ہے جو ایک نمازی کے سامنے سے گزرتا ہے تو نمازی نماز توڑ کر اس کا گریبان پکڑتا ہے اور کہتا ہے کہ تم میری نماز کے آگے سے کیوں گزرے۔ مجنوں جواب دیتا ہے، میں تو لیلیٰ کے پیچھے جا رہا تھا، مجھے تو تمھاری نماز کا پتا نہیں چلا۔ لیکن حیرت ہے تمھاری نماز پر کہ جس کے دوران تم نے مجھے دیکھ لیا۔

غلط فیصلوں کی اہمیت

انسان کو کامیابی اس کے اچھے فیصلوں کی وجہ سے ملتی ہے اور اچھے فیصلے تجربات کی وجہ سے آتے ہیں۔ اور یہ تجربات غلط فیصلوں کی وجہ سے آتے ہیں۔ فیصلے میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ جس لمحے آدمی فیصلہ کر رہا ہوتا ہے، اسی لمحے اس کی تقدیر بن رہی ہوتی ہے۔ اس لیے فیصلے پختہ ہونے چاہئیں۔ فیصلہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ جیسے ریت پر لکیر لگی ہو، ذرا سی ہوا چلی

اور وہ لکیر مٹ گئی۔ فیصلہ ایسا ہونا چاہیے کہ گویا پتھر پر لکیر ہے جو مٹ ہی نہ سکے۔ اگر آپ محنتی ہیں اور جدوجہد کررہے ہیں تو کبھی کبھی اپنے سینے پر ہاتھ رکھیں اور اپنے آپ سے کہیں، ''ابھی انتظار کرو، دوست ابھی کہانی باقی ہے۔'' اس جملے میں اتنی طاقت ہے کہ کہنے والے کے اندر امید جاگ جاتی ہے۔

اپنے آپ سے سوال پوچھئے کہ میں کدھر جارہا ہوں؟ جو میں کررہا ہوں، اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ میں ایک عرصے سے کیا کرتا جارہا ہوں؟ فلاں شخص میری زندگی میں کیوں آیا؟ اس کے آنے کا مطلب کیا ہے؟ اس وقت ہی ایسا کیوں ہوا؟ پہلے کیوں نہیں ہوا؟ ابھی تک ایسا کیوں نہیں ہورہا؟ کیا میں کہیں جارہا ہوں؟ کیا میں رکا ہوا ہوں؟ میری زندگی کا کوئی مقصد بھی ہے؟ میری زندگی کسی معنی سے بھی وابستہ ہے کہ نہیں؟ مجھ سے کسی کو کوئی فائدہ ہورہا ہے کہ نہیں؟ میں دنیا میں آنے کا حق ادا کررہا ہوں؟ میں اس دنیا سے جاؤں گا تو یاد بھی رہوں گا کہ نہیں؟ یہ سارے وہ سوالات ہیں جو آدمی کا ذہن تبدیل کردیتے ہیں۔ آپ چاہیں تو کسی ایک سوال سے خود کو جوڑ لیں۔ بار بار اپنے آپ سے وہی سوال پوچھئے۔ جب ایسا ہوگا تو آپ میں سنجیدگی پیدا ہوگی اور تبدیلی آنا شروع ہوجائے گی۔ جب آدمی خود ہی مجرم بنتا ہے، خود ہی منصف بنتا ہے تو تبدیلی آنا شروع ہوتی ہے۔

زندگی کے متعلق آپ نے جو نام رکھے ہیں، انھیں تبدیل کیجیے۔ جیسے زندگی جبر مسلسل ہے۔ اس کو اس طرح بدلیے کہ زندگی ایک امتحان ہے، اطمینان سے اس امتحان کی تیاری کیجیے۔ اگر آپ صرف الفاظ بدلیں گے تو الفاظ میں اتنی قوت ہے کہ چند روز بعد یہ الفاظ آپ کی زندگی میں سرایت کرجائیں گے اور آپ کی زندگی بدلنا شروع ہوجائے گی۔ بے بسی والی شاعری، بے بسی والے جملے، بے بسی والا لٹریچر انسان کو بھی بے بس بنا دیتا ہے۔ وہ انقلاب نہیں لاسکتا۔ انقلاب کیلئے انقلابی ادب چاہیے، انقلابی کتابیں چاہئیں اور انقلابی شخص چاہیے۔ تبھی زندگی میں انقلاب آئے گا۔

کندھا

"اگر آپ نے دوسروں کی مدد کی جو وہ چاہتے ہیں تو آپ کو بھی
وہ مل جائے گا جو آپ چاہتے ہیں!"

زگ زیگلر

باباجی اشفاق احمدؒ فرماتے تھے کہ ہر انسان کو ایک کندھے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا کندھا جس پر کوئی سر رکھے اور اپنا دکھ درد بھول جائے اور دوبارہ زندگی کی جنگ کیلئے تیار ہو جائے۔ پہلے دَور میں ایک بڑی آسانی یہ تھی کہ ایسے لوگ موجود تھے جن سے زندگی کے بارے میں سبق ملتا تھا۔ معاشرے میں ایسے استاد تھے جو پڑھانے کے ساتھ ساتھ زندگی بسر کرنا بھی سکھاتے تھے۔ آج زندگی میں وہ ذرائع نہیں ہیں جو ہمارے معاشرے کے دکھوں اور پریشانیوں کو کم کر دیں۔ ہمارے پاس وہی پروفیسر صاحبان ہیں جو صرف رٹے لگوا رہے ہیں، بچوں کے جی پی اے اور نمبرز آ رہے ہیں، ڈگریاں مل رہی ہیں۔ یوں، تعلیم تو مکمل ہوتی ہے، لیکن زندگی ادھوری رہتی ہے۔

بکاؤ مال

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ معاشرے میں ایک ٹرنڈ یہ بنا کہ تعلیم مہنگی ہے۔ اس نے ایک نیا کلچر پیدا کیا جسے پرائیویٹائزیشن کہتے ہیں۔ اس کلچر نے تعلیمی اداروں کو کمرشل کر دیا جس کی وجہ سے پڑھانے والا استاد بھی کمرشل ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ طالب علم کے ذہن میں یہ

بات بیٹھ گئی کہ میں تو پیسے دے کر تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ اب میرا حق ہے کہ چاہے تو میں ادارے کی دیواریں خراب کروں، چاہے تو میں ادارے کے اثاثے برباد کروں۔ اس کا انتہائی نتیجہ یہ نکلا کہ اسٹوڈنٹ گاہک کی شکل اختیار کر گیا اور استاد کی استادی نہ رہی، وہ ایک بکاؤ مال بن گیا۔

پھر ہوا یوں کہ تعلیمی ادارے کے پاس کندھا بننے کا ایجنڈا رہا اور نہ کسی استاد کے اندر یہ جذبہ کہ وہ اپنے طلبہ کی بہترین رہنمائی کرے۔ وہ اساتذہ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے محفلیں آباد کیں، جنھوں نے داستان سرائے آباد کیا، جنھوں نے محافل لگائیں، جنھوں نے اپنی توانائیاں، اپنے وسائل لگا کر سکھایا اور سمجھایا، جنھوں نے سمجھایا کہ جس طرح فزکس اور کیمسٹری ہوتی ہے، اسی طرح زندگی کی بھی ایک فزکس، کیمسٹری ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر مسئلہ ختم نہیں کر سکتے تو ہمت ہی بڑھا لو۔ زندگی میں کوئی عنوان نہیں تو فرضی عنوان رکھ کر زندگی گزار لو۔ اگر کوئی جوازِ ہستی نہیں ملتا تو جینے کا کوئی چھوٹا سا جواز ہی تلاش کر لو تا کہ دن اچھے گزر جائیں۔

یہ ایسے اساتذہ تھے جو کہتے تھے کہ بڑی منزلوں کے مسافر چھوٹے جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ جو کہتے تھے کہ جس کی منزل بڑی ہے، اس کا دل چھوٹا نہیں ہونا چاہیے۔ جو کہتے تھے کہ بڑے مقام کی طرف جا رہے ہو تو راستے میں اگر کتا پڑے تو کتے کو نہ پڑنا، اپنا راستہ لے لینا۔ آج یہ باتیں سننے کو نہیں ملتیں۔

مشترکہ نظام کی بربادی

ہمارے خاندانوں میں ایک کلچر آپس میں مل بیٹھنے کا تھا جو ایک دوسرے کو آپس میں جوڑے رکھتا تھا۔ چنانچہ اس مشترکہ کلچر میں یہ ممکن تھا کہ اگر والدین نہ سمجھا پائیں تو خاندان کے دوسرے بڑے سمجھا سکتے ہیں۔ اس کلچر میں یہ فائدہ تھا کہ اگر والد صاحب غصے والے

ہیں تو کوئی بات نہیں، دادا تو نرم مزاج ہیں۔ جو یہ کہتا تھا کہ اگر ماں ڈانٹتی ہے تو نانی بچا لے گی۔ یہ کلچر بھی آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔ آج نوے فیصد انسان کے سماجی مسائل میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی مخلص دوست نہیں ہے جس کو وہ اپنا غم سنا سکے، جو مشکل میں اس کی مدد کر سکے۔ جب بلب کا تار اور کھمبے کا آپس میں میل ہی نہیں ہے تو پھر اس کا بجھنا لازمی ہے۔ جس ذریعے سے بجلی آتی ہے اور بلب روشن ہوتا ہے، وہ ذریعہ ہی اس کے پاس نہیں ہے۔ جب کسی سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا گھر والوں کے ساتھ کیسا تعلق ہے تو جواب ملتا ہے، بس ٹھیک ہے، روٹین کی زندگی ہے۔ ایک چھت کے نیچے رہنے کے باوجود کوئی قلبی اور جذباتی تعلق موجود نہیں رہا۔

آج کے نوجوانوں کا المیہ

آج ہمارے نوجوانوں میں سب سے بڑی محرومی رہنمائی کی کمی ہے، کندھے کی کمی ہے۔ انھیں یوں تو سب کچھ مل رہا ہے، لیکن کندھا نہیں مل رہا۔ نوجوانوں کو اپنائیت کا احساس نہیں مل رہا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ استاد کا ادب ہونا چاہیے، لیکن ان کا جی نہیں چاہتا کہ استاد کا ادب کریں۔ جب اس کی وجہ پوچھی جاتی ہے تو جواب ملتا ہے کہ ہم پیسے دے رہے ہیں، ان پیسوں کے عوض ہم ان کی خدمات (سروسز) لے رہے ہیں۔ ان خدمات میں کہیں بھی ادب واحترام نہیں ہے۔ دنیا میں بہترین مرہم بے لوث پیار ہے، بے لوث احترام ہے، بے لوث قدر اور بے لوث اہمیت ہے۔

کبھی مدد لینے والا مدد دینے والا بنے تو یہ کامیابی ہے۔ وہ بھی کیا زندگی کے آدمی مدد ہی لیتا رہے، اپنا ہاتھ نیچے ہی رکھے، کبھی اسے اوپر والا ہاتھ نہ بنائے۔ مدد مانگتے رہنا، دوسروں کا محتاج رہنا، آج ہمارا قومی مزاج ہے۔ اصل کمال تو یہ ہے کہ آپ کا ہاتھ نیچے تھا، کچھ عرصے میں وہ اوپر چلا گیا۔ کمال تو یہ ہے کہ آپ کبھی کندھا ڈھونڈ رہے تھے، آج

آپ کندھا پیش کررہے ہیں۔

زندگی میں خلوص بہت طاقت ور شے ہے کہ ایک چائے کا کپ اور بسکٹ، توجہ سے بات سننا، ذمے داری کا مظاہرہ کرنا اور عزت سے رخصت کر دینا بہت بڑا تریاق ہے۔ ہمارے معاشرے میں وہ تمام قدریں ختم ہوگئیں جو ''کندھا'' بناتی تھیں۔ پروفیسر تو مل رہے ہیں، لیکن ان سے زندگی نہیں مل رہی۔ والدین تو ہیں، لیکن تربیت کا فقدان ہے۔ پہلے مائیں بڑا کندھا بن جاتی تھیں، کیوں کہ وہ سمجھتی تھیں کہ اگر میری ناکامی کل اس کی کامیابی بن گئی تو یہ میری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

کندھا تلاش کرنے کی بجائے، کندھا دیجیے

آج ہر شخص اپنی لاش کو کندھے پر لیے پھر رہا ہے۔ ہر شخص اپنے غم کا مداوا ڈھونڈ رہا ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے سنا جائے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کے غم غلط ہو جائیں۔ ہر شخص کے ہاتھ خود اپنا گریبان چاک کر رہے ہیں اور وہ منتظر ہے کہ کوئی ان ہاتھوں کو ہٹانے والا تو ہو۔ پڑھانے والے بہت ہیں، رٹا لگوانے والے بہت ہیں۔ جی پی اے دینے والے بہت ہیں۔ چرب زبانی کرنے والے بہت ہیں۔ سبز باغ دکھانے والے بہت ہیں۔ مگر...

میں ڈھونڈتا ہوں کہ زندگی کہاں گئی؟ میں وہ کندھا تلاش کرتا ہوں جو مجھے اب کہیں نظر نہیں آتا۔

آج نوجوانوں کی فوج در فوج موجود ہے، لیکن سمت نہیں ہے۔ سکون کے ذرائع نہیں ہیں۔ ہر طرف فرسٹریشن ہے اور وہ اسے کہیں نہ کہیں نکال رہے ہیں۔ وہ بس اپنا وقت کاٹ کر کام چلا رہے ہیں۔ انھیں گالیاں سننا پڑتی ہیں، کیوں کہ وہ اگر کام بھی کرتے ہیں تو کسی کے کندھے پر سر رکھ کر، اپنا کندھا دینے کو تیار نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بیزاری اور

الجھن بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر نوجوان زندگی سے عاجز ہے اور سسٹم کو کوس رہا ہے۔ اپنی غلطی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔

ہم گویا کہ ایک بھنور میں ہیں اور وہ بھنور ہمیں دھنساتا جا رہا ہے۔ ہم ڈوبتے جا رہے ہیں۔ ہمیں ادراک ہی نہیں کہ ہم کس قدر خطرات میں گھرتے جا رہے ہیں۔ اس کا حل کیا ہے؟

اپنے ساتھ مخلص ہو جایئے

خدارا، اپنے ساتھ مخلص ہو جایئے۔ یہ زندگی جو بیس بائیس ہزار دنوں پر مشتمل ہے، ایک بار ملی ہے، اسے پورے خلوص اور محبت کے ساتھ گزاریے۔ خلوص اپنی ذات کے ساتھ، محبت اپنے آپ سے۔ جس دن آپ نے اپنے ساتھ خلوص اور محبت اختیار کر لی، اس دن آپ کو کندھا مل جائے گا۔ ایلف شفک اپنی کتاب ''محبت کے چالیس اصول'' میں کہتی ہے کہ محبت بھری ہوئی ہو تو کائنات میں محبت نظر آتی ہے۔ اپنے اندر محبت ہو تو کسی کو محبت دے سکتے ہیں۔ جو چیز اپنے اندر نہیں ہے، وہ دینا بہت مشکل ہے۔ اگر کسی کی شفقت ملے تو پھر کبھی نہ بھولیے کہ اب آپ کو بھی شفقت دینی ہے۔ اسی طرح زندگی کا پہیا گھومتا رہے گا اور محبت و شفقت پھیلتی رہے گی۔ یہ محبت و شفقت دوسروں کیلئے کندھا بنے گی۔

اگر آج ہم کندھا نہیں بنیں گے تو نیکی مر جائے گی۔ نیکی مرنی نہیں چاہیے۔ اسے چلتے رہنا چاہیے۔ یہ معاشرے میں مدافعت کا نظام ہے۔ اسی سے معاشرہ کھڑا ہے۔ اگر یہ کندھا ختم ہو گیا تو پھر معاشرہ ختم ہو جائے گا۔ پھر اپنی بیٹی کی عزت بچانا مشکل ہو جائے گا۔ بچے کو سڑک پار کرانا مشکل ہو جائے گا، کیونکہ ہر گاڑی اسے کچلنا چاہے گی۔ ایک محترمہ نے ٹرین پکڑنی تھی۔ وہ ناشتا کیے بغیر اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ جب اسے بھوک لگی تو اس نے وہاں سے بسکٹ کا پیک لیا اور اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ کھانے سے پہلے اسے خیال آیا، کیوں ناں

پانی پی لوں۔ یہ خیال آتے ہی اس نے اپنا بیگ اور بسکٹ وہیں رکھا اور سامنے لگے کولر سے پانی پینا شروع کر دیا۔ پانی پی کر جب واپس آئی تو دیکھتی ہے کہ ایک شخص بیٹھا بڑے مزے سے اس کا بسکٹ کھا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اسے بہت تکلیف ہوئی۔ اس شخص نے جب اس کو دیکھا تو اسے بسکٹ دے دیا۔ بھوک کی وجہ سے اس نے لے لیا۔ لیکن اسے یہ گوارا نہ ہوا کہ اکیلے ہی بسکٹ کھا لے۔ لہٰذا، اس نے آخری بسکٹ کے دو حصے کیے اور آدھا خود کھایا اور آدھا اس بوڑھے کو دے دیا۔ بسکٹ کھانے کے بعد وہ بوڑھا اس کی طرف ہاتھ ہلاتا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اسی دوران ٹرین آ گئی وہ اس میں بیٹھ گئی۔ دورانِ سفر اسے کسی چیز کی ضرورت پڑی تو اس نے اپنا بیگ کھولا۔ کیا دیکھتی ہے کہ اندر بسکٹ کا پیکٹ پڑا ہوا ہے۔ اس نے سوچا، وہ بوڑھا کتنا عظیم انسان تھا جو اپنا بسکٹ شیئر کر کے مزے سے کھلا کر مسکراتا ہوا چلا گیا۔

تنقیص کی بجائے قدر کرنا سیکھیے

اگر انسان چھاؤں دینے والے درخت کی قدر نہ کرے تو دھوپ اس کا نصیب ہو جاتی ہے۔ اگر شفقت برتنے والی ماں کی قدر نہ کرے تو پھر اسے قبر پر بیٹھ کر رونا پڑتا ہے۔

زندگی میں قدر کرنا شروع کیجیے۔ اگر آج آپ کندھا تلاش کر رہے ہیں تو یہ نیت ضرور کیجیے کہ کل کو آپ کسی کا کندھا ضرور بنیں گے۔ ٹونی روبنس کے گھر کے حالات اچھے نہیں تھے۔ حتیٰ کہ اس کی ننھی بہن بھوک سے روتے روتے سو گئی تھی۔ اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دروازے پر گیا تو دیکھا کہ ایک صاحب تختے میں ایک باسکٹ لیے کھڑے ہیں۔ اس نے پوچھا، آپ کون ہیں اور یہ باسکٹ کیوں دے رہے ہیں؟ ان صاحب نے جواب دیا، میں اَن جان دوست ہوں اور یہ باسکٹ بھی مجھے ایک اَن جان دوست نے دی ہے جو میں آپ کو دینے آیا ہوں۔

اَن جان خدمت

ٹونی روبنس کہتا ہے کہ اس باسکٹ نے میری کایا پلٹ دی۔ میں نے تہیہ کیا کہ اگر آج میں یہ باسکٹ کا تحفہ لینے پر مجبور ہوا ہوں تو کل مجھے ایسی ہی باسکٹ کے تحفے دوسرے ضرورت مندوں کو دینے کے قابل بننا ہے۔ جب میں عام سے خاص بن گیا۔ میں نے سوچا کہ وہ شخص جس نے مجھ پر بے لوث نیکی کی، اس نے مجھے یہ سکھایا کہ ہمیشہ کسی گمنام، کسی اَن جان کے ساتھ اسی طرح نیکی کرنا تا کہ نہ تم جانو، نہ وہ جانے۔ صرف وہ جانتا ہو جو نیکیوں کا حساب رکھنے والا ہے۔ اگر وہ جانتا ہے تو پھر دنیا کے کسی کمپیوٹر، کسی رجسٹر پر حاضری لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے رجسٹر پر جو مارک ہو گیا، پھر وہ ہمیشہ اس کیلئے خیر سوچتا ہے۔ وہ اس کیلئے راستے آسان کرتا ہے۔ وہ شخص منزلوں کی طرف نہیں چلتا، منزلیں اس کی طرف لپک لپک کر آنے لگتی ہیں۔

خوشحالی کا فلسفہ

''جس انسان کو یقین ہو کہ وہ کر سکتا ہے، وہی انسان پا بھی سکتا ہے!''

نپولین ہل

ساری کائنات کا نظام اصول وضوابط سے چل رہا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سورج وقت پر نہ نکلے اور وقت پر غروب نہ ہو۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مہینوں کے دن بدل جائیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ سال کے دن چار سو ہو جائیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ چاند کے دن بدل جائیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ دریا مخالف سمت میں بہنا شروع کر دے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ پودے کے بیج بن جائیں۔ یہ سارے اصول وضوابط اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو چلانے کیلئے بنائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ میں اپنی سنت نہیں بدلتا۔ سنت سے مراد وہ اصول وضوابط ہیں جو اس نے اس کائنات کو چلانے کیلئے بنا دیے ہیں اور وہ تبدیل نہیں ہو سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لمحے کیلئے محض کشش ثقل ہی ختم ہو جائے تو تمام انسانوں کے پرخچے اڑ جائیں۔

کامیابی کے بھی بے شمار اصول وضوابط ہیں۔ سائنس کے ماہرین نے جس طرح نیچرل سائنسز یعنی فزکس، کیمسٹری وغیرہ پر تحقیق کی، اسی طرح کامیابی کے ماہرین نے کامیابی پر تحقیق کی۔ اب تو کامیابی پر اتنی زیادہ تحقیق ہو چکی ہے کہ لاکھوں کتابیں بازار میں موجود ہیں۔ آج بھی اس موضوع پر تحقیق جاری ہے۔ آج بھی اداروں میں بچوں کو اسائنمنٹ دی جاتی ہے کہ فلاں شخص کی کامیابی میں کون سے اصول کارفرما تھے۔ اب کامیابی

باقاعدہ ایک سائنس بن چکی ہے۔ جو شخص ان سائنسی اصول وضوابط کی پیروی کرتا ہے، وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

امریکی تاریخ کا امیر ترین شخص

امریکا کی تاریخ میں ایک شخص گزرا ہے جس کا نام ''اینڈریو کارنیگی'' تھا۔ اس نے لیبر کے طور پر کام شروع کیا۔ کام کرتے کرتے سپروائزر بنا، لیکن کچھ ہی سال میں وہ امریکا کا امیر ترین فرد بن گیا۔ جب وہ اتنا کامیاب ہو گیا تو ایک دن اس کے دل میں خیال آیا کہ کامیابی پر باقاعدہ تحقیق ہونی چاہیے۔ اس نے اخبار میں اشتہار دیا اور اس اشتہار میں لکھا کہ مجھے ایک ایسا تحقیق کرنے والا چاہیے جسے تنخواہ نہیں ملے گی، لیکن وہ کام میرے ساتھ کرے گا۔ اشتہار کے جواب میں بے شمار تحقیق کرنے والے آئے۔ ان میں سے اس نے ایک جوان کو منتخب کیا جس کا نام نپولین ہل تھا۔ نپولین ہل نے پچیس سال میں بیس ہزار کامیاب اور ناکام لوگوں پر تحقیق کی۔ کارنیگی کے دوستوں میں ایڈیسن، برڈ اسٹون، ہنری فورڈ جیسے لوگ شامل تھے۔ کارنیگی نے اپنے لیٹر پیڈ پر انھیں خط لکھا کہ نپولین ہل جو تحقیق کرنا چاہتا ہے، آپ اس میں اس کی مدد کریں۔

جب بیس ہزار لوگوں کے انٹرویو مکمل ہوئے تو دنیا کے سامنے کامیابی کے موضوع پر باقاعدہ ایک مقالہ سامنے آیا جس کا نام تھا، Think and Grow Rich۔ یہ دنیا میں پہلی باقاعدہ کتاب تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ کامیابی کیا ہوتی ہے، یہ کن لوگوں کو ملتی ہے، یہ کیسے ممکن ہوتی ہے، اس کو کیسے قائم رکھا جا سکتا ہے۔

نپولین ہل کے بعد دوسرا نام ڈیل کارنیگی کا ہے۔ ویسے تو اس کا زیادہ تر کام گفتگو کے حوالے سے ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے کامیابی کے موضوع پر بھی کئی کتابیں لکھیں۔ کامیابی کے موضوع پر موجودہ دور میں نمایاں ترین نام اسٹیفن آر کوی، انتھونی

روبنس، جیک کینفیلڈ، رھونڈا بائرن، جان اساراف، باب پروکٹر وغیرہ ہیں۔ ان لوگوں نے بھی کامیابی کے موضوع پر بہت کام کیا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے کتابیں تو اتنی نہیں لکھیں، لیکن تحقیق بہت زیادہ کی۔ ان تمام لوگوں نے اپنی زندگیاں لگا کر دنیا کے سامنے پہلی بار کامیابی کی سائنس کو آشکار کیا اور دنیا کو بتایا کہ کامیابی کیسے ممکن ہے۔

جنون خواہش

نپولین ہل نے پہلی بار دنیا کو بتایا کہ کامیاب لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے پاس جنونی خواہشیں ہوتی ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ صرف خواہش کافی نہیں ہے۔ ہر شخص کامیاب ہونا چاہتا ہے، لیکن خواہش کے ساتھ ''جنون'' کامیابی کو ممکن بناتا ہے۔ جو لوگ جنونی، جذباتی، غصیلے ہوتے ہیں یا جو لوگ کچھ کرنا چاہتے ہیں، ایسے لوگ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ جو لوگ ٹھنڈے، جمود کا شکار، نظام کے ماتحت ہیں، ایسے لوگ کامیاب نہیں ہوتے۔ نپولین ہل کہتا ہے کہ کامیاب لوگوں کے پاس خواب ہوتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس خواب ہیں اور ساتھ میں جنون بھی ہے تو پھر خواب کی تعبیر ممکن ہو جاتی ہے۔

خواہش، جنون اور خواب کے بعد اگلی شرط استقامت ہے۔ وہ لوگ کامیاب ہو جاتے ہیں جن کے پاس استقامت ہوتی ہے، کیونکہ کامیابی بڑی قیمت مانگتی ہے اور وہ قیمت استقامت کی شکل میں ہوتی ہے۔

نپولین ہل کہتا ہے کہ منصوبہ بندی کرنے والے لوگ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر آپ ایک دن کی، ہفتے کی، مہینے کی یا پھر سال کی اچھی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں تو پھر زندگی کی بھی اچھی منصوبہ بندی ہو سکتی ہے۔ اگر آپ کا دن، ہفتہ، مہینہ اور سال اچھا پلان نہیں ہو سکتا تو پھر زندگی کی بھی اچھی پلاننگ نہیں کر سکتے۔ پلاننگ کا مطلب یہ ہے کہ دیے گئے وسائل اور دیے گئے وقت کو سامنے رکھتے ہوئے بہترین نتائج تک پہنچنا۔ آپ اپنے وقت

کو، اپنے وسائل کو، اپنی توانائی کو پلان کرتے ہیں، تب کہیں پہنچ پاتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ کامیاب ہونے والے لوگ جذباتی طور پر بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات عام لوگوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ جذبات کے ساتھ ان کے اندر احساس بھی دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔

محبت کی قوت

نپولین ہل کہتا ہے کہ دو ہزار سال میں گزرے لوگوں کی سوانح حیات اس بات کی گواہ ہے کہ کامیاب ہونے والے لوگوں نے اپنی محبت کو بڑے مثبت انداز میں استعمال کیا۔ انھیں پتا تھا کہ یہ انتہائی طاقت ور چیز ہے۔ اگر اسے بے لگام گھوڑے کی طرح چھوڑ دیا گیا تو یہ ہمیں نیچے گرا دے گی اور ناکام کر دے گی۔ انھوں نے اسے کسی ایسے کام میں ڈالا کہ ایک دن دنیا نے دیکھا کہ وہ بہت بڑے سائنس داں، صوفی یا بزنس مین بن گئے۔

جو آدمی محبت سے عاری ہے، وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنے غصے کی وجہ سے کچھ کر کے دکھا دیا۔ کسی نے انھیں کوئی جملہ کسا یا برا بھلا کہا تو بجائے اس کے کہ وہ اس کا جواب دیتے، انھوں دنیا کو کچھ کر کے دکھا دیا۔ پھر دنیا حیران ہوئی کہ اتنے غریب گھر کی لڑکی مادام کیوری کیسے بن گئی، آئن سٹائن کیسے بن گیا، شیکسپیئر کیسے بن گیا، وارث شاہؒ کیسے بن گئے، علی بن عثمان ہجویریؒ کیسے بن گئے۔ یہ دنیا کے وہ بڑے نام ہیں جنھوں نے شاید کالج اور یونیورسٹی کا منہ نہیں دیکھا، لیکن ان کے بغیر کالج اور یونیورسٹی ادھوری ہوتی ہیں۔ بل گیٹس نے یونیورسٹی چھوڑی تھی، لیکن پھر اسی یونیورسٹی نے اسے اعزازی پی ایچ ڈی کی ڈگری دی اور اس کے لیکچر ہوئے۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے طلبہ کو دیکھتے ہوئے کہا، دیکھا میں واپس آ گیا اور میں نے ثابت کر دیا کہ اگر آپ بولنے کی بجائے کر کے دکھاتے ہیں تو دنیا کو خود ہی اعتراف کرتی ہے کہ آپ کامیاب ہیں۔

تحقیق کے مطابق، مثبت کا اثر منفی سے سو گنا زیادہ ہوتا ہے، لیکن ہم عام طور پر منفی اثر لینے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہم سوچتے ہی نہیں کہ مثبت کا بھی اثر لینا ہے۔ اگر ہماری کوئی تعریف کرے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اسے ہم سے کوئی کام ہے۔ ہمیں کوئی اچھا کہے تو ہمیں شک ہونے لگتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ہمیں جب کہا جاتا ہے کہ تم بڑے کمال کے انسان ہو تو ہم سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ کیوں ایسی بات کر رہا ہے۔ لیکن جب کوئی ہمیں برا کہتا ہے تو ہم فوری طور پر یقین کر لیتے ہیں۔ ہمیں کوئی گالی دیتا ہے تو ہم ثابت کر کے دکھاتے کہ ہم ایسے ہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم منفی برتاؤ کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم نے اپنے اندر ایک ایسی جگہ بنالی ہے جس میں منفیت کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اگر ہم مثبت کا زیادہ اثر لینے لگیں تو ہماری کامیابی جلد ممکن ہو جائے گی۔

تھامس اسٹینلے، اکیسویں صدی میں دولت کے راز

نپولین ہل کے بعد کامیابی پر سب سے معروف تحقیق تھامس اسٹینلے کی ہے۔ اس نے 765 دنیا کے امیر ترین لوگوں پر تحقیق کی۔ اس کے بعد اس نے کامیابی کی تیس وجوہ بیان کیں۔ اس تحقیق میں اس نے یہ بتایا ہے کہ کامیابی میں سب سے پہلی وجہ دیانت داری ہوتی ہے۔ دنیا میں وہ لوگ کامیاب ہوتے رہے ہیں جو دیانت دار ہوتے ہیں، جن کا لین دین درست ہوتا ہے، جو اس یقین کے ساتھ چل رہے ہوتے ہیں کہ اگر ہم نے دھوکا کیا تو ہم ناکام ہو جائیں گے۔ دیانت داری ایک کائنات قدر (یونیورسل ویلیو) ہے اور کائناتی قانون کی طاقت بھی۔ قدرت ان لوگوں کو بہت پسند کرتی ہے جو دیانت دار ہوتے ہیں۔

دیانت داری سب سے پہلے خود سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے کردار اور خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی لوگ دھوکا دینے والے ہوتے ہیں، ان کے اندر خود اعتمادی کی کمی ہوتی ہے۔ ہم جب بھی کسی اچھے قانون کو، کسی ویلیو کو، کسی قدر کو اپنے پر

لاگو کرتے ہیں اور اس پر کاربند ہو جاتے ہیں تو ہماری شعاعیں مثبت ہو جاتی ہیں۔ یہ شعاعیں دوسروں تک جاتی ہیں جس سے انہیں پتا لگ جاتا ہے کہ یہ اچھا انسان ہے۔

تھامس اسٹینلے کہتا ہے کہ وہ لوگ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو بہت زیادہ محنتی ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہر چیز کا متبادل ہے، لیکن محنت کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ اگر ہم خود محنت نہیں کرتے تو دراصل ہم خود قدرت کے ساتھ سرمایہ کاری نہیں کرتے۔ قدرت کو دو طرح کی سرمایہ کاری بہت پسند ہے۔ ایک محنت اور دوسرا اخلاص۔ تھامس کہتا ہے کہ کامیاب ہونے کیلئے ساتھ چاہیے۔ دنیا میں کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایک اچھی کمپنی، اچھی بیوی، اچھا پارٹنر یا ایک ایسا دوست نہ ہو جس کے ساتھ وہ اپنے دل کی ہر بات کر سکے۔ اشفاق احمد کہتے ہیں کہ ہر پاکستانی کو ایک کندھے کی ضرورت ہے جہاں وہ سر رکھے اور رو لے۔ کامیابی میں بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں کئی بار دل ٹوٹتا ہے، آدمی زخمی ہوتا ہے، زمانہ برا بھلا کہتا ہے، رکاوٹوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ بے شمار لوگ راستے میں پتھر اٹکاتے ہیں۔ اگر کوئی ساتھ نہیں ہے تو پھر کامیابی نہیں ملتی۔

آخر میں تھامس اسٹینلے کہتا ہے کہ کامیاب لوگوں کا آئی کیو بہت اچھا نہیں ہوتا، کیونکہ کامیابی میں آئی کیو اتنا کردار ادا نہیں کرتا جتنا اپنے آپ سے برتاؤ اہم ہے۔ کامیابی میں خوش قسمتی اور تعلیم کا بھی اتنا کردار نہیں ہوتا، اس لیے تھامس نے ان عوامل کو آخر پر رکھا۔ موجودہ دور میں کامیابی کے ماہرین تھامس اسٹینلے کی اس تحقیق کو بہت ہی عملی (پریکٹیکل) مانتے ہیں۔

انسان کے فقط ابتدا کرنے کی دیر ہوتی ہے، کامیابی اس کے قریب آنا شروع ہو جاتی ہے۔ ابتدا کیجیے۔

ایک انسان، کئی ذہانتیں

''جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے، وہ مختلف طریقوں سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ یوں یہ مختلف طریقے ہماری کثیر ذہانتوں کو متحرک کر سکتے ہیں!''

ہوورڈ گارڈنر

دنیا میں پہلی بار 1980ء میں ہوورڈ گارڈنر نے یہ کہا کہ ذہانت ایک طرح کی نہیں ہوتی، بلکہ یہ کئی طرح کی ہوتی ہے۔ اس سے پہلے دنیا سمجھتی تھی کہ آئی کیو ہی سب کچھ ہے۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ صحیح حساب کتاب، چیزوں کو یاد رکھنا، حافظہ اور یادداشت کا بہترین ہونا ہی ذہانت ہے۔ گارڈنر نے پہلی بار کہا کہ ذہانتیں آٹھ طرح کی ہوتی ہیں۔ اس نے اس نظریے کو Multiple Intelligence یعنی کثیر جہتی ذہانت کا نظریہ کہا۔

اس نے یہ نظریہ پیش کرنے کیلئے ان بچوں پر تحقیق کی جو ذہنی طور پر ابنارمل تھے۔ اس نے جب غور کیا تو اسے پتا لگا کہ ابنارمل بچے بھی بلا کے ذہین ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اس نے کچھ بچوں کو دیکھا کہ وہ بہت اچھا گانا گاتے ہیں، کچھ بچے کسی اسپورٹس میں بہت اچھا پرفارم کرتے ہیں، کچھ ڈانس بہت اچھا کرتے ہیں، کچھ بات چیت بہت اچھی طرح کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ انسان کے اندر یہ نو طرح کی ذہانتیں مل کر فیصلہ کرتی ہیں کہ انسان کتنا ذہین ہے۔ یہ ذہانتیں ہر انسان میں مختلف ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اس کی شخصیت اور اس کے مستقبل کا اندازہ ہوتا ہے۔

ذہانت کوئی چھونے والی شے نہیں ہے۔ یہ نظر نہیں آتی، لیکن محسوس ہوتی ہے۔ اگر کوئی

شخص اپنے گانے کی صلاحیت کو دیکھنا چاہے تو اس کو گانا گانا پڑے گا۔ کچھ ایسا نہیں ہوگا کہ اندر کوئی آلہ لگ جائے یا کوئی ایسا اوزار لگ جائے جس کی وجہ سے وہ گانا گالے۔ درحقیقت، یہ اُس کے اندر کی وہ صلاحیت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ گانا گاتا ہے۔

آپ کی ذہانتوں کی درجہ بندی

ہم جتنے کام کرتے ہیں، ان میں وہ کام جو ہم بہترین انداز میں کرتے ہیں اور ہمیں محسوس بھی ہوتا ہے کہ یہ قدرتی طور پر ہمارے اندر پائے جاتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحفہ ہوتا ہے اور یہ ہماری ذہانتیں ہوتی ہیں۔ ہر شخص کی ذہانت مختلف ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ مختلف انداز میں کام کرتا ہے۔ ہم کبھی بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی شخص میں اگر ایک ذہانت ہے تو باقی نہیں ہیں۔ بنیادی ذہانت ایک ہوتی ہے، البتہ اس ذہانت کے ساتھ اور بھی ذہانتیں ہوتی ہیں جنھیں ایک، دو، تین اور اسی طرح نمبر وار ترتیب دیا جاتا ہے۔ پہلی ذہانت سے دوسری تھوڑی کم ہوتی ہے، پھر تیسری تھوڑی کم ہوتی ہے، پھر چوتھی اور سب سے کمزور ذہانت آٹھویں نمبر پر ہوتی ہے۔ پہلے نمبر کی ذہانت کو بادشاہی یا کنگ ذہانت کہا جائے گا۔ اگر کوئی شخص بہت اچھی بات چیت کرسکتا ہو تو یہ اس کی بادشاہی ذہانت کہلائے گی۔ لیکن اگر گانا گانے کی باری آئے تو وہ باتھ روم سنگر ہو۔ وہ گانا گا ہی نہ سکے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ اس کے آٹھویں نمبر کی ذہانت ہے۔

بعض لوگ بہت اچھے مینیجر ہوتے ہیں۔ وہ چیزوں کو بہت اچھی طرح مینج کرتے ہیں۔ وہ تقریبات کو، گھر کی چیزوں کو، گھر کے کاموں کو بہت اچھی طرح مینج کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ نویں نمبر پر کہیں جا کر دیکھتے ہیں تو ان کے اندر بولنے کی صلاحیت بہت کم پائی جاتی ہے۔ اس سے پتا چلا کہ ان کی بہترین ذہانت مینج کرنا ہے، لیکن ان کے اندر چونکہ بولنے کی صلاحیت زیادہ اچھی نہیں تھی اس لیے ان کی آٹھویں نمبر کی ذہانت کمزور کہلائے گی۔

قدرت کا متوازن نظام

کوئی بھی شخص مضبوط اور کمزور ذہانت کا مرکب ہوتا ہے۔ قدرت نے ایک تناسب کے ساتھ ہم میں یہ ذہانتیں رکھی ہیں، کیونکہ قدرت کو نظام چلانا ہے۔ اگر ساری دنیا کے پاس صرف بولنے کی ذہانت وصلاحیت ہی آجائے تو پھر کوئی سننے والا نہیں ہوگا۔ اگر ساری دنیا پینٹ ہی کرنا شروع کردے تو پھر یہ دنیا خوبصورت نہیں لگے گی۔ اسی طرح ساری دنیا سنگر ہوتو پھر سارے گانا شروع کردیں اور کوئی سننے والا نہیں ہوگا۔ یہ ساری ذہانتیں دنیا کے حسن و چار چاند لگاتی ہیں اور انہیں سے دنیا کا نظام بھی چلتا ہے۔ انھیں ذہانتوں کی وجہ سے ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے، ہم میں ایک ذہانت ہو، وہ دوسرے کے کام آئے۔ اسی طرح ایک ذہانت کی کمی ہو، دوسرے فرد کی ذہانت اس کمی کو پورا کردے گی۔ قدرت نے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان ذہانتوں کی ترتیب ہر ایک میں مختلف ہوتی ہیں۔

آٹھ طرح کی ذہانتیں یہ ہیں:

1 فطرت شناس

بعض لوگوں کا فطری چیزوں کے ساتھ بہت گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔ ان کو جانوروں کا، سیر وسیاحت کا، قدرتی چیزیں دیکھنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ ان کا فطرت کے ساتھ بالکل ایسے ہی تعلق ہوتا ہے جیسے اپنے رشتے داروں سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ فطرت کے ساتھ اسمارٹ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جنگلوں میں سیر کرتے، بادلوں کو دیکھتے مست ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ قدرت کو سمجھنے اور اس کو معانی دینے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق، یہ لوگ فطرت شناس ہوتے ہیں، یعنی Naturalist Inteligent

(nature smart)۔

2 میوزک اسمارٹ

بعض لوگ بہت اچھا گانا گا لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ موسیقی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اچھے اور برے گانے والے کی تمیز بہت خوب کر لیتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی کی آواز سن کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ یہ کس کیفیت میں ہے یا یہ کیسا سوچ رہا ہے۔ بعض ردھم دریافت کر لیتے ہیں۔ وہ ہوا کی آواز اور پتوں کی آواز سے بھی ردھم بنا لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ بہت اچھے موسیقار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بہت اچھی دھنیں ترتیب دیتے ہیں۔ یہ بہت اچھے طریقے سے موسیقی کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ کثیر جہتی ذہانت کے نظریے کے مطابق انھیں Musical Intelligent کہتے ہیں۔

3 منطق اور حساب کے ذہین

اس ذہانت میں حساب کتاب، تجزیہ کرنا، یہ پتا لگانا کہ کوئی چیز کہاں تک جا سکتی ہے، کی مہارتیں آتی ہیں۔ کئی لوگوں کو زبانی ٹیلی فون نمبر یاد ہوتے ہیں۔ انھیں گاڑیوں کے نمبر یاد ہوتے ہیں۔ انھیں بے شمار اعداد و شمار یاد ہوتے ہیں۔ ایسے افراد کے اندر منطق کی ذہانت ہوتی ہے۔ اس ذہانت کے لوگ بہت اچھے ریاضی دان اور سائنس دان ثابت ہوتے ہیں۔ اسے Logical-Mathematical Intelligent کہتے ہیں۔

4 خودشناس

اس ذہانت کا مطلب ہے کہ ہم جس جگہ پر رہ رہے ہیں، کس طرح سے رہ رہے ہیں،

اپنی موجودگی کو کیسے سمجھتے ہیں، خود سے کتنے شناسا ہیں، خود کو کتنا سمجھتے ہیں، اپنے مقام اور مرتبے اور اپنی ذات کو کس طرح سے لیتے ہیں۔ جن لوگوں میں یہ ذہانت ہوتی ہے وہ بہت زیادہ ترقی کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کو بڑا بہتر سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہائی جیک کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ کسی کی باتوں میں نہیں آتے۔ یہ بہت جلد کسی سے متاثر نہیں ہوتے، کیونکہ ان کو پتا ہوتا ہے کہ وہ اصل میں کیا ہیں اور ان کی ذات کیا ہے۔ اس ذہانت کو Intrapersonal Intelligence کہتے ہیں۔

5 سماجی ذہانت

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ کتنے بہتر تعلقات رکھتے ہیں۔ ہماری دوسروں کے ساتھ بات چیت کیسی ہے، ہمارا دوسروں کے ساتھ تعلق کیسا ہے، دوسروں کو کیسے عزت دیتے ہیں، دوسروں کو کیسے لے کر چلتے ہیں، دوسروں کے ساتھ کیسے رہتے ہیں۔ اس ذہانت کے حامل لوگ اچھے استاد، سوشل ورکر، اداکار اور سیاستدان ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ ذہانت دوسروں کی رہنمائی اور موٹیویشن میں بڑی معاون ہے۔ اسے انگریزی میں Interpersonal Intelligence کہتے ہیں۔

6 محسوس کرنے کی ذہانت

بعض لوگ چیزوں کے بارے میں اندازے بہت درست لگاتے ہیں۔ وہ بہت جلد محسوس کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ کی زبان پر جیسے ہی کوئی کھانے والی چیز آئے تو وہ فوری طور پر اس کا ذائقہ بھانپ لیتے ہیں۔ انھیں پتا لگ جاتا ہے کہ یہ شے ذائقے دار ہے یا نہیں۔ دنیا کے کسی کونے سے کسی انٹرنیشنل فاسٹ فوڈ کا پروڈکٹ استعمال کریں، اس کا ذائقہ ایک سا محسوس ہوگا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ کاروباری لوگ محسوس کرنے والوں کو بہت زیادہ پیسہ

دیتے ہیں تاکہ وہ ساری دنیا میں ایک ساذائقہ برقرار رکھیں۔ ایسے لوگ چیزوں کے بارے میں تجزیہ بہت اچھا کرتے ہیں۔ اس ذہانت کا انگریزی نام Bodily-Kinesthetic Intelligence ہے۔

7 زبان

اس ذہانت کا تعلق زبان سیکھنے اور سمجھنے سے ہے۔ بعض لوگ ایک سے زیادہ زبانیں سیکھنے کے ماہر ہوتے ہیں، جبکہ بعض لوگ ساری زندگی اپنی مادری زبان سے ہی باہر نہیں نکل پاتے۔ جو لوگ اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کو بھی سیکھتے ہیں، ان میں دوسری زبان سیکھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ایسے لوگ بہت اچھے مترجم (ٹرانسلیٹر) اور مبلغ (کمیونیکیٹر) ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ایک زبان کو دوسری زبان میں منتقل کر لیتے ہیں۔ انھیں ایک سے زائد زبانیں بولنے پر عبور ہوتا ہے۔

8 تصویری ذہانت

بعض لوگ تصاویر کو بہت اچھے طریقے سے دیکھتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز اور قوی ہوتا ہے۔ وہ کوئی بھی منظر دیکھتے ہیں تو اس کے بعد فوراً اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے، یہ کس طرح ہے، اس کا معانی کیا ہے۔ ان کیلئے تصویروں کو معانی دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ یہ لوگ فطری حسن یا دنیا کی خوبصورتی کے بارے میں بہت ذہین ہوتے ہیں۔ اسے Spatial Intelligence کہا جاتا ہے۔

ذہانتوں کا عمل

ذہانت ایک شرارتی بچے کی طرح ہوتی ہے۔ جس طرح ایک گھر میں ایک شرارتی بچہ

ہو، اگر اسے کمرے میں بند کر دیں تو تھوڑی دیر بعد وہ دروازہ کھولے گا اور گھر والوں کو تنگ کرنا شروع کر دے گا، چیزیں توڑے گا، اس کا جی چاہے گا کہ کوئی نہ کوئی شرارت کروں۔ جس ذہانت میں شدت ہے تو وہ اس فرد کو بار بار تنگ کرے گی۔ وہ کہے گی کہ مجھے استعمال کرو، مجھے باہر نکالو، مجھے کام میں لاؤ، مجھ سے کام لو۔

ہر ذہانت کی اپنی اہمیت اور اپنا کام ہے۔ مثال کے طور جتنے لوگ منطق، حساب یا تجزیے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں، ان لوگوں کو جاب بھی ویسی کرنی چاہیے۔ اگر وہ ایسی جاب کرتے ہیں تو پھر اس میں ان کو کامیابی بھی ملے گی اور نام بھی۔

والدین کی ذمے داری

والدین کو پتا ہونا چاہیے کہ بچوں میں صرف ایک ذہانت نہیں پائی جاتی بلکہ نو طرح کی ذہانتیں پائی جاتی ہیں۔ بسا اوقات ہم بچے کو اس کی پڑھائی کی وجہ سے اس کی ذہانت کا اندازہ لگا رہے ہوتے ہیں جبکہ ان ذہانتوں کو نہیں جانتے جو یادداشت کے علاوہ بھی اس میں پائی جاتی ہیں۔ ممکن ہے، دوسری ذہانتیں بہت زیادہ اچھی ہوں اور قدرت نے اس کا نصیب اور اس کی کامیابی دوسری ذہانتوں کے ساتھ جوڑی ہو۔

ہم لوگ اپنے مستقبل کیلئے نجومیوں اور عاملوں کے پاس جاتے ہیں، لیکن ان کے پاس جانے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ ہوورڈ گارڈنر کی تحقیق پڑھی اور سمجھی جائے۔ علم میں اتنی طاقت ہے کہ علم جہالت کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر ہم یہ تحقیق پڑھتے ہیں تو پھر ہمیں اپنا مستقبل بھی اچھا لگے گا، کیونکہ ہمیں اپنی صلاحیت کا پتا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا مستقبل ہماری صلاحیت کے ساتھ جڑا ہے، جبکہ صلاحیت کا تعلق ہماری فطری ذہانت کے ساتھ ہے۔ مثال کے طور پر، جو شخص بہت اچھا بولتا ہے، اگر وہ کسی جوتشی کے پاس جائے تو وہ اس کو کہے گا کہ تمہارا مستقبل تمہارے بولنے میں ہے۔ اگر ہم نو ذہانتوں کے متعلق اپنا علم

بڑھا لیتے ہیں تو پھر اپنی ذات کی آشنائی، دوسروں کو سمجھنا، دوسروں کو کام پر لگانا، ان سے درست امید لگانا، ٹیم بنانا، لیڈر کے طور پر کام کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔

اہلیت وقابلیت کے غلط پیمانے

دنیا میں کوئی شخص نالائق نہیں ہوتا۔ ہر شخص لائق ہے۔ صرف یہ دیکھنا ہے کہ وہ کس شعبے میں ذہین ہے۔ ہم ایک ایسا پیمانہ لیتے ہیں جس سے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے فاصلے کو لیٹر سے ماپا جائے۔

یہ ذہانتیں ہمیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ نو طرح کی ذہانتوں کو ماپنے کیلئے ہمیں نو طرح کے پیمانوں کا استعمال کرنا پڑے گا۔ اگر ہم ایک پیمانے کو کسی ایسی ذہانت پر لگائیں گے جس پر وہ نہیں لگتا تو یقینی بات ہے کہ پھر وہ شخص ہمیں نالائق لگے گا، حالانکہ ممکن ہے وہی شخص ایک مکمل شاہکار ہو۔

ذہانت کی اتنی طاقت ہے کہ یہ آدمی کو کھینچ کر ایک بڑے مقام پر کھڑا کر سکتی ہے۔ تاریخ میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ذہانت کو اپنے اندر سے باہر نکالا، پھر اس ذہانت نے ان کو نامور کر دیا۔

معاشی ترقی

''اگر تم اپنی زندگی بدلنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے تمہیں اپنی سوچ کو بدلنا ہوگا!''

لاطینی کہاوت

امیر ہونے والے لوگوں کی سوچ

ماہرین کامیابی کا کہنا ہے کہ انسان کی امیری یا دولت مندی کا تعلق اس کے وسائل اور دستیاب پیسے سے نہیں ہوتا، بلکہ ایک فرد کی امیری کا تعلق اس کی سوچ سے ہوتا ہے۔

امیر آدمی کی سوچ میں درج ذیل خوبیاں ہونی چاہئیں:

1) جیت کی چاہت

تمام امیر ہونے والے لوگ جیتنا چاہتے ہیں، جبکہ غریب ہارنا نہیں چاہتا۔ اس بات کو یوں سمجھئے کہ ایک بچہ نمبر لینا چاہتا ہے، جبکہ ایک بچہ فیل نہیں ہونا چاہتا۔ بہ ظاہر دونوں باتیں ایک سی لگتی ہیں، مگر ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ جو فیل نہیں ہونا چاہتا، وہ صرف اتنی کوشش کرے گا کہ بس پاس ہو جائے۔ اور جو نمبر لینا چاہتا ہے وہ سوچتا ہے کہ میں زیادہ نمبر کیسے لے سکتا ہوں۔ جیت کی چاہت اور خواہش کچھ اور ہے، ہار سے بچنے کی خواہش کچھ اور ہے۔

تمام کے تمام امیر یا امیر ہونے والے لوگ بہت سی دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

جتنے غریب لوگ ہوتے ہیں، وہ جتنا کماتے ہیں، اتنے ہی ان کے خرچے ہوتے ہیں۔ غریب پیسہ خرچ کرکے یہ سمجھتا ہے کہ کام ختم ہوگیا۔ امیر خرچ کرنے کے بعد جو پیسے بچ جائیں، ان کو اثاثہ سمجھتا ہے۔ امیر بچت کے بعد جو بچ جائے، اس سے اخراجات پورے کرتا ہے؛ غریب خوب خرچہ کرکے اگر کچھ بچ جائے تو بچت کرتا ہے۔

امریکا میں ایک ٹڈا ہے جو گھاس پر پانچ میٹر تک جمپ کرسکتا ہے۔ اس ٹڈے کو چار میٹر کے باکس میں رکھ دیا گیا۔ کچھ دن کے بعد باہر نکالا تو اُس کی جمپ چار میٹر ہوچکی تھی۔ اسی طرح، تین میٹر کے باکس میں رکھا گیا تو کچھ عرصے بعد نکالا اس کی جمپ تین میٹر تک ہوچکی تھی۔ اسی طرح، دو میٹر کے باکس میں رکھا گیا، پھر ایک چھوٹی ڈبیا میں رکھا گیا۔ جب باہر نکالا تو وہ جمپ لگانا بھول چکا تھا۔ یہی حال انسان کا ہے۔ وہ اپنی صلاحیت کو اپنی خواہش کے مطابق کم یا زیادہ کرسکتا ہے۔ جب آپ امیر ہونے کیلئے بہت سا پیسہ کمانے کیلئے اپنا ذہن بناتے ہیں تو آپ کے اندر ویسی ہی صلاحیتیں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ جب آپ بل ادا کرنے کا سوچتے ہیں تو صلاحیتیں بھی بل ادا کرنے والی ہو جاتی ہیں۔

2) اپنی صلاحیتوں پر یقین

ہر کامیاب اور امیر ہونے والے آدمی کو اپنی صلاحیتوں پر پورا یقین ہوتا ہے۔ جب ایک شخص امیری کا سفر شروع کرتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ میرے اندر یہ صلاحیتیں ہیں اور میں ان صلاحیتوں کی وجہ سے امیر ہو جاؤں گا۔ اب سوال ہے کہ صلاحیتوں پر یقین کیسے آئے؟ اس کا بہت آسان جواب ہے کہ جب آپ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کریں گے تو یقین آئے گا۔ جو زیادہ محنت کرنے والے ہوتے ہیں، انھیں اپنی صلاحیتوں کا پتا چل جاتا ہے۔ وہ اپنے پر پھیلاتے ہیں تو انھیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُن کے کتنے پر ہیں۔ ایڈیسن کہتا ہے، اگر انسان کو اپنی صلاحیتوں کا پتا چل جائے تو وہ غلامی برداشت نہیں کرسکتا۔

اپنی صلاحیتوں پر یقین کی پہلی نشانی یہ ہے کہ آپ نوکری نہیں کرسکیں گے۔ آپ اپنا کاروبار کریں گے۔ نوکری کرنے والا درحقیقت اپنی صلاحیتوں کو کسی اور کو فروخت کررہا ہوتا ہے۔ اور کامیاب ہونے والا اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ کامیاب آدمی اپنی صلاحیتوں کو جانتا ہے۔

ناکام ہونا مسئلہ نہیں ہے۔ صلاحیت پر یقین نہ ہونا بہت بڑا مسئلہ ہے۔

انسان ''عادت'' والی مخلوق ہے۔ اگر آپ کی عادات مالکوں والی ہیں تو پھر آپ کل مالک بن جائیں گے۔ اگر عادتیں ملازموں والی ہیں تو پھر آپ ملازم بن جائیں گے۔ مثال کے طور پر، کسی نے آپ کو دو روپے دیئے۔ بدلے میں آپ نے دو روپے کا کاروبار کرلیا۔ اگر آپ نے دو روپے سے کم کا کاربار کر کے دیا تو پھر یہ مالکوں والی عادت ہی نہیں ہے۔ مالک والی عادت یہ ہوتی ہے کہ دو روپے کے بدلے میں دو روپے سے زیادہ کا کام کر کے دیا جائے۔ انسان اچھا تب کرتا ہے کہ جب اس کی سوچ مالکوں والی ہوتی ہے۔ جو لوگ ملازم ہوتے ہیں، زیادہ تر کی سوچ بھی ملازموں والی ہو جاتی ہے۔ آپ اس وقت ملازمت کررہے ہیں یا نہیں، اگر آپ مالک بننا چاہتے ہیں، امیر بننا چاہتے ہیں تو مالکوں والی عادات اختیار کیجیے، امیروں کی عادات اختیار کیجیے۔

ہر امیر ہونے والے شخص کو توقع ہوتی ہے کہ وہ امیر ہو جائے گا اور یہ توقع یقین کی حد تک ہوتی ہے۔ حدیث شریف ہے کہ ''اللہ تعالیٰ سے تم جیسا گمان کرتے ہو، اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہے۔'' جب آپ گمان اچھا کرتے ہیں تو آپ سے جو شعاعیں نکلتی ہیں، وہ کائنات میں جاتی ہیں اور بدلے میں ویسی ہی اچھی شعاعیں آپ کی طرف آتی ہیں۔ اگر آپ برا گمان کرتے ہیں تو بدلے میں ویسی ہی بری شعاعیں آپ کی طرف آتی ہیں۔ یہ قدرت کا قانون ہے، جسے آج سائنس ''لا آف اٹریکشن'' کہتی ہے۔ مستقبل پر یقین دراصل خدا کی رحمت پر یقین ہے۔ جو لوگ خودکشی کرتے ہیں، انھیں اپنا

مستقبل نظر نہیں آ رہا ہوتا۔ جو خواہشیں آپ کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں، یہ کائنات میں حسن پیدا کر رہی ہیں۔ انسان کی تمنا اس کو جینے پر مجبور کرتی ہے۔ خواہشیں جینے پر مجبور کرتی ہیں۔ خواب جینے پر اکساتے ہیں۔ اچھے مستقبل کا یقین خدا کی رحمت پر یقین کے مترادف ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی ناامید نہ ہو۔

3) اپنے آپ سے وعدہ

دنیا کے تمام امیر ہونے والے اپنے آپ سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ مجھے امیر ہونا ہے، مجھے کامیاب ہونا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا وعدہ اپنے ساتھ ہوتا ہے یا پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب انسان اپنے ساتھ وعدہ کرتا ہے اور وعدہ خلافی نہیں کرتا تو اللہ اسے اس وعدے کے مطابق نتیجہ دیتا ہے۔ وعدہ کی خلاف ورزی نہ کرنا، وعدہ کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اگر وعدے کے مطابق عمل نہیں کیا گیا تو یہ محض خواہش ہے۔

غریب انسان اپنے آپ سے وعدہ نہیں کر پاتا۔ وہ صرف خواہش رکھتا ہے کہ میں بھی امیر ہو جاؤں۔ لیکن، صرف خواہشوں سے امیر نہیں ہوا جاتا۔ ہر وہ شخص حقیقتاً ترقی کرنا چاہتا ہے جو واقعی اپنے آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ مجھے کچھ بننا ہے، کچھ کر کے دکھانا ہے۔ پھر اپنے ساتھ کیا ہوا وعدہ اسے دوڑاتا ہے۔

اگر وعدہ نہیں ہوگا تو پھر آپ پیچھے ہو جائیں گے۔ سچے وعدے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہوتی ہے کہ کائنات کی پوشیدہ قوتیں بھی مدد کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ غائب سے مدد آنے لگتی ہے۔ یہ وعدے کی قوت ہے کہ آپ کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتیں بھی جاگتی ہیں اور ساتھ ہی کائنات بھی آپ کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ حضرت اقبال کا کیا ہی خوبصورت شعر ہے کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے وعدے کا، آپ کے سچا ہونے کا معیار اتنا ہو کہ خدا بھی کہے کہ میرے بندے تیری اتنی محنت ہے، اب بتا تو کیا چاہتا ہے۔

4) بچت کی عادت

ہر ترقی کرنے والے انسان کو بچت کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ پیسہ بچا کر رکھتا ہے۔ کئی لوگ جو کماتے ہیں، وہ سب کھا جاتے ہیں۔ بچت کی عادت بچپن سے پیدا کرنی چاہیے۔ ماؤں کو چاہیے کہ بچوں کو شروع سے بچت کی عادت ڈالیں۔ آپ اپنی کمائی میں سے بیس فیصد بچانا شروع کریں۔ وہ مستقبل میں آپ کے کام آئے گا۔ ہر کامیاب ہونے والا آدمی صحیح وقت پر بہت محنت کرتا ہے اور بعد میں زندگی سے لطف اٹھاتا ہے۔ جو جتنا کماتا ہے، اتنا ہی خرچ کرتا ہے تو وہ سفید پوش ہے۔ جو جتنا کماتا ہے، اس کے خرچے پورے نہیں ہو رہے ہوتے، وہ غریب ہے۔ جو جتنا کماتا ہے اور اس میں سے کچھ بچاتا ہے، وہ خوشحال ہے۔ اور جو جتنا کماتا ہے اور بہت سا بچ جاتا ہے، تھوڑا استعمال ہوتا ہے، وہ امیر ہے۔

5) پیسے سے پیسہ بنانا

پیسے سے پیسہ بنانا ایک مکمل فن ہے۔ امیر لوگوں کو پیسے سے پیسہ بنانا آتا ہے۔ وہ کاروبار میں پیسہ لگاتے ہیں اور پیسہ کماتے ہیں۔ فرض کیجیے، آپ کا جینز کا کاروبار ہے۔ پاکستان یہ جینز آپ کو چار سو روپے میں پڑتی ہے۔ اگر یہی جینز ترکی کو بیچیں تو ترکی والے یہی جینز 4800 روپے میں خریدیں گے۔ فرق کیا نکلا؟ 4400 روپے۔ چھ سو روپے آپ کے مختلف اخراجات ہیں، مثلاً کسٹم، پیکنگ وغیرہ۔ باقی آپ کی بچت ہوگئی 3800 روپے۔

اگر آپ کے پاس دس ہزار پینٹ کا آرڈر آئے تو آپ کو تین کروڑ اسی لاکھ کا فائدہ ہوگا۔ یہ آپ نے صرف ایک ہلے میں کما لیا۔ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

کاروبار میں 9 حصے ہیں، ملازمت میں ایک حصہ ہے۔ کاروبار میں آپ معاشی استحکام حاصل کر لیتے ہیں۔

یاد رکھیے، ہم اپنے حالات نہیں بدل سکتے مگر اپنے خیالات بدل سکتے ہیں اور خیال بدلنا مشکل نہیں ہے۔ آج ہی اپنے خیالات پہ کام کرنا شروع کیجیے...بغیر سیکھے؟ جی نہیں! کوئی بھی کام بغیر سیکھے نہیں کیا جا سکتا۔ جینا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ زندگی گزارنے کا فن سیکھے بغیر یہ زندگی اندھیرا ہے۔ زندگی میں اجالا آتا ہی تب ہے کہ جب ہم زندگی گزارنا سیکھتے ہیں۔ اور یہ فن ابھی سے سیکھنا شروع کر دیں گے تو اگلے دس سال میں زندگی کمال ہو جائے گی۔

6) نئے نئے مواقع تلاش کرنا

امیر ہونے والے لوگ نئے نئے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور نئے مواقع لوگوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ انسان کی خوش قسمتی بھی کسی کے ساتھ جڑی ہوتی ہے اور انسان کی بدقسمتی بھی کسی کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''تمہاری تقدیر وہ نہیں ہے جو تمہارے ہاتھ پر لکھی ہے۔ یہ آدھی تقدیر ہے۔ آدھی تقدیر اس کے ہاتھ پہ لکھی ہوتی ہے جس سے تم ہاتھ ملاتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ راضی ہو تو وہ آپ کو اچھے لوگوں سے ملانا شروع کر دیتا ہے۔ آپ کو اچھے لوگوں کی تلاش دے دیتا ہے۔ آپ کے اندر اچھی طلب آ جاتی ہے۔ جو اچھا آدمی آپ کو ملتا ہے، اس کے ہاتھ میں آدھی تقدیر لکھی ہوتی ہے۔ آپ اس سے ہاتھ ملاتے ہیں اور وہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔ آپ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں، اگر یہ آدمی میری زندگی میں نہ آیا ہوتا تو آج میں یہاں نہ ہوتا۔ اسی طرح، ناکام آدمی کی ناکامی میں کسی فرد کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ بھی یہی کہے گا کہ اگر میری زندگی میں یہ فرد نہ آتا تو آج میں یہاں نہ ہوتا۔ البتہ یہ اس ناکام آدمی کا قصور ہے کہ اس نے فرد کا انتخاب کرتے

وقت کامیاب اور اچھے فرد کا انتخاب کیوں نہ کیا۔

7) اچھے لوگوں سے تعلق

امیر لوگ اپنی دوستیاں بھی امیروں سے کرتے ہیں۔ انسان پر جتنا اثر دوسرے کی سوچ کا ہوتا ہے، اتنا کتاب کا بھی نہیں ہوتا۔ جب آدمی منفی سوچ رکھنے والوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے تو وہ اپنی صفات کھو بیٹھتا ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں جو آگے بڑھنے والے ہیں، جن کے واضح مقاصد ہیں۔ ان لوگوں سے آپ کو شعاعیں ملیں گی جو آپ کے آگے بڑھنے میں معاون ہوں گی۔ بعض لوگوں سے ملیں تو پتا چلتا ہے کہ ان میں جوش بہت کم ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''نیک روحیں محفل میں لطافت پیدا کرتی ہیں، کثیف روحیں محفل میں کثافت پیدا کرتی ہیں۔''

بندہ نیک ہو تو دوسروں پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ بندہ برا ہو تو دوسروں پر برا اثر پڑتا ہے۔ اچھے آدمی کی نشانی یہ ہے کہ اگر اس کے پاس کوئی مسئلہ لے کر جائیں تو وہ آپ کا مسئلہ حل نہیں کرے گا، لیکن آپ کو ہلکا پھلکا کر دے گا۔ آپ کو درست رہنمائی فراہم کرے گا۔ آپ کو مسئلہ حل کرنے کیلئے تیار کر دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے جو شعاعیں اس سے ملتی ہیں اس سے آپ مسئلے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس لیے دوستیاں ان لوگوں کے ساتھ کیجیے جو بہتر ہیں اور جن کے مقاصد زندگی بہت واضح ہیں۔

8) ذمے داریوں کو قبول کرنا

دنیا کے تمام امیر ہونے والوں کی بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ ذمے داری قبول کرتے ہیں۔ جب آپ یہ ذمے داری قبول کرتے ہیں کہ میں اس نتیجے کا خود ذمہ دار ہوں تو پھر آپ اپنی مرضی کے نتائج تخلیق کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

ذمے داری کا مطلب اپنی غلطیوں کو تسلیم کر کے اپنی اصلاح کرنا ہے۔ اگر ایک شخص آج ناکام ہے اور ایک عرصہ گزرنے کے بعد اسے کامیابی مل گئی تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ اس نے ناکامی اور کامیابی کے درمیان کیا ایسا کیا تھا کہ وہ کامیاب بن گیا۔ جب ہم اس کی کامیابی کی وجہ دریافت کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ آدمی ذمے دار ہو چکا ہے۔ ذمے داری قبول کرنے کا مطلب ہے کہ جو کچھ اس وقت آپ کے ساتھ ہو رہا ہے، اس کی اصل وجہ آپ خود ہیں۔

اس کے برخلاف، ہر غریب انسان کی یہ سوچ ہوتی ہے کہ میری ناکامی کے ذمے دار میرے گھر والے، معاشرہ یا میرے حالات ہیں۔ یہ سارے جملے اس کی غیر ذمے داری کو ظاہر کرتے ہیں۔ آپ نے اکثر کو کہتے سنا ہوگا کہ اگر میرے والدین میرے ساتھ ایسا نہ کرتے تو کیا ہی اچھا ہوتا؛ اگر فلاں پارٹی حکومت میں آ گئی تو میرے معاشی مسائل حل ہو جائیں گے؛ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں بہت کچھ کر جاتا۔ یہ غیر ذمے دارانہ مزاج کے عکاس جملے ہیں۔

جو آدمی اپنی حالت کی ذمے داری خود قبول نہیں کر سکتا، وہ اپنی اصلاح کبھی نہیں کر سکتا۔ ذمے داری قبول کرنے کی پہلی نشانی یہ ہے کہ مجھے آگے جانے کی ضرورت ہے اور آگے بڑھنے کی سب سے بڑی ذمے داری میری اپنی ہے۔

جب آپ خود اپنے آپ کو کٹہرے میں کھڑا کرتے ہیں تو آپ میں بہتری آنا شروع ہو جاتی ہے۔ جیم رَون کہتا ہے کہ ”آدمی بڑا مقصد تو حاصل کر لیتا ہے، لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے آپ جو جدوجہد کرتے ہیں، وہ اس مقصد سے بھی اہم ہوتی ہے۔“ مثال کے طور پر، ایک شخص ایک کروڑ روپیہ کماتا ہے۔ اگر اس کا ایک کروڑ روپیہ کھو گیا تو اتنا نقصان نہیں ہے، جتنا اس شخص کے چلے جانے سے ہوگا، کیونکہ اس شخص کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ وہ ایک کروڑ کما سکتا ہے۔ کروڑ کمانے میں اس نے جو سیکھا، وہ کروڑ روپے سے

زیادہ اہم ہے۔ اُردو کا مشہور محاورہ ہے، ''یہ منہ اور مسور کی دال''، اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ کرنے والے ہوتے ہیں، ان کے انداز اور اطوار ہی کچھ اور طرح کے ہوتے ہیں۔

معاوضے سے زیادہ کام

دنیا میں جتنے لوگ ترقی کر جاتے ہیں، ان میں ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے تفویض شدہ کام سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طالب علم اس راز کو جاننے کیلئے ایک جوس والے کے پاس گئے۔ وہ جوس والا دن میں ہزاروں روپے کماتا تھا۔ انہوں نے جوس والے سے چند سوالات کیے:

سوال: آپ اتنی سیل کیسے کر لیتے ہیں؟

جواب: گلاس کے ساتھ چھوٹا گلاس مفت ہے۔

سوال: یہ تو ہم اپنی کتابوں میں پڑھ رہے ہیں کہ ہمیشہ احسان کرو، کچھ زیادہ دو۔ آپ کو کیسے پتا چلا؟

جواب: چالیس برس پہلے میں چھابڑی پر کینو بیچا کرتا تھا اور ایک درجن میں تیرہ کینو دیتا تھا۔ کسی نے کہا کہ درجن تو بارہ ہوتے ہیں۔ میں جواب دیتا، میرے تیرہ ہوتے ہیں۔

جو آدمی تیرہ کینو نہیں دے سکتا، وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا کہ رات کو ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ پیسے کیسے لے کر جاتے ہیں۔

گنگا رام کہا کرتا تھا کہ جس نے بھی قدرت سے بیوپار کیا، وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔ اپنے آپ سے سوال کیا کیجیے کہ میرے ملک نے مجھے کیا دیا اور میں نے اپنے ملک کو کیا دیا؟ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''دنیا میں جس کے آنے سے فرق پڑتا ہے، اس کے جانے سے بھی فرق پڑتا ہے۔'' اگر آپ کے جانے سے دنیا کو پتا چلے تو پھر آپ بڑے انسان ہیں، درویش ہیں، پھر آپ اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کے قابل ہیں۔''

سیتھ گورڈن اس وقت دنیا میں مارکیٹنگ اور تعلیم کے حوالے سے بہت بڑا تھینک ٹینک ہے۔ وہ کہتا ہے، ''دنیا میں قدرت اس شخص پر ترقی لازم کر دیتی ہے جو اپنا بہترین مفت میں دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔''

ویڈیو اور لائیو لیکچر میں فرق ہوتا ہے۔ جب آپ لائیو لیکچر لیتے ہیں یا آمنے سامنے ہوتے ہیں تو آپ جس مقام پر جاتے ہیں یا ٹریز لے کر جانا چاہتا ہے، اسے ''مقام یقین'' کہا جاتا ہے۔ مقام یقین علم کے مقام سے اگلا مقام ہے، یعنی جو میں جانتا ہوں اس پر میرا یقین کتنا ہے، کیونکہ اس یقین کے بعد اگلا قدم عمل کا آتا ہے۔ دنیا میں بے شمار لوگ جاننے کے مقام پر کھڑے ہوتے ہیں، مگر وہ یقین کے مقام پر نہیں ہوتے۔ انھیں یقین نہیں ہوتا۔ لوگ اپنی نیکیوں پر شک میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے۔ بابا جی اشفاق احمد فرمایا کرتے تھے کہ ''عین ممکن ہے کہ وائی بی جی کرنے والا ہو سکتا ہے بابا ہو۔'' بہت سادہ لوگوں میں یقین ہوتا ہے۔ وہ اپنے یقین اور ایمان پر مر مٹیں گے۔ اس نقطے سے آغاز کیجیے کہ اس چھوٹے سے قدم کو جس سے آپ اپنا سفر شروع کر رہے ہیں، چھوٹا نہیں ہے۔

معیار بہتر کیجیے

آپ کام کرنا شروع کیجیے۔ بے شک آپ لائق ہیں یا نالائق ہیں، لیکن کام کے ساتھ ساتھ آپ اپنے معیار کو بہتر بناتے جائیے۔ اگر آپ اپنے معیار کو بہتر نہیں کرتے، یعنی آپ لائق انسان نہیں بنتے تو پھر آپ کا حلقہ احباب بہت کم رہے گا۔ اگر ایک شخص اسکول ٹیچر بنتا ہے اور جب اسکول جا کر دیکھتا ہے کہ وہاں تو در و دیوار نہیں ہیں، وہ درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ زندگی کے تیس سال وہ ایک گاؤں کے بچوں کو ایک درخت کے نیچے پڑھاتے پڑھاتے ایک دن فوت ہو جاتا ہے۔ کتنا بڑا انسان ہے!

نہیں... یہ کہانی بہت چھوٹی ہے۔ ایک اور شخص ہے جس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ

اپنی ہر چیز بیچ کر علی گڑھ یونیورسٹی بنا دیتا ہے۔ یہ بہت بڑی کہانی ہے۔

جس کا کینوس بڑا ہوگا، وہ اپنے اثرات زیادہ چھوڑے گا؛ جس کا کینوس چھوٹا ہوگا، اس کا حلقہ چھوٹا ہوگا۔ آپ اپنی خدمات کا معیار ابھی سے بہتر کرنا شروع کر دیجیے۔ یہ اس لیے کہ کہیں بعد میں جا کر حوصلہ نہ رہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ میں امیر ہو کر بانٹوں گا۔ جب وہ امیر ہوتا ہے تو حوصلہ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ آپ بچپن سے مثبت مزاج بنائیے۔ جوانی کی عمر سے اپنے اندر پودا لگائیے۔ اس بات کی پروانہ کیجیے کہ آپ کی عمر ابھی کیا ہے۔ بس، آج سے شروع کر دیجیے۔

اگر آپ ابھی سے کام شروع کر گئے تو دس سال بعد آپ کہیں گے کہ قاسم صاحب، ہمیں پتا ہی نہیں لگا کہ ہوا کیا ہے۔ لیکن سب کچھ ہی ہو گیا۔ اس آدمی کا شکریہ ادا کیجیے جس نے آپ کو زیرو سے ہیرو بنا دیا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ آپ کی سوچ اتنی پست ہو کہ شکریہ کے الفاظ بھی نہ ہوں، آپ کے پاس فاتحہ بھی نہ ہو، ایک عرضی بھی نہ ہو کہ مالک یہ وہ بندہ ہے جو نہیں تھا، پھر بھی تھا۔ تیرا کتنا انعام تھا کہ اس کی سوچ کو تو نے اتنی قوت دی کہ ایک زمانے کو فائدہ دے رہا ہے۔

جب آپ واضح ہوتے ہیں تو پھر آپ جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب آپ واضح ہی نہیں ہوتے تو پھر آپ کنفیوز جواب دیتے ہیں۔ آپ لڑ پڑتے ہیں۔ اپنی خدمات ابھی سے دینی شروع کیجیے اور معیار بہتر کرتے جائیے۔ ایک وقت وہ آئے گا کہ آپ جیسا کوئی نہیں ہوگا۔ آپ مثال ہوں گے۔

پیدائشی قدرتی صلاحیتیں

ایک تحقیق کے مطابق شخصیت کی تیرہ اقسام ہیں۔ یہ تمام اقسام پروفیشن کے حوالے سے ہیں۔ آپ کبھی ایڈیسن کی زندگی کو پڑھیں، بچپن سے ہی اس کے اندر جذبہ اور جنون

بہت زیادہ تھا۔ اس کی ماں کیلئے سب سے بڑا یہ مسئلہ تھا کہ ایڈیسن کو گھر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کئی دفعہ اس کو اکیلا چھوڑا تو وہ مرغیوں کے ڈربے میں جا کر انڈوں پر بیٹھ کر یہ تجربہ کرنے لگتا تھا کہ اگر مرغی کے انڈوں پر بیٹھنے سے چوزے نکل آتے ہیں تو پھر ایڈیسن کے بیٹھنے سے کیا نکلے گا۔

جو صلاحیت، جو جذبہ، جو جنون قدرت نے آپ کے اندر ڈالا ہے، اگر اسے کھنگالا اور دریافت نہ کیا جائے تو وہ ایک چبھن بن جاتا ہے۔ جذبے اور جنون کے سامنے رکاوٹیں نہیں آسکتیں۔ صلاحیتیں کبھی تنقید کو نہیں مانتیں۔ اور اگر آپ اپنے ساتھ سچے ہیں تو یقین کیجیے کہ آپ اتنے بہادر ہوں گے کہ آپ کہہ دیں گے کہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے، مجھے تو وہ کام کرنا ہی ہے جو میں کرنا چاہتا ہوں۔ اصل کام ہے، اس کام کو دریافت کرنا۔

ہم میں سے اکثر کو خاصی عمر گزارنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ میں جو کام کر رہا ہوں، وہ کام تو میرا ہے ہی نہیں۔ چنانچہ ہم بددلی سے کام کرتے ہیں۔ جو کام آپ کرتے ہیں، اگر اسے دل لگی اور دلچسپی سے نہیں کر پا رہے تو اسے چھوڑ دینا ہی آپ کیلئے بہتر ہے۔ لیکن یہ بددلی والا کام چھوڑ کر وہ کام ضرور کیجیے کہ جس میں پھر کوئی آپ جیسا دوسرا نہ ہو۔

قیصر عباس صاحب کہتے ہیں، ہمارے نوجوانوں میں دو بیماریاں ہیں جنھوں نے ان کا ستیاناس کر دیا ہے۔ ایک ناامیدی، دوسرا ویژن کے ساتھ اپنی زندگی کی منصوبہ بندی نہ کرنا۔ نوجوان یہ پلاننگ نہیں کرتے کہ آج ہم یہاں ہیں تو دس سال بعد مجھے کہاں ہونا ہے۔ وہ کہتے ہیں، بس یہ مہینہ گزر جائے، پھر دیکھا جائے گا۔ گزارے والی سوچ کبھی بڑے انسان کی سوچ نہیں ہوتی۔ خوش قسمت انسان وہ ہے جو اپنی آسانیاں، اپنی کمائی سے دوسروں کو دے سکے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔'' آپ ہر شعبے میں اوپر والا ہاتھ بن جائیے۔ اگر یہ کر گئے تو دیں گے، لیکن یہ نہیں ہوا تو کہاں سے دو گے؟ جب آپ کے پاس کچھ نہیں ہوگا

تو آپ دوسروں کو کیسے دیں گے؟

اپنا کاروبار

جب بھی کوئی ملک مشکل حالات سے گزر رہا ہوتا ہے تو اس کا ہر شعبہ مشکل حالات میں ہوتا ہے۔آج ہمارا ملک دہشت گردی کی جنگ کا سامنا کر رہا ہے، معاشی مشکلات کا سامنا کر رہا ہے۔اسی طرح، اور بہت سے دوسرے معاملات میں مشکلات کا سامنا کر رہا ہے۔ جب ایسی صورتِ حال ہوتی ہے تو پھر ملک میں نوکریاں ملنی کم ہو جاتی ہیں۔ہمارے ملک میں بے شمار ادارے ایسے ہیں جو دوسرے ملکوں سے خدمات لیتے ہیں، کیونکہ اس شعبے کے متعلق انھیں یہاں سے افرادِ کار ہی نہیں ملتے۔باوجود اس کے کہ ہمارے ملک میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں، کام کرنے والوں کا قحط ہے۔ اس کی ایک ہی وجہ نظر آتی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کے پاس سمت نہیں ہے۔اسی کی دہائی میں گریجویشن یا ماسٹر کرنے کے بعد جب طالب علم مارکیٹ میں جاتا تھا تو اسے چار چار نوکریاں ملتی تھیں، جبکہ آج ایسا نہیں ہے۔آج جو جہاں لگا ہوا ہے، وہ کام بھی کر رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ رو بھی رہا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کی نوکری وہ چاہ رہا تھا، اس طرح کی ملازمت ملی نہیں۔

کچھ لوگ ذہین ہوتے ہیں وہ ان باتوں کو بہت جلد سمجھ جاتے ہیں۔ پھر وہ نوکری کرنے کا نہیں سوچتے، بلکہ نوکریاں دینے کے بارے میں سوچتے ہیں۔اگر آپ کا کام آپ کو فرسٹریشن دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے، آپ نے غلط کام کا انتخاب کیا ہے۔صحیح کام، صحیح فرد...اچھی قسمت، صحیح کام، غلط فرد... بری قسمت۔زندگی میں صحیح فرد کا صحیح جگہ پر ہونا ہی کامیابی ہے۔اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہادر بنایا ہے، آپ میں قوتِ ارادی ہے اور آپ میں اضطراب ہے تو پھر آپ اپنے آپ کو نوکری تک محدود نہ کیجیے۔بڑا سوچیے۔

ایک ہے، غلامی؛ اور ایک ہے، آزادی۔جو آدمی آزادی چاہتا ہے، وہ کہے گا کہ میں

بڑی نوکری کی بجائے اپنا چھوٹا سا کام کیوں نہ کروں، کیونکہ یہ میری ملکیت ہوگی۔ میں اپنے آپ کو جواب دہ ہوں گا، کسی دوسرے کو نہیں ہوں گا۔

دنیا کے ہر کاروبار میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے... اور وہ ہے، کامیابی کی کہانی۔ یہ آپ پر ہے کہ آپ دورانِ تعلیم یہ طے کرتے ہیں کہ مجھے کہانی بننا ہے یا نوکری کرنی ہے۔

یہ بھی سمجھ لیجیے کہ کامیاب کاروبار کیلئے اعلیٰ تعلیم ضروری نہیں ہے۔ دنیا میں نوے فیصد کاروباری حضرات نے کبھی کاروبار کو پڑھا ہی نہیں تھا، پھر بھی وہ کامیاب ہوگئے۔ کاروبار میں کامیابی کیلئے جو مہارتیں درکار ہیں، وہ تعلیمی اداروں میں فراہم نہیں کی جاتیں۔ تعلیمی اداروں میں جو اساتذہ کرام کاروبار کے متعلق مضامین پڑھاتے ہیں، انھوں نے خود کبھی کاروبار نہیں کیا ہوتا تو پھر طالب علم اس کو کیسے پڑھ کر کاروبار کرے گا۔

تو پھر، کاروبار کیلئے کیا ضروری ہے؟

سب سے پہلی چیز... آپ کے اندر ایک بے چینی اور بے تابی ہو کہ مجھے نوکری نہیں کرنی۔ مجھے اپنا کام کرنا ہے۔ یہ اگر نہیں ہے تو پھر آپ لاکھ کاروبار کے متعلق مضامین پڑھ لیں، آپ کاروبار نہیں کرسکیں گے۔ جو آدمی طبیعت کا بادشاہ ہے، وہ نوکری نہیں کرسکتا۔ بہت سے لوگ طبیعت کے لحاظ سے بادشاہ ہوتے ہیں، مگر انھیں اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ انھوں نے فقیروں والا لبادہ اوڑھ رکھا ہوتا ہے۔ انھیں اپنی قابلیت کا پتا نہیں ہوتا۔ ایڈیسن کہتا ہے کہ ”اگر انسان کو اپنی قابلیت کا پتا ہو تو وہ غلامی برداشت نہیں کرسکتا۔“ اور غلامی کا نام ہے، نوکری!

جب آپ کبھی زندگی کے متعلق باتیں سن رہے ہوتے ہیں تو اسی لمحے کوئی بات دل میں بیٹھ جاتی ہے اور زندگی کا رُخ مڑ جاتا ہے۔ آپ اپنے اندر قوتِ ارادی پیدا کیجیے کہ مجھے نوکری کرنی نہیں ہے، نوکریاں دینی ہیں۔ اور اس کیلئے ایک کامیاب مالک بننا ہے۔ جو کوئی آگے جانے کا سوچتا ہے، اگر وہ محنتی ہے اور اُس میں قوت ارادی ہے تو پھر اس کیلئے قدرت بھی راستے بنانا شروع کردیتی ہے۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مفہوم ہے کہ ”رزق کے

نو حصے کاروبار میں ہیں۔"

اس نقطے پر غور کیجیے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ یہ اپروچ تب ہی ہوگی کہ جب آپ اوپر والا ہاتھ بننے کی کوشش کریں گے۔ اگر آپ کے پاس اوپر والا ہاتھ ہے تو آپ اس سے بہتر ہیں جس کا ہاتھ نیچے ہے۔

دنیا میں جتنے بھی کامیاب کاروباری لوگ ہیں، ان میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے۔ یہ لوگ پیسے کیلئے نہیں کام کرتے۔ یہ آزادی کیلئے کام کرتے ہیں۔ آگے بڑھنے میں تعلیم بہت بڑی معاونت ہے، لیکن تعلیم بسا اوقات آگے بڑھنے کے حوالے سے رکاوٹ بن جاتی ہے۔ وہ سوچ کو چھوٹا کر دیتی ہے۔ ہم صرف وہی سنتے، دیکھتے اور سمجھتے ہیں جو دیکھنا، سننا اور سمجھنا ہمارا نصاب سکھاتا ہے۔ ہم وہی چاہتے ہیں، جو ہمیں پڑھایا جاتا ہے۔

کاروبار کرنا چاہتے ہیں اور آپ کے پاس اس کا تجربہ اور معلومات نہیں تو ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ کاروباری لوگوں سے ملیں۔ جب آپ کا رابطہ کاروباری حضرات سے ہوگا تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ ہم نے بھی کبھی اپنا آغاز زیرو سے کیا تو آپ کا ذہن کھلے گا۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں، "جب کبھی بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنا ہے تو تھوڑا نہیں مانگنا، کیونکہ ہماری اوقات تھوڑی ہوسکتی ہے، اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بڑی ہے۔" ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی سوچ کو تالا لگا دیتے ہیں کہ ہمیں کیسے مل سکتا ہے۔ اس لیے ہم مانگتے ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اُس ذات پر یقین نہیں ہوتا۔

معاشی آسانی کے بعد اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھ اور عقل بھی دے دے تو پھر آپ خوش قسمت ترین انسان ہیں۔ اگر آپ امیر ہونے کے باوجود عقل و خرد والے ہیں تو پھر زمانہ آپ کے پیچھے چلے گا۔ بڑا کام یہ ہے کہ تھوڑا ہو، مگر اپنا ہو۔ آپ مارکیٹ میں جائیں اور وہاں جا کر سروے کیجیے اور دیکھئے کہ کہاں کہاں خلا ہے۔ کام تو سب کو کرنا ہے تو بہتر ہے کہ آپ اپنے لیے کریں۔ باکسر محمد علی کلے مرحوم نے اپنے حریف کو ایک مکا مارا اور مقابلہ جیت گیا۔ اس

زمانے میں اسے پچاس ہزار ڈالر انعام ملا۔ ایک صحافی نے اس سے پوچھا، آپ نے کیا زبردست سودا کیا کہ صرف ایک مکے کے بدلے پچاس ہزار ڈالر؟ کلے نے جواب دیا، ”یہ ایک پنچ (مکا) کو بنانے کیلئے مجھے اکیس سال پریکٹس کرنی پڑی ہے۔“ اگر آپ کا ذہن صرف نوکری کے بارے میں ہی سوچ رہا ہے تو پھر آپ لاکھ لیکچر لے لیں، کتابیں پڑھ لیں، اس کا کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ کی سوچ یہ ہے کہ مجھے اپنا کام کرنا ہے تو پھر یقین کیجیے، آنے والا زمانہ آپ کا ہوگا۔

گھریلو مسائل

''کسی قوم کی بقا کا انحصار اس بات پر ہے کہ گھر میں کتنا وقار ہے!''

کنفیوشس

برصغیر میں کئی طرح کے کلچر پائے جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے اسلام تو قبول کرلیا، لیکن یہاں جو ہزاروں سال سے کلچر چلا آ رہا تھا، اسے اپنے اندر سے نہیں نکالا۔ یہ کلچر اسلامی کلچر نہیں، اس لیے کئی طرح کی سماجی برائیاں پیدا کرتا ہے۔ پھر یہ برائیاں کئی طرح کے مسائل کو جنم دیتی ہیں۔ ان مسائل میں گھریلو مسائل سب سے اہم ہیں۔

گھریلو مسائل میں بھی اہم ترین شادی کا مسئلہ ہے۔ چونکہ یہاں کے باسیوں میں سے ہندوانہ مزاج ختم نہیں ہوا، لہٰذا آج بھی جو شادیاں کی جاتی ہیں، ان میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس رشتے میں بچوں کی رضامندی کتنی ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ بچوں میں ذہنی مطابقت کتنی ہے۔ یہ نہیں پرکھا جاتا کہ عمر میں کتنا فرق موزوں ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان کی آپس میں شادی چلے گی بھی یا نہیں۔

معیار، متعین نہیں

کلچر اور اسٹینڈرڈز کی بنیاد پر رشتے ہوتے ہیں۔ مرد کو ایک طرف ماں کھینچ رہی ہوتی ہے جبکہ دوسری طرف بیوی۔ وہ سمجھ نہیں پاتا کہ میں کس کی بات مانوں اور کس کی نہ مانوں۔ ماں کے احترام میں سرنگوں کروں تو بیوی کوستی ہے اور بیوی کی سنوں تو ماں کی حکم عدولی ہوتی ہے۔ اسی کنفیوژن کی وجہ سے گھریلو مسائل جنم لیتے ہیں۔

اسلام میں بلوغت کے بعد شادی کی اجازت ہے اور ہر بالغ شخص... لڑکا بھی، لڑکی بھی... یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ انھیں کہاں شادی کرنی ہے۔ اس کو اتنی سمجھ بوجھ ہونی چاہیے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ والدین یہ زیادتی کرتے ہیں کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت اس انداز سے نہیں کرتے کہ اگر بچے کو شادی کا فیصلہ کرنا پڑے تو وہ صحیح فیصلہ کرنے کے قابل ہو۔ والدین اپنے بچوں کو بچپن سے چھوٹے چھوٹے فیصلے کرنے کی عادت نہیں ڈالتے جس کی وجہ سے جب شادی کا وقت آتا ہے تو پھر وہ بچے یا بچی کو شادی کے فیصلے کا اختیار نہیں دیتے۔ انھیں ڈر ہوتا ہے کہ ان کا بچہ یا بچی درست فیصلہ نہیں کر پائیں گے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ہم ہی فیصلہ کریں گے۔ یہ ہے، ''ارینج میرج''۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ارینج میرج ہونی چاہیے، لیکن مشاورت، پوچھ لینا، سمجھ لینا اور دونوں کی طبیعت کا موازنہ کر لینا بہت ضروری ہے، کیوں کہ اس کے بعد لڑکے اور لڑکی نے تمام زندگی ایک دوسرے کے ساتھ گزارنی ہے۔

زندگی کا سب سے نازک موڑ

زندگی کی چند اہم ترین صلاحیتوں میں ایک صلاحیت ''فیصلہ سازی'' کی صلاحیت ہے۔ اور جب معاملہ پوری زندگی کے فیصلے کا ہو تو یہ صلاحیت انتہائی اہم ہو جاتی ہے۔ شادی کا فیصلہ زندگی کا شاید واحد فیصلہ ہے جس کے اثرات آدمی کی موت تک کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ شادی ہی کا فیصلہ کرتے وقت سب سے کم اس فیصلے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ پھر، اس کا خمیازہ میاں بیوی دونوں تمام زندگی بھگتتے ہیں اور والدین کے جرم کی سزا اُن کی نسلوں کو بھی ملتی ہے۔

مجھے کہاں شادی کرنی چاہیے، کس سے شادی کرنی چاہیے، کیسے شادی کرنی چاہیے، اس سب کا تعلق فیصلہ سازی کی صلاحیت سے ہے۔ جس شخص میں فیصلہ کرنے کی کمی ہوتی

ہے وہ آنے والے وقت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ جس شخص کو یہ شعور نہیں کہ میرا ایک لمحے کا فیصلہ میری تقدیر بدل دے گا، وہ کبھی درست فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یاد رکھیے، فیصلہ ایک لمحے میں ہوتا ہے لیکن اس کا نتیجہ زندگی بھر بھگتنا پڑتا ہے۔

فیصلہ کرنے کے بعد واپس پلٹا نہیں جا سکتا اور نہ شادی بار بار ہو سکتی ہے۔ جب زندگی میں سکون چاہیے، آرام چاہیے اور اس کیلئے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہو جو سکون کا باعث بن سکے تو کیوں نہ اس کیلئے وقت پر سوچا جائے اور درست فیصلہ کیا جائے۔ جس کی شادی ہونے والی ہے، اسے اپنی سمجھ بوجھ نہیں ہوتی اور نہ دوسرے یہ شعور رکھتے ہیں۔ خود کو سمجھے بغیر، اپنے مزاج کو سمجھے بغیر شادی کر لینا یا شادی کا ہو جانا مسائل کو جنم دیتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ گھر تو اچھا چل رہا ہے، لیکن اتنی آمدن نہیں ہے کہ گزارا ہو سکے، اس لیے میاں بیوی دونوں کو مل کر کمانا چاہیے۔ وہ چاہتے ہیں کہ بیوی جاب بھی کرے۔ اس کے برخلاف، بعض کہتے ہیں کہ ایسے پیسوں کا کیا فائدہ کہ جب گھر کو پورا وقت ہی نہیں دینا۔ ایسے لوگوں کو چاہیے تھا کہ شادی سے پہلے سوچتے کہ کس کے ساتھ شادی کرنی چاہیے۔

اقدار اور اہداف

یہ سمجھے بغیر کہ میری اقدار کیا ہیں، اہداف کیا ہیں، میں کیسی نسل چاہتا ہوں، سب نکات کا پتا ہونا بہت ضروری ہے۔ شادی کا مقصد امن اور سکون والا گھر بنانا ہو۔ شادی کا مقصد ایک اچھا خاندان بنانا ہو۔ شادی کا مقصد زندگی میں آسانیاں پیدا کرنا ہو۔ شادی کا مقصد اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنا ہو۔ یہ تمام مقاصد ترجیح میں ہونے چاہئیں جبکہ لوگوں کے مقاصد اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ عموماً شادی کے مقاصد یہ ہوتے ہیں کہ مال ملے گا، جہیز ملے گا، اسٹیٹس بہتر ہوگا، پروفائل بہتر ہو جائے گا۔ جب مقاصد ہی غلط ہوتے ہیں تو ازدواجی زندگی میں اگرچہ یہ چیزیں مل بھی جائیں، سکون اور خوشی نہیں مل

پاتے۔ میاں بیوی کے درمیان بُعد بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ ان کی ترجیح میں سکون تو تھا ہی نہیں۔ جو چیزیں شادی کے ذریعے درکار تھیں، وہ تو مل گئیں۔

مادی اہداف سے کی گئی شادی میں برکت نہیں ہوتی، لیکن اخلاق اور کردار کی بنیاد پر جو شادی کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈال دیتا ہے۔

ذہنی پختگی کا فقدان

گھر کو بہتر طریقے سے چلانے کیلئے ذہنی پختگی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ آج لوگوں میں ذہنی پختگی نہیں رہی اور مزید ختم ہوتی جارہی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ ہمارا تعلیمی نظام ہے جو پختگی پیدا نہیں کرتا۔ دوسری وجہ میڈیا ہے جو شعور کے نام پر بدتہذیبی پھیلا رہا ہے۔ چنانچہ انسانی شخصیت میں جس طرح کی بہتری ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں ہو پاتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ تعلیم یافتہ اور اَن پڑھ دونوں برابر ہیں۔ صرف ڈگری کا فرق ہے۔ اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ میڈیا کیوں کر خاندانی اور ازدواجی نظام کو برباد کررہا ہے تو اسٹیفن آر کوی کی کتاب The 7 Habits of Highly Effective Families ضرور پڑھیے۔

آج انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی وجہ سے بچوں اور والدین کے درمیان خلا پیدا ہوگیا ہے۔ یہ مسئلہ والدین کو سمجھنا چاہیے اور خود انھیں اس خلا کو پُر کرنا چاہیے۔ آج والدین کے پاس بچے کی بات سننے کیلئے وقت نہیں ہے کہ وہ سمجھتے ہیں بچوں کی بات سننا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ خبریں سننا یا ڈراما دیکھنا۔

جب تک بچوں کے ساتھ بولنا، ان کی بات سننا اور ان کو وقت دینا شروع نہیں کریں گے، یہ خلا باقی رہے گا، بلکہ بڑھتا رہے گا۔

محبت یا دشمنی

ہمارے ہاں روایت اور ثقافت کی بنیاد پر تربیت کی جاتی ہے اور اس مماثلت کو محبت کا نام دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا دادا بھی ایسے تھا، اس کا چاچا بھی ایسا تھا، اس کا ماما بھی ایسا تھا۔ یہ مماثلت بچے کی شخصیت کو بہت نقصان پہنچاتی ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، درست ہے۔ نیز، مماثلت کی وجہ سے اس کے یقین بہت محدود ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی اصلاح نہیں کر سکتا۔ انسان کے لاشعور کا اپنا کوئی ذہن نہیں ہوتا۔ وہ صرف یقین کی بنیاد پر چل رہا ہوتا ہے۔ جب وہ دوسروں کے یہ جملے سنتا ہے کہ میرا باپ ضدی تھا تو یہ بھی ضدی بنے گا، اس کا باپ جھوٹ بولتا تھا تو یہ بھی جھوٹ بولے گا، وغیرہ تو ایسے جملے سن سن کر وہ خود کو بھی ایسا ہی بنانے لگتا ہے۔ وہ جھوٹ سن سن کر اس کو سچ سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کی اصلاح ممکن نہیں رہتی۔

وہ محبت جو آنے والے وقت میں نقصان کا باعث بنے، وہ نفرت سے بھی بدتر ہے۔ کسی نے کہا کہ "اگر دشمنی بھی کرنی ہے تو کسی عقلمند سے کرو، کم از کم اس سے سیکھنے کو تو کچھ ملے گا۔" کہاوت مشہور ہے، "نادان دوست سے بہتر دانا دشمن ہے۔" جس محبت کا کوئی مستقبل نہیں، جس کا کوئی نتیجہ نہیں ملنا، وہ محبت خطرناک ہے۔ ایسی محبت جو بچے کو مشکلات سے بچائے، ایسی محبت جو بچے کو پچیس سال کا ہونے کے باوجود بھی پانچ سال کا ہی رہنے دے تو ایسی محبت نقصان دہ ہے۔ ایسی محبت بچے کی گرومنگ نہیں ہونے دیتی۔ ایسی محبت بچے کو ممی ڈیڈی چائلڈ بنا دیتی ہے۔

سختی اور نرمی میں توازن

بچے کی صحیح گرومنگ نہ ہونے کی ایک وجہ نرمی اور سختی کا بے ترتیب ہونا بھی ہے۔ پیار

اور غصے کا تناسب ہونا چاہیے۔ بعض بچوں سے اتنی محبت کی جاتی ہے کہ وہ اس کے بگاڑ کا سبب بن جاتی ہے اور بعض بچوں سے اتنی سختی برتی جاتی ہے کہ وہ بھی بگاڑ کا سبب بن جاتی ہے۔ مار یا پیار، چاہے وہ باپ کی طرف سے ہو یا ماں کی طرف سے، اس میں تناسب ہونا چاہیے۔ بچے پر اس طرح غصہ کرنا چاہیے کہ اس کو غصہ لگے۔ لیکن اس غصے کے پیچھے نیت بچے کی اصلاح ہو۔ اسی طرح، محبت کا بھی طریقہ کار ہونا چاہیے تا کہ بچے کی شخصیت پروان چڑھ سکے۔

ہمارے پاس اسلامی اقدار اور روایات ہیں۔ ہمیں ان اقدار اور روایات کے مطابق بچے کی تربیت کرنے کی ضرورت ہے۔ والدین اپنے بچے کو جس طرح کا دیکھنا چاہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ ان اقدار کے مطابق اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کریں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو بچپن سے سکھائیں۔ انھیں چھوٹے چھوٹے کام دیں۔ انھیں چھوٹی چھوٹی ذمے داریاں دیں اور ان سے ذمے داریوں کے متعلق پوچھیں۔ جب بچہ بچپن میں ذمے دار بنے گا تو پھر وہ بڑا ہو کر بھی ذمے دار ہوگا اور ان کی شخصیت میں پختگی ہوگی۔

تحریک کی ضرورت

جس طرح ہم نے پولیو کے خلاف تحریک چلا کر اسے ختم کیا، اسی طرح ہمیں والدین کو باشعور بنانے کیلئے بھی تحریک چلانی چاہیے۔ والدین کی تربیت کے معاملے پر بھی جلسے جلوس نکلنے چاہئیں اور بینرز پر لکھا ہونا چاہیے کہ ہمیں تعلیم سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہے۔ والدین کو دیکھنا چاہیے کہ اس وقت دنیا میں کس طرح کے معاملات چل رہے ہیں۔ کتنی طرح کے پیشے ہیں، کس طرح کی تعلیم دی جا رہی ہے، کیا کیا نئے علوم سامنے آرہے ہیں، دنیا کہاں جا رہی ہے۔ ان کا یہ علم خود اُن کے بچوں کی تربیت کیلئے بہت فائدہ مند ہوگا۔ ہمیں ایک ایسی نسل تیار کرنے کی ضرورت ہے جو تربیت یافتہ والدین بنے، جو تربیت یافتہ معاشرہ

تشکیل دے سکے۔ اگر ایسی گرومنگ ہوجاتی ہے تو پھر آنے والی نسل کو اچھے والدین مل جائیں گے۔

ماں کا کردار

ماں وہ معلم ہے جو نسلوں کی تربیت کرتی ہے۔ چنانچہ ہمیں ان ماؤں کی تربیت کرنے کی بھی ضرورت ہے جنھوں نے آنے والی نسلوں کی تربیت کرنی ہے۔ ہمیں میڈیا کو بھی شعور دینا ہے، کیونکہ میڈیا کا ایک پروگرام، میڈیا کی ایک خبر، میڈیا کی ایک بات کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ ایس او پیز طے نہ ہونے کے وجہ سے میڈیا نے بہت غلطیاں کیں۔ ایسے پروٹوکولز کی ضرورت ہے جو میڈیا کو ذمے دار بنائیں اور اس کی حدود کا تعین کریں۔ آج میڈیا معلومات اور حقائق تو دے رہا ہے، ساتھ ہی وہ جس منفیت کو پروان چڑھا رہا ہے، اس سے قوم کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔

نوجوانوں میں بگاڑ، خاندانی انتشار کا لازمہ

خاندانی بگاڑ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آج کا معاشرہ نوجوانوں کی ایسی بہت بڑی تعداد پر مشتمل ہے جن کی کوئی سمت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں کوئی گائیڈ نہیں کرتا۔ اس رہ نمائی کی سب سے زیادہ ذمے داری والدین پر عاید ہوتی ہے، لیکن وہ تو خود اس شعور سے نابلد ہیں۔

جن گھروں میں میاں بیوی کی لڑائی رہتی ہے، ان گھروں کے بچے نفسیاتی عارضوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ جن گھروں میں لڑائی جھگڑے رہتے ہیں، میاں بیوی کو چاہیے کہ کم از کم بچوں کے سامنے لڑائی نہ کریں۔ میاں بیوی کی جدائی کی صورت میں اگر بچے ماں کے ساتھ مل جائیں، تب باپ دور ہوجاتا ہے۔ اگر بچے باپ کو مل جائیں تو ماں دور ہوجاتی

ہے۔ دونوں صورتوں میں نقصان بچوں ہی کا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر نوجوان کسی بگاڑ میں مبتلا ہے تو اس نے سب سے پہلے یہ سب کچھ اپنے والدین ہی سے تو سیکھا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کو آپس میں لڑتا ہوا دیکھتا ہے تو سڑکوں پر جھگڑتا ہے، منفی باتیں کرتا ہے، جلد بازی مچاتا ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر طیش میں آجاتا ہے۔ اس کا آسان ترین حل یہ ہے کہ اللہ پر بھروسا کیا جائے اور اپنے بیش تر معاملات کو اس پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن، یہ تبھی ہوگا کہ جب نوجوان نے اپنے گھر میں اپنے باپ اور ماں کو اللہ کا نام لیتے ہوئے اور اللہ پر توکل کرتے ہوئے دیکھا ہو۔ خود والدین نے اپنا مقصد یہ نہیں بنایا کہ اپنی اولاد کو اللہ سے جوڑا جائے۔ پھر بھلا، وہ کیوں کر اس بارے میں غور کر سکتے ہیں۔

والدین کو یہ طے کرنا ہوگا کہ ہمیں اپنی آنے والی نسلوں کی بہتری کی خاطر اپنے آپ کو ٹھیک کرنا ہے۔ یہ ایک مستقل کام ہے اور اس کیلئے ضرورت ہے کہ والدین کی اس معیار پر تربیت کی جائے تا کہ آنے والی نسلیں ان خامیوں سے پاک ہوں۔

حضرت علامہ اقبال کا فلسفہ تعلیم

''چھوڑ یورپ کیلئے رقص بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے بوئے للٰہی''

علامہ اقبالؒ

استاد وہ نہیں ہوتا جو علم دیتا ہے، بلکہ استاد وہ ہوتا ہے جو علم کی پیاس دیتا ہے۔ ایک اچھا استاد کلاس کو بھانپ لیتا ہے کہ اس کو کون سی بات کب کہنی ہے اور کون سی بات اثر کرے گی۔ ہمارے پاس سند یافتہ فکر حضرت علامہ اقبالؒ کی ہے۔ یہ فکر پڑھے بغیر سوچ کی آبیاری نہیں ہو سکتی۔ تدریس والے لوگوں کی فکر منظم ہونی چاہیے اور اس کیلئے سب سے ضروری چیز اقبالؒ کی فکر ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ جس تکمیل کی بات کرتے ہیں، وہ تکمیل خودی ہے۔ بہت کم لوگ اس خودی سے آگاہ ہیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ کے فلسفے کو جس نے بھی زندگی کے کسی بھی حصے میں استعمال کیا اور اس کے پاس اس کا نتیجہ بھی ہے تو پھر اس کا اس فلسفے پر یقین ہوگا۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارا نوجوان اور استاد جانتا ہی نہیں کہ آپؒ کی فلاسفی کہاں تک ہے۔ آیا وہ صرف ترانے، نظم یا گیت تک ہے یا زندگی میں بھی اس کا کوئی عمل ہے۔ اگر یہ نہیں پتا تو پھر کلام اقبالؒ نصاب میں سجا ہوا تو ملے گا، مگر عملی زندگی میں نظر نہیں آئے گا۔

زندگی سے عدم سنجیدگی

ہم نے یہ سوال کبھی نہیں اٹھایا کہ تعلیم کس کو کہا جاتا ہے۔ ہم تعلیم کے اٹھارہ سالہ عمل

سے گزرتے ہیں اور اٹھارہ سال گزرنے کے بعد جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے، ہم اس سے آشنا نہیں ہوتے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہماری جیب میں پیسے ہوں، مگر ہمیں یہ پتا نہ ہو کہ بازار سے کیا خریدنا ہے۔ بچہ کھلونوں سے کھیلتا بھلا لگتا ہے، مگر بڑا کھیلے تو عجیب لگے گا۔ اگر ہم غور کریں تو زندگی میں بڑے بڑے لوگ کھلونوں سے کھیلتے نظر آتے ہیں، کیونکہ زندگی کی سنجیدہ چیزوں کو انھوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ان کے بارے میں انھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ کا فلسفہ زندگی میں سنجیدگی لاتا ہے اور اس سنجیدگی کا نام ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' کی نظم میں نظر آتا ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو، خدایا میری

بچہ دعا مانگتا ہے کہ اس کی زندگی شمع کی مانند ہو جائے۔ روشنی دینے والا بننا بہت بڑا سوال ہے۔ روشنی دینے والا بننے کیلئے لازم ہے کہ آدمی میں روشنی ہو۔ جو خود روشنی ہے، وہ روشنی دینے والا بنے گا، کیونکہ وہ وہی شے دے سکے گا جو اس کے پاس ہے۔ دعا کا زمانہ کچھ ہوتا ہے اور تاثیر کا زمانہ کچھ ہوتا ہے۔ اگر دعا فوری قبول ہو بھی جائے تو پھر بھی تاثیر کا وقت بعد میں آتا ہے۔

غور کیجیے، جو دعا ہم بچپن میں مانگتے ہیں، کتنی سچی ہوتی ہے۔ معاشرے میں کتنے لوگ ہیں جو شمع کی مانند ہیں۔ معذرت کے ساتھ، اگر ہم ڈھونڈنے نکلیں تو صرف تاریکی ملے گی، روشن لوگ نہیں ملیں گے۔ آج کا انسان جو آزاد پاکستان میں زندگی گزار رہا ہے، اس کی یہ دعا نہیں ہے۔ وہ روشن ہونا ہی نہیں چاہتا۔ آج کا استاد شمع بننے کا خوگر ہی نہیں ہے۔

علم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ عمل کا نام ہے، یہ تہذیب نفس کے کام آتا ہے، یہ کچھ اچھے اطوار دیتا ہے اور حیوانی اطوار نکال دیتا ہے۔ ہمارے اصلاحِ احوال کا نام تعلیم ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ہمیں عام انسان سے فائدہ رساں انسان بنا دیتا ہے۔ ہمارے

معاشرے میں بے شمار پڑھے لکھے لوگ ہیں، اتالیق ہیں، اساتذۂ کرام ہیں، پیر ہیں، رہبر ہیں مرشد ہیں، مگراُن میں سے کتنے شمع ہیں؟

دُور دنیا کا مرے دم اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کے اندھیرے کم کریں۔ اگر ہماری دنیا کا اندھیرا کم نہیں ہوا تو پھر اس کا مطلب ہے کہ بچپن میں ہم نے یہ دعا نہیں مانگی تھی، صرف منہ سے الفاظ ادا کیے تھے۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ طالب علم کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ اس کے دَم سے دنیا کا اندھیرا کم ہو جائے۔ تعلیم اگر ہمیں چمکنے والا نہ بنائے اور روشن نہ کرے تو پھر وہ تعلیم نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ علم نور ہے۔ اس حدیث پر غور کیا جائے تو جہاں علم نور ہے، وہاں جہالت کا نام اندھیرا ہے۔ وہ علم جس سے سینہ روشن ہو، فہم وفراست اور انداز میں لچک آئے، وہ نور ہے۔ اور اس نور کی تمنا اور اس کا حصول اقبالؒ کے مطابق تعلیم ہے۔

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زینت کا مطلب ہے کہ کسی خاص جگہ پر کوئی چیز ایسی ہو جس کی وجہ سے اس جگہ کی ویلیو بڑھ جائے۔ پھول کے بغیر باغ خوبصورت نہیں لگتا۔ وہ جنگل ہو جاتا ہے، اس لیے پھول باغ کا اظہار ہے۔ اقبالؒ اس دعا میں بچے سے کہہ رہے ہیں کہ جس راستے پر چل رہے ہو، اس کے انجام پر پہنچ کر تم پھول کی مانند ہو جاؤ اور وہ ایسا پھول ہو جو چمن کی مانند ہو۔

زندگی ہو میری پروانے کی صورت یا رب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

زندگی اگر گزارنی ہے تو اس کا انداز پروانے والا ہونا چاہیے۔ وہ انداز جس میں طلب

صادق ہو۔ آگے بڑھنے کی جستجو، علم کی جستجو میں اگر سنجیدگی ہے تو پھر یہ زندگی شمع بھی ہے اور پروانہ بھی۔ ہمارا پروانے کی طرح رہنا نتیجہ تو دے گا ہی، لیکن یہ بذاتِ خود ایک نتیجہ ہے۔ پیاسا بننا، اچھے راستے کا مسافر بننا بذاتِ خود بہت بڑی کامیابی ہے۔ پروانے کا مزاج ہے پیاسا ہونا، شمع پہ فدا ہونا۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں اس کے قریب جاؤں گا تو مر جاؤں گا، پھر بھی اس کی طرف بڑھتے رہنا ہے، پھر بھی اس راستے پر چلتے رہنا ہے۔ یہ پیاس اور طلب کی بات ہو رہی ہے، یعنی روشنی کی طلب۔

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا

درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

ہم اپنی زندگی میں دوسروں کی مدد کے حوالے سے کتنے سنجیدہ ہوتے ہیں؟ کیا تعلیم ہماری زندگی کو مددگار بناتی ہے؟ معذرت کے ساتھ نہیں۔ مقابلے کے امتحان میں کامیابی کے بعد کیا ملک کی خدمت مزاج میں ہے؟ معذرت کے ساتھ نہیں۔ کیا ایک افسر شاہی ایک عام انسان سے کے ٹو جتنا فاصلہ نہیں رکھتا؟ کیا اس تک پہنچنا اتنا ہی مشکل نہیں ہے جیسے امریکا کا ویزا ملنا؟ جس تعلیم اور علم کی بات اقبالؒ کر رہے ہیں، کیا افسر کے عمل سے غریبوں کی حمایت کا مطلب نکلتا ہے؟ معذرت کے ساتھ نہیں۔

جن کا ہم کلمہ پڑھتے ہیں، جب آپ ﷺ پر وحی آتی ہے اور آپ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاتے ہیں اور انھیں وحی کے بارے میں بتاتے ہیں تو وہ جواب دیتی ہیں، آپ ﷺ مت گھبرائیں، کیوں کہ آپ ﷺ تو غریبوں، ضعیفوں کے کام آتے ہیں۔ ہم کلمہ اُن کا پڑھتے ہیں، لیکن غریب سے دور ہیں۔

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو

نیک جو راہ ہو، اسی راہ پہ چلانا مجھ کو

ہم پانچ وقت کی نماز میں کہتے ہیں، ''ہمیں سیدھی راہ دکھا۔ ان کا راستہ دکھا جن پر تو

نے انعام کیا" اور بچہ بچپن میں اسکول میں یہ دعا مانگتا ہے کہ "اے اللہ، مجھے سیدھی راہ دکھا"
لیکن آج ہم سیدھی راہ کی طرف گامزن ہیں؟ معذرت کے ساتھ، نہیں۔ اس کا مطلب ہے
کہ ہم آپؒ کے تعلیمی فلسفے کی پیروی نہیں کر رہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ خواہش کرتے ہیں کہ اس دعا میں جن صفات کا ذکر ہوا ہے، وہ
تمام صفات ہمارے بچوں میں ہوں اور وہ ان صفات کے حصول کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا
مانگیں۔ آپؒ نوجوانوں سے فرماتے ہیں کہ اگر تیری خودی پالش نہیں اور اگر تو نے اس کو
تلاش نہ کیا تو پھر جو تعلیم کے مقاصد ہیں، تم اس تک نہیں پہنچے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم
خودی کو تلاش کیے بغیر چلے گئے تو پھر تمہاری زندگی بھی موت ہے، کیونکہ زندگی کا دوام اور
زندگی کا نام اس دن سے ہے جس دن آپ خودی کے راستے پر چلیں۔

ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ خودی پڑھانے والوں کی اپنی خودی برقرار نہیں ہے۔
ہمارے اُردو پڑھانے والے اساتذہ اپنی خواہش سے اُردو نہیں پڑھا رہے۔ اقبالؒ جس
خودی کی بات کرتے ہیں، وہ اس سے بہت دور ہوتے ہیں۔ جب وہ دور ہوتے ہیں تو اس
دوری کی وجہ سے جس طرح کی خودی انھیں سمجھ آتی ہے، وہی پڑھاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ
نکلتا ہے کہ طالب علم خودی سے آشنا نہیں ہو پاتا۔

استاد کا جمود

خودی جس کو "عرفانِ ذات" کہا گیا ہے، وہ شے ہے جس کو پانے کے بعد انسان ہزار
سجدوں سے بچتا ہے، کیونکہ اس کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ ہوتا ہے۔ کیا ہماری تعلیم ہمیں صرف
اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنا سکھاتی ہے؟ معذرت کے ساتھ، نہیں۔ آپؒ کے فلسفے کی سب
سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ آپؒ جمود کے خلاف ہیں۔ اردو میں فلسفہ اور تدریس کے
حوالے سے جتنی چیزیں موجود ہیں ان میں آپؒ کے سوا ایک فلسفی ایسا نہیں ہے جو نوجوان

سے کہے کہ تو شاہین ہے۔

آپ ؒ کی خودی کا دوسرا خوبصورت پہلو مردِ مومن ہے جو نظر تو قاری قرآن آئے، لیکن مفسر قرآن ہو۔ اس کے معاملات، لین دین، اٹھنا بیٹھنا اور شب و روز تمام احکام الٰہی کے مطابق ہوں۔ جب لوگ دیکھیں تو اش اش کر اٹھیں۔ کسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کیسی ہے؟ آپ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا، کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو دیکھنا ہے تو قرآن دیکھ لو اور قرآن کو دیکھا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا۔

انسان واحد مخلوق ہے جسے اسما کا علم ملا جس سے چیزوں کے معانی کا پتا چلا۔ جب فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ اسی کو سجدہ کیوں تو اللہ تعالیٰ نے کہا، تم اس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھو، یہ تمہیں جواب دے گا۔ انسان کو اللہ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ کسی معاملے کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔ اقبال ؒ چاہتے ہیں کہ نوجوانوں میں خودداری پیدا ہو۔ اگر شاہین کی اس صفت کو لیں تو ہمیں اپنی زندگی میں بہت کم لوگ ملیں گے جن میں خودداری ہے۔

ہمارے عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی رول ماڈل ہوتا ہے۔ جب ہم خودداری کی مثال تلاش کرتے ہیں تو خودداری کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال ؒ جس شاہین کی بات کرتا ہے، وہ اسے نہیں مل رہا۔ اقبال ؒ نوجوانوں سے فرماتے ہیں کہ وہ اپنا شکار خود کرے۔ ہار نہ مانیں۔ ان کی نگاہ کی وسعت کی کوئی حد ہی نہ ہو اور فوکس اتنا ہو کہ انھیں صرف ٹارگٹ ہی نظر آئے۔

اقبال ؒ کے ہاں شاہین کچھ صفات کا مرکب ہے۔ انسان میں یہ صفات تب پیدا ہوتی ہیں کہ جب وہ ان صفات کو اہم سمجھتا ہے۔ پھر سوال اٹھتا ہے کہ ہم جو صفات اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں، کیا وہ واقعی ہمارے لیے اہم ہیں؟

ذات ہے۔ ہمیں دوسرے کی گالی پر غصہ آتا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ اس کے گالی دینے کی وجہ سے غصہ آیا، حالانکہ غصہ کنٹرول کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔

ہمارے پاس ایسا بے انتہا لیٹریچر ہے جو نفس کو جگا دیتا ہے، لیکن روح کو سلا دیتا ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد ہم تھک جاتے ہیں اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد گناہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ایسا لٹریچر، ایسا نصاب جو آپ کو خودی کے راستے کا مسافر نہ بنائے، حجاب ہے۔ نصاب اور نظامِ تعلیم خودی کی تکمیل میں معاون ہونا چاہیے۔

اگر ایک ایسی نسل پیدا ہو جاتی ہے جسے اقبال فہمی ہو تو پھر اگلی نسلوں کو سمجھانا بڑا آسان ہو جائے گا۔ آج کا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس معلومات کے ذرائع بہت زیادہ ہیں، لیکن فہم نہیں ہے، دانش مفقود ہے۔ جب اگلی نسل آئے گی تو اس کے پاس معلومات کے ذرائع اس سے بھی زیادہ ہوں گے۔ تب اس کیلئے فہم و دانش کا حصول اس سے بھی زیادہ مشکل ہوگا۔ فلسفہ اقبالؒ اگر ایک فرد تک جاتا ہے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ فیض دوسروں تک منتقل نہ ہو۔

متحرک زندگی

''ہر شخص دنیا کو بدلنا چاہتا ہے، مگر خود کو کوئی بدلنا نہیں چاہتا!''

لیو ٹالسٹائی

دنیا کی سب سی بڑی کامیابی یہ ہے کہ آپ آزاد ہوں، حالات کے تابع نہ ہوں بلکہ حالات آپ کے تابع ہوں۔ دنیا میں سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ آپ سمجھیں کہ میں گر گیا ہوں اور اب آگے نہیں بڑھ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ گرنے سے کوئی رکتا ہے اور نہ کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔ مسئلہ وہاں کھڑا ہوتا ہے کہ جب آپ ذرائع کی کمی کا رونا روتے رہیں۔

ہم ساری زندگی آئیڈیل وقت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ایک مناسب وقت آجائے، مناسب ذرائع پیدا ہوجائیں، حالات بہتر ہوجائیں، ملک ٹھیک ہوجائے، اس کے بعد ہم کچھ کریں گے۔ جان لیجیے کہ جو شخص مناسب حالات کا انتظار کرتا ہے، اس کیلئے مناسب حالات کبھی نہیں آتے۔ جب تک ہم یہ بھول نہیں جاتے کہ یہ ملک ہمارے لیے کیا کر رہا ہے اور یہ اپروچ نہیں اپناتے کہ ہم ملک کیلئے کیا کر رہے ہیں، تب تک متحرک نہیں ہوسکتے، ہم کچھ نہیں کرسکتے۔

گھر میں کمانے والا ایک ہو اور کھانے والے آٹھ ہوں تو بوجھ بن جاتا ہے۔ سب کام کر رہے ہوں تو پھر بوجھ نہیں رہتا، اس لیے ملک کو بوجھ بننے والوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ملک کو کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ ملک کو ایسے شہریوں کی ضرورت ہے جو کم از کم اپنا بوجھ تو اٹھا سکیں، جو اپنی ذمے داری تو قبول کرلیں۔

قدرت کے ٹریزز

قدرت معاشرے میں بعض ایسے لوگ بھیج دیتی ہے جو معذور یا اپاہج ہوتے ہیں۔ اُن کے پاس ذرائع نہیں ہوتے۔ ان کا تعلق کسی پسماندہ گاؤں سے ہوتا ہے۔ ان کے حالات بہت خراب ہوتے ہیں۔ وہ یتیم ہوتے ہیں۔ ان کے پاس فیس ادا کرنے کے پیسے نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ قدرت کی طرف سے سب سے بڑے ٹریزز ہوتے ہیں۔ قدرت انھیں بھیجتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ اگر تم کرنا چاہو تو خراب حالات کے باوجود بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔ اور نہ کرنا چاہو تو پھر بادشاہ کے بیٹے ہو کر بھی کچھ نہیں کر سکتے۔

آج یہ فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمیں کچھ کرنے کیلئے مناسب حالات چاہئیں یا حالات جیسے بھی ہوں، ہم دکھائیں گے کہ ہم کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس فیصلے پر جم جاتے ہیں تو پھر زندگی صدیوں میں، سالوں میں، مہینوں میں نہیں بدلے گی بلکہ زندگی اسی لمحے بدل جائے گی جس لمحے یہ فیصلہ کیا گیا ہوگا کہ مجھے کچھ کرنا ہے۔

پہلے خود کو بھریے

زندگی ملنے کے بعد شعور آتا ہے اور شعور کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ انسان کہے کہ مجھے خود فیصلہ کرنا ہے۔ وہ طے کرے کہ مجھے متحرک انسان بننا ہے۔ متحرک انسان وہ ہوتا ہے جو ذمہ دار ہوتا ہے۔ جو شخص اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتا، وہ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا تو وہ ملک کیلئے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ پانی سے بھرا ہوا گلاس کسی کے کام آتا ہے، خالی کو تو خود ضرورت ہوتی ہے۔ اگر خالی برتن میں کچھ ہے ہی نہیں تو وہ دوسروں کو کیا دے گا۔ اپنے پاس کچھ ہوگا تو دوسروں کو دینے کے قابل ہوگا۔

یہ بہت بات ہے کہ آدمی کی غیر موجودگی میں بھی اس کیلئے تالیاں بجائی جائیں اور اس کی تعریف کی جائے۔ عبدالستار ایدھی نے گولیاں ٹافیاں بیچنے سے زندگی شروع کی اور گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں نام آیا۔ یہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے اپنے حالات کو اجازت نہیں دی کہ تم میرا فیصلہ کرو، بلکہ انھوں نے خود فیصلہ کیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

اسٹیو جوبز کہتا ہے کہ قدرت نے تمہیں بہت کم وقت دیا ہے۔ اس کم سے کم وقت کو یا تو ضائع کر دو یا پھر زندگی کی حقیقت کو سمجھ جاؤ کہ وقت بہت کم ہے۔ جب وقت کم ہوتا ہے تو پھر ایک ہی طریقہ ہوتا ہے کہ جلد از جلد کچھ کر لیا جائے۔

بے مقصد ہاتھ

آج ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارا ہاتھ نیچے والا ہوگا یا اوپر والا۔ اوپر والا ہاتھ بہتر کیوں کہا گیا، کیونکہ اوپر والا ہاتھ متحرک ہاتھ ہے۔ وہ دوسروں کا محتاج نہیں ہے۔ ہم مذہب کو علیحدہ کر دیتے ہیں اور دنیا کو علیحدہ کر دیتے ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اوپر والا ہاتھ مدد کرنے والا انسان ہے۔ ہماری تھوڑی سی مدد کسی کیلئے کتنی بڑی آسانی پیدا کر سکتی ہے، اس کا ہمیں اندازہ ہی نہیں ہے۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے ایک جملے سے کسی کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں،

"بے مقصد انسان مرتا ہی رہتا ہے، مقصد والا انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔"

قدرت کی گفتگو

قدرت ہر دن ہمارے ساتھ گفتگو کرتی ہے۔ کبھی کسی استاد کے لیکچر سے، کبھی چھوٹے سے حادثے سے، کبھی کسی کی مثال سے، کبھی ٹی وی پر اچانک جملہ آ جانے سے، کبھی کسی کے پاس سے گزرنے سے، جملہ مل جانے سے، اور کبھی کسی مشاہدے سے۔ قدرت ایسے

لوگوں کا انتظار کرتی ہے جن کے پاس جذبہ اور جنون ہوتا ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ اب لوح و قلم تمہارے پاس ہے، اب بتاؤ تمہاری رضا کیا ہے۔

متحرک زندگی کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں قدرت کی طرف سے جو پیغامات مل رہے ہیں، انھیں سمجھ سکیں اور ان کے مطابق عمل کرنے کے قابل ہوں۔ جب آپ اللہ تعالیٰ کیلئے اٹھارہ گھنٹے جنون کے ساتھ کام کرتے ہیں تو پھر قدرت آپ کو ودیعت کر دیتی ہے کہ آپ لوگوں کے خیال کو پڑھ سکیں، ان کی سوچ کو پڑھ سکیں۔ پھر آدمی میں ظرف آجاتا ہے۔ پھر اس میں حوصلہ آجاتا ہے۔ متحرک انسان وہ ہے جس میں حوصلہ اور برداشت ہو۔ جو دوسرے کو برداشت نہیں کرسکتا، وہ متحرک نہیں ہوتا۔ اشفاق احمدؒ فرماتے ہیں کہ ایکٹیو سٹیزن وہ ہوتا ہے جو اہم کام پر جارہا ہو اور راستے میں اسے کتا پڑ جائے تو وہ کتے کو نہیں پڑتا، بلکہ اپنی جان اس سے چھڑاتا ہے اور اپنی منزل کی طرف گامزن رہتا ہے۔ کتا پڑنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات، چھوٹے چھوٹے مسائل میں آدمی عاجز آجائے اور چڑ چڑا ہو جائے۔

دوسروں کی فکر چھوڑیے

یہ فکر چھوڑ دیجیے کہ ان کا کیا بنے گا، یا لوگ کدھر جا رہے ہیں۔ بلکہ یہ سوچنا شروع کیجیے کہ میرا کیا بنے گا، کیونکہ جب تک ہم "خود" پر نہیں آتے، زندگی کے یہ مسائل حل نہیں ہوں گے۔ اگر ہم اپنے اوپر اسلام نافذ نہیں کر سکتے تو پھر ہمیں پاکستان پر اسلام نافذ کرنے کے بارے میں بھی سوچنا نہیں چاہیے۔ اگر اپنے لیے فیصلہ سازی اچھی نہیں ہے تو پھر پاکستان کیلئے کبھی اچھی نہیں ہوسکتی۔ اگر ہم اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند نہیں ہیں تو پھر ہمیں پاکستان کے مستقبل کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ ہم غلط شروعات کرتے ہیں، ہماری شروعات حقیقت پسندانہ نہیں ہوتیں اور اس وجہ سے نتیجہ نہیں ملتا تو ہم مقدر پر ڈال دیتے ہیں۔ ہمیں اکثر یہ پتا ہی نہیں ہوتا کہ ہمیں کرنا کیا ہے، کیوں کہ ہم نے اپنی شناخت کا

پہلا قدم ہی اٹھایا نہیں ہوتا۔ جب تک آپ اپنی شناخت نہیں کریں گے، اپنے حقیقی مسائل سے بھی آشنا نہیں ہو سکتے۔

اگلا مرحلہ یہ ہے اس سسٹم میں اپنا کردار تلاش کیجیے، خواہ وہ چھوٹا سا ہی ہو۔ بھاٹی چوک میں ایک موچی بابا فیروز بیٹھا جوتیاں گانٹھا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے چالیس سال اسی کام میں صرف کر دیے۔ وہ جو دعا کرتے، قبول ہو جاتی تھی۔ کسی نے پوچھا، بابا جی آپ کس طرح ولی بن گئے۔ انھوں نے کہا، ''پتر، دنیا سمجھ دی اے وڈے کم کرن نال بندہ ولی بندا اے۔ کم چھوٹا جیا پھڑ لو لیکن اونوں ایمانداری نال کرو۔'' یعنی دنیا یہ سمجھتی ہے کہ بڑا کام کریں گے تو ولی بنیں گے۔ نہیں، چھوٹا سا کام پکڑ لو اور اسے دیانت داری کے ساتھ کرنا شروع کر دو۔

کمال کا کام

متحرک فرد (ایکٹیو سٹیزن) وہ ہوتا ہے جو چھوٹا سا کام کر رہا ہو، لیکن کمال کا کر رہا ہو۔ ابراہم لنکن جب پہلی بار اسمبلی میں گیا تو ارکانِ اسمبلی ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ تم موچی کے بیٹے ہو۔ لنکن نے جواب دیا، ہاں میں موچی کا بیٹا ہوں لیکن تم جانتے ہو میرا باپ وہ موچی تھا کہ اُس جیسا جوتا پورے امریکا میں کوئی نہیں بنا سکتا۔ آپ جو بھی کام کریں، ایسا زبردست ہو کہ کوئی دوسرا اس سے بہتر نہ کر سکے۔

جاوید چوہدری کہتے ہیں کہ لاہور شہر میں اگر کسی کو ایک سموسہ بھی کمال کا بنانا آتا ہے تو وہ مشہور ہو جائے گا۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم چھوٹا سا کام بھی کمال کا نہیں کرنا جانتے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ کام کی شروعات باہر سے نہیں ہوں گی بلکہ اپنی ذات سے ہوں گی۔ اگر ہماری سوچ، ہمارے یقین اور مائنڈ سیٹ کا کنٹرول اپنے پاس نہیں ہے تو پھر ہم اپنے لیے اور اس ملک کیلئے کچھ نہیں کر سکتے۔ اس ملک کو بوجھ اٹھانے والے لوگ

چاہئیں۔اس ملک کو استاد نہیں چاہئیں بلکہ ایکٹیو استاد چاہئیں۔اس ملک کو سائنس داں نہیں چاہئیں بلکہ ایکٹیو سائنس داں چاہئیں۔اس ملک کو طالب علم نہیں چاہئیں بلکہ ایکٹیو طالب علم چاہئیں۔اس ملک کو وہ لوگ چاہئیں جو واقعی اپنا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔کسی ڈرامے یا فلم میں ایک کردار نکال دیا جائے تو وہ فلم ادھوری رہ جائے گی۔اگر ہم اپنا کردار ادا کرنا شروع کردیں تو ہم ہیرو بن جائیں گے اور اگر اپنا کردار نکال دیں تو پھر زیرو ہو جائیں گے۔

یہ زندگی شروع ہوتی ہے تو کسی چھوٹے سے بچے کی صورت میں ہوتی ہے جو کھلونوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔پھر وہ اپنی ماں کی انگلی پکڑ کر چلنا شروع کرتا ہے۔پھر ایک چھوٹا سا بیگ پہن کر اسکول جانا شروع کرتا ہے۔بیگ بڑا ہونا شروع ہوتا ہے اور وہ کندھے پر آجاتا ہے۔وہ بچہ بڑا ہو کر یونیورسٹی چلا جاتا ہے۔پھر دوڑیں لگ جاتی ہیں۔پھر تھوڑی سی کمر جھک جاتی ہے۔ہاتھ میں چھڑی آجاتی ہے۔پھر وہیل چیئر آجاتی ہے۔پھر چارپائی آجاتی ہے اور پھر آخر کار قبر آجاتی ہے۔

آپ کیا کریں گے

کسی نے کسی صاحب کو کہا کہ آپ کیا کر رہے ہیں؟اس نے جواب دیا،آج کل تو میں جوان ہوں، پیسے کما رہا ہوں، زندگی گزار رہا ہوں۔اس نے پوچھا،آپ کے والد صاحب؟ اس نے جواب دیا، وہ بچے سے بڑے ہوئے، شادی کی، پھر بچے ہوئے، پھر بچوں کی شادیاں کیں اور فوت ہو گئے۔اس شخص نے پوچھا،آپ کے دادا؟ اس نے جواب دیا، انھوں نے بھی ایسا ہی کیا۔اس شخص نے پھر سوال کیا تو پھر آپ کیا کریں گے؟اس نے جواب دیا، میں بھی ایسا ہی کروں گا۔

جو ایسا ہی کرتا جاتا ہے وہ ایک دن قبر میں چلا جاتا ہے، کیونکہ اس نے اپنا کوئی کردار ادا نہیں کیا ہوتا۔ایکٹیو لوگ بھاگتی دنیا کو چھوڑتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں کہ ہمیں اس ہجوم

کی پیروی نہیں کرنی، ہمیں اپنی زندگی کو متحرک بنانا ہے۔

بھیڑ چال سے بچیئے

دنیا کی سب سے موثر تبلیغ رول ماڈل بننا ہے، نصیحت کرنا نہیں۔ پرانے طریقوں کو توڑنا ہوگا جو سارے چلا رہے ہیں۔ اگر ہم وہی کرتے جائیں گے جو ہوتا آرہا ہے تو پھر وہی ملتا رہے گا، جو ملتا رہا ہے۔ کچھ نیا پانے کیلئے کچھ نیا کرنا پڑے گا اور کچھ نیا کرنے کیلئے سب سے پہلا کام یہ کرنا ہے کہ ہجوم کو چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ یہ ہجوم حماقتوں کا ہجوم ہے، جہالتوں کا ہجوم ہے، بے وقوفیوں کا ہجوم ہے، غیر ذمے داریوں کا ہجوم ہے، بے شرمی کا ہجوم ہے۔
ایک وقت تھا کہ نفس کو مارنے کے لیے کئی کئی سال پانی میں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ مچھلیاں پاؤں کا گوشت کھا جاتی تھیں، پھر کہیں جا کر نام بنتا تھا۔ بابا فرید مسعود گنج شکرؒ جو آج کے ولی ہیں کہتے ہیں کہ آج کے دور میں صرف گناہ سے بچ جانا ولائیت ہے، نیکی تو بہت دور کی بات ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق محسوس کر کے دیکھیے، پھر دیکھیے کیسے ایکٹیو سٹیزن بنتے ہیں۔
ایک صاحب کو جن پکڑنے کا بہت شوق تھا انھوں نے ساری زندگی جن پکڑنے میں لگا دی، لیکن جن نہ پکڑ سکے۔ کسی نے کہا کہ فلاں گاؤں میں ایک شخص رہتا ہے، اس کے پاس ایک جن ہے۔ اس کے پاس جاؤ، وہ تمہیں جن پکڑنے کا طریقہ بتا دے گا۔ وہ اس گاؤں میں چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ جس شخص کے پاس جن ہے وہ اپنے صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر مرغیوں کو دانہ ڈال رہا ہے۔ اس نے سوچا، لگتا نہیں ہے کہ اس کے پاس جن ہوگا۔ وہ پاس گیا اور پوچھا، کیا آپ کے پاس جن ہے؟ اس نے کہا، ہاں ہے۔ اس نے کہا، پھر مجھے جن پکڑنے کا طریقہ بتا دیں۔ اس نے کہا، جن کو پکڑنا چھوڑ میرا جن لے جا۔ وہ سامنے بوتل میں فارغ پڑا ہے۔ اس نے بوتل اٹھائی اور الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ گھر جا کر اس نے بوتل کو کھولا، اندر سے دھواں نکلا، واقعی جن نکل آیا۔ پھر اس جن نے ہاتھ باندھ کر

پوچھا، کیا حکم ہے میرے آقا؟ اس نے کہا، مجھے بڑا سا گھر چاہیے۔ جن نے کہا، یہ کام نہیں ہوسکتا، کوئی اور کام بتائیں۔ اس شخص نے کہا، مجھے پانچ کروڑ روپیہ چاہیے۔ جن نے کہا، یہ کام نہیں ہوسکتا، کوئی دوسرا کام بتائیں۔ اس نے کہا، مجھے گاڑی چاہیے۔ جن نے کہا، یہ کام نہیں ہوسکتا۔ اس شخص نے کہا، کیا تم واقعی جن ہو؟ مجھے تو تم پر شک ہے۔ جن نے کہا، میں واقعی جن ہوں۔ اس شخص نے کہا، پھر تم کیا کرسکتے ہو۔ جن نے جواب دیا، میں دکان سے سودا سلف لاسکتا ہوں، آپ کے بچوں کو اسکول چھوڑ سکتا ہوں۔ اس شخص نے کہا، یہ تو بہت چھوٹے چھوٹے کام ہیں۔ جن نے کہا، میرا پہلا آقا مجھ سے دس سال سے یہی کام لیتا رہا ہے، اس لیے میں بڑے بڑے کام کرنا بھول گیا ہوں۔ ہم بڑے تو ہوں گئے ہیں، لیکن بڑے کام کرنا بھول گئے ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے کام کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو اتنا چھوٹا کرلیا ہے کہ کسی کا ایک جملہ زندگی میں دیوار کھڑی کردیتا ہے۔

منزل کا مسافر

اگر گاڑی ایک سو بیس کی رفتار پر جارہی ہو تو سڑک کنارے کھڑے کچھ ہی کہہ رہے ہوں، وہ خواہ گالیاں ہی بکتے ہوں، گاڑی چلانے والا ان پر توجہ نہیں دے گا۔ لیکن اگر یہی گاڑی دس کی رفتار سے رینگ رہی ہو تو پھر گاڑی چلانے والا راہ گزرتی گائے کو بھی دیکھے گا، کوے کو بھی، کتے کو بھی اور جس نے کچھ نہیں کہا، اس کو بھی روکے گا کہ تم نے کیا کہا ہے۔ متحرک آدمی یہ نہیں دیکھتا کہ دنیا کیا کہہ رہی ہے۔ اس کا ٹارگٹ واضح ہوتا ہے اور ایک سو بیس کی تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بھاگ رہا ہوتا ہے۔

ہم اپنے گلی محلے کی صفائی کیلئے کوڑے والے کے منتظر رہتے ہیں۔ ہم تو اتنے گر چکے ہیں کہ اپنے گھر کی صفائی کے قابل بھی نہیں رہے۔ ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ جو شخص کوڑا اٹھانے آیا ہے، وہ تو صفائی والا ہے، وہ ہمارا کوڑا اٹھانے آیا ہے۔ ایک شہر میں کچھ دنوں کیلئے

صفائی والوں کو نکال دیا گیا۔ شہر میں اتنا کوڑا جمع ہو گیا کہ کاروبارِ حیات مشکل ہو گیا۔ ہم ایک آدمی نکال دیں تو ہمارے کام بند ہو جاتے ہیں۔ ہم بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں یہ پتا ہی نہیں کہ ہمیں قدرت نے کیوں بھیجا ہے۔ اگر ہمیں اس کا پتا ہے تو پھر اس کے مطابق ہمیں کام کرنا ہے۔ اور وہ کام یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کی مدد کرنا ہے۔ لیکن، کمزور انسان مدد نہیں کرسکتا۔ دوسروں کی مدد کرنے کیلئے جرات چاہیے۔ اگر ہم فقط یہ فیصلہ کرلیں کہ ہم نے اپنے آپ کو مضبوط کرنا ہے تو کتنے لوگوں کی مدد ہو جائے گی۔ اگر ہم کمال کے انسان بن جاتے ہیں تو ہم سے جڑے ہوئے کتنے لوگوں کی زندگیاں بدل جائیں۔ ہم مثال نہیں بنتے، مثالیں دیتے رہتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ہم نے بھی مثال بننا ہے۔ دنیا کے نقشے پر پاکستان نظر آتا ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ پاکستان کے نقشے پر ہم نظر آئیں۔

اپنی بساط بھر تو کیجیے

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے آگ جلائی گئی تو چڑیا اس آگ کو بجھانے کیلئے اپنی چونچ میں پانی لے کر جا رہی تھی۔ کسی نے اسے تانا دیا کہ اس پانی سے آگ نہیں بجھے گی۔ چڑیا نے کہا، یہ اہم نہیں ہے کہ ان چند بوندوں سے آگ بجھے گی کہ نہیں، بلکہ اہم یہ ہے کہ چڑیا جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑی ہو گی اور اللہ تعالیٰ پوچھے گا، تم نے کیا کیا تو میں جواب دوں گی کہ میری چونچ میں چند بوندیں آتی تھیں، میں نے اپنی بساط بھر وہ چند بوندیں ضرور اس آگ پر گرائیں۔

جب ہم اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوں گے اور وہ کہے گا کہ تم کتنے ایکٹو تھے اور اگر ہمارا جواب یہ ہو گا کہ ہم جو کر سکتے تھے، وہ بھی نہیں کر سکے تو وہ پوچھے گا کہ پھر تم نے کیا کیا؟ ہم جواب دیں گے کہ گلہ کیا تھا، شکوہ کیا تھا، لڑائی کی تھی، منفی سوچا تھا، نعرے لگائے تھے، احتجاج کیا تھا۔ ہر برا کام جو میں کرسکتا تھا، وہ کیا۔

لوگ دعاؤں کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں خطوط بھیجتے ہیں۔کوئی بیٹا مانگ رہا ہے، کوئی نوکری مانگ رہا ہے، کوئی گھر مانگ رہا ہے۔فرشتے ان سارے خطوط کو علیحدہ کرتے جاتے ہیں۔ جب کہ ان میں ایک خط ایسا آتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے کہ اے اللہ، مجھے کسی کام پر لگا دے۔ مجھ سے کوئی کام لے لے۔ میں تیرا بندہ ہوں۔ تجھ سے دور ہوں۔ تیرے پاس واپس لوٹ کر آنا ہے۔ وہ خط، وہ دعا فوراً منظور ہوتی ہے۔کوئی خط تو ایسا ضرور ہونا چاہیے جس میں یہ لکھا ہو کہ مالک میں نے پہلا قدم اٹھالیا ہے، اب تیری باری ہے۔

کاؤنسلنگ اور کوچنگ

''کاؤنسلر اور کوچ اپنے کلائنٹ کو اہم فیصلہ کرنے میں درست رہنمائی کرتے ہیں!''

ڈیوڈ لارنس پریسٹن

ہمیں زندگی پہلے مل جاتی ہے جبکہ عقل اور شعور بعد میں ملتا ہے۔ جب عقل و شعور کی باری آتی ہے تو ہماری اٹھان اکثر ایسی ہوتی ہے کہ ہم زندگی کے اہم ترین سوالات کے جوابات جاننے سے قاصر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے، من چاہی شے حاصل کیسے کرنا ہے، منزل کی شناخت کیسے کرنی ہے، جانا کدھر ہے، پانا کیا ہے، کھونا کیا ہے، منزل کیسے پانی ہے، حقیقت کیا ہے، وغیرہ... جیسے جوابوں کیلئے ہم دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں۔ عموماً ہم یہ جوابات اپنے والدین سے لیتے ہیں، لیکن والدین سے حاصل ہونے والے یہ جوابات اکثر غلط ہوتے ہیں۔ کیوں؟ کیوں کہ وہ ان چیزوں کے ماہر نہیں ہوتے۔ دوسری جانب ہماری اپنی عقل، اپنی سمجھ اتنی نہیں ہوتی کہ وہ ہماری زندگی کو کامیاب اور خوش بنا سکے۔ پھر یقینی بات ہے کہ ہمیں زندگی کے بنیادی مسائل میں معاونت اور رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب یہ معاونت و رہنمائی ہم کسی ماہر سے لیتے ہی تو اسے کاؤنسلنگ اور کوچنگ کا نام دیا جاتا ہے۔

انسان کو ہمیشہ رہنمائی کی ضرورت رہی ہے

کاؤنسلنگ، کوچنگ یا لائف کوچنگ کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ یہ سفر بابوں سے شروع

ہوتا ہے۔ کسی گاؤں میں بابا جی کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہوتے تھے اور اس گاؤں کے بچوں اور نوجوانوں کو سمجھایا کرتے تھے۔ الفاظ سے معانی تک کا سفر طے کرنے والے یہ بے شمار بابے دنیا میں موجود تھے۔ یہی کلچر دنیا میں آج بھی کئی جگہوں پر موجود ہے، جیسے مصر میں یونیورسٹیوں کے اندر شام کے اوقات میں لوگ اپنی نوکریوں، اپنے کاروبار سے ہٹ کر بیٹھتے ہیں اور آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ باتیں یہی ہوتی ہیں کہ ہمیں کیسے جینا ہے، کیسے مرنا ہے، زندگی کیا ہے، موت کیا ہے، فکر کیا ہے، حیات کیا ہے، مسئلہ کیا ہے، مسئلہ کیا نہیں ہے، کیا خوشی ہے، کیا غم ہیں۔ آج البتہ اس کی پروفیشنل شکل آ گئی ہے اور یہ شکل کاؤنسلنگ اور کوچنگ کے عنوان سے دستیاب ہے۔

جس طرح ہر شخص کو کوچنگ کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح اداروں کو بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مختلف شعبوں کے کنسلٹنٹ رکھتے ہیں تاکہ اپنے کاروبار میں بہتری لائی جاسکے۔ ہر شعبے میں کہیں نہ کہیں یہ چیزیں آجاتی ہیں، پھر ان کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

مہارتِ فن

کاؤنسلر یا کوچ دراصل وہ ماہر ہوتا ہے جو مسئلے اور فرد کے درمیان موجود تنازعہ کی شدت کو کم کر دیتا ہے اور مسائل کے حل کے نئے طریقے بتاتا ہے، نئی سوچ دیتا ہے اور بسا اوقات صرف احساس دلاتا ہے۔ پروفیشنل کاؤنسلر یا کوچ یہ فن باقاعدہ سیکھتا ہے۔

جو پرانے اور روایتی بابوں کا بسا اوقات پیشہ ورانہ تجربہ نہیں ہوتا تھا۔ انھوں نے یہ فن کسی سے باقاعدہ نہیں سیکھا ہوتا تھا۔ البتہ انھوں نے زندگی سے اور تجربوں سے سیکھا ضرور ہوتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی میں تجربہ بہت بڑا استاد ہے، لیکن محض تجربہ رکھنا اور باقاعدہ نفسیات اور سماجیات پڑھنا، ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اگر ایک شخص پروفیشنل

ہے تو پھر یقینی بات ہے کہ اس کی سمجھ بوجھ بھی ویسی ہی ہوگی۔ اس کا مشاہدہ، اس کا تجربہ، اس کی تعلیم، اور اس کو جو اتالیق ملے وہ بھی ایسے ہی ہوں گے۔ ان اساتذہ نے اسے سکھایا ہوگا کہ کیسے آپ کو آگے بڑھنا اور کیسے زندگی گزارنی ہے اور کیسے کسی نتیجے پر پہنچنا ہے۔ پرانے بابوں کے پاس بسا اوقات اس چیز کی باقاعدہ سمجھ بوجھ نہیں ہوتی تھی۔ وہ صرف اپنے علاقوں کو جانتے تھے۔ ان کا زندگی کا مشاہدہ کم ہوتا تھا۔ آج یہ صورت حال بدل گئی ہے۔ آج باقاعدہ کاؤنسلر کو تلاش کیا جاتا ہے۔

ہر شعبے کی مہارت الگ ہے

زندگی کے سات شعبے ہیں اور گیارہ قسم کے مسائل ہیں۔ بے شمار طرح کے چیلنج ہیں۔ یہ سب چیزیں مل کر انسان کو بتاتی ہیں کہ ہمیں ان مسئلوں کو حل کرنا ہے۔ جس طرح مختلف اعضا کے الگ الگ ماہرین ہوتے ہیں، آنکھوں کا ماہر علیحدہ، دل کا ڈاکٹر علیحدہ، معدے کا علیحدہ، غرض کہ ہر مرض کا علیحدہ سے ڈاکٹر ہوتا ہے، اسی طرح جتنے مسائل ہیں ان تمام مسائل کے ایکسپرٹ بھی علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ان مسائل کا خاص علم اور آسان حل ہوتا ہے۔

پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں تعلیم اور تربیت علیحدہ ہو چکی ہیں۔ ان کا آپس میں فاصلہ بہت بڑھ چکا ہے۔ ماں کو اچھی ماں بننے کی تربیت نہیں ہے۔ بیٹے کو اچھا بیٹا بننے کی تربیت نہیں ہے۔ باپ کو نہیں پتا کہ باپ کی ذمے داریاں کیا ہیں۔ پاکستانی کو اچھا شہری بننے کی تربیت نہیں ہے۔ طالب علم کو اچھا طالب علم بننے کی تربیت نہیں ہے۔ نمبر لینا ہی کافی نہیں ہے۔ گرومنگ بھی بہت اہم ہوتی ہے۔

شخصیت کے چند حصے ایسے ہیں جن میں بہتری کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں ایک رکشے والے کو نہیں پتا، پیدل چلنے والے کو نہیں پتا، پان کی پیک پھینکنے والا دیکھتا

ہی نہیں ہے کہ تھوکنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ ہمیں چھوٹی بچی کو تمیز سکھانی ہے کہ کل کو اس نے ماں بننا ہے۔ ہمیں ایک لڑکے کو بھی سکھانا ہے کہ اس نے پروفیشنل بننا ہے، باپ بننا ہے، ذمہ داریاں اٹھانی ہیں۔ اس لیے ہر جگہ ٹریننگ کی ضرورت ہے۔

کاؤنسلنگ اور کوچنگ سے ناواقفیت

اس وقت پاکستان میں کاؤنسلرز کی تعداد بہت کم ہے جبکہ لائف کوچنگ کا تو لفظ ہی لوگوں کو معلوم نہیں ہے۔ لیکن آنے والا وقت صرف ڈاکٹرز، انجینئرز کا نہیں ہے بلکہ وہ کوچ اور کنسلٹنٹ کا وقت ہے۔ کوچنگ اور کاؤنسلنگ اس وقت امریکا کا دوسرا سب سے تیزی سے پھیلنے والا پروفیشن ہے، کیونکہ مشورہ اور رہ نمائی بھی ایکسپرٹ ہی کی مانی جاتی ہے۔ اگر آپ کسی ایک شعبے میں ایکسپرٹ ہیں اور اپنے آپ کو بہتر کرتے ہیں تو ایک وقت آئے گا کہ آپ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے نقشے پر نظر آئیں گے۔ اگر دیکھا جائے تو دنیا میں ایک ہی بل گیٹس ہے۔ اس کو ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ مارکیٹنگ کرے، کیونکہ وہ پہلے ہی برانڈ بن چکا ہے۔ جب بھی کوچنگ لینی ہو تو اس شعبے کے ایکسپرٹ کو تلاش کریں۔

اگر کسی شعبے کے ایکسپرٹ سے کوچنگ لینی ہے لیکن جیب اجازت نہیں دیتی تو اس کا بہتر حل یہ ہے کہ گوگل پر، یوٹیوب پر یا کسی بھی سرچ انجن پر سرچ کر لی جائے، کیونکہ آج کل نیٹ پر ہر چیز موجود ہے۔ اس کے علاوہ کوچنگ کے کچھ قدرتی ذرائع ہیں جیسے اپنے بڑوں کی مجلس میں بیٹھیں اور سیکھیں، دوسروں کے تجربے اور مشاہدے سے سیکھیں، اپنا علم بڑھائیں، اپنا ویژن بڑھائیں، اپنے آپ کو بہتر کریں اور بہتری کے حوالے سے جو بھی چیزیں موجود ہیں، ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اپنی ذاتی زندگی کو بہتر کیجیے، سچے کھرے انسان بنئے، زندگی کی پلاننگ کیجیے۔ اگر یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہوں گی تو پھر کونسلنگ کسی حد تک مینج ہو جائے گی۔ یہ چیزیں کسی ایکسپرٹ کا متبادل تو نہیں ہو سکتیں، لیکن مسئلے کے حل میں معاون

ہو سکتی ہیں۔

بسا اوقات جو لوگ لاعلم ہوتے ہیں یا جن کا تجربہ و مشاہدہ کم ہوتا ہے، انھیں کاؤنسلنگ اور کوچنگ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ لاعلمی انسان کو زیادہ مسائل کی طرف لے کر جاتی ہے۔ وہ شخص جس میں خوداعتمادی ہے، علم ہے، تجربہ و مشاہدہ اچھا ہے، اسے زیادہ مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور اسے کاؤنسلنگ کی بھی کم ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ کاؤنسلنگ اور کوچنگ پر سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ دراصل، انھیں یہ راز پتا چل جاتا ہے کہ وہ جب کسی کاؤنسلر یا کوچ کو فیس دیتے ہیں تو وہ اپنے مستقبل پر بہترین سرمایہ کاری کرتے ہیں۔

نوجوانوں کے مسائل

موجودہ دور میں نوجوانوں کے چار بڑے مسائل ہیں۔ ان میں پہلا مسئلہ تعلیم ہے۔ وہ اُن سے ہینڈل نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ جب پڑھ رہے ہوتے ہیں، تب بھی مسائل میں گھرے رہتے ہیں اور جب پڑھ کر فارغ ہو جاتے ہیں تب بھی انھیں کچھ سمجھ نہیں آتا کہ انھوں نے اب اس تعلیم کا کرنا کیا ہے۔ اس لیے انھیں کوچ کی ضرورت ہوتی ہے جو انھیں ایجوکیشنل پلاننگ سمجھائے۔ جو انھیں تعلیم کے اہداف سیٹ کرائے (گول سیٹنگ)۔ جوان کے مزاج کو دریافت کرائے اور پھر ان کی شخصیت کے مطابق انھیں تعلیمی مضامین کا انتخاب کرنے میں رہ نمائی دے۔

نوجوانوں کا دوسرا مسئلہ جوانی کی نام نہاد محبت ہے جس میں وہ کسی کی محبت میں پھنس جاتے ہیں یا غلط صحبت میں پڑ جاتے ہیں۔ سوشل میڈیا نے یہ مسائل بہت عام کر دیے ہیں، اس لیے نوجوانوں کیلئے کوچنگ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔ شادی ایک سنجیدہ معاملہ ہے، کیونکہ شادی کے ذریعے پورا سماج بنتا ہے اور یہ وہ فیصلہ ہوتا ہے کہ

جس کے اثرات موت تک کی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ ہم شادی سے پہلے کسی فیملی کوچ یا کاؤنسلر کی طرف نہیں جاتے۔ ہم ایک بندہ لیتے ہیں اور اس کو بغیر کسی ٹریننگ کے دولھا بنا دیتے ہیں۔ پھر اسے مسائل کے سمندر میں تنہا ڈوبتا ہوا دیکھتے ہیں۔

نوجوانوں کا تیسری قسم کے مسائل جذباتی نوعیت کے ہیں۔ زندگی میں فوکس کی کمی، خوف، خوداعتمادی کا نہ ہونا وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو آج کے بیش تر نوجوانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے حل کیلئے بھی کاؤنسلر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بسا اوقات نوجوان کو نفسیاتی مسئلہ درپیش ہوتا ہے، کوئی کمی ہوتی ہے، شخصیت کی کمزوری ہوتی ہے یہ چیزیں انہیں مریض بنا دیتی ہیں۔ ایسے نوجوانوں کو کاؤنسلر کی ضرورت ہوتی ہے۔

نوجوانوں کا چوتھا مسئلہ سیلف مینجمنٹ کا نہ ہونا ہے۔ اپنی ذات کی تنظیم و ترتیب نہ ہونے کی وجہ سے وہ جسمانی، روحانی اور دیگر مسائل سے پریشان رہتے ہیں۔ خاص طور پر، اس عمر میں جو فطری جنسی تبدیلیاں ہوتی ہیں، درست معلومات نہ ہونے کے باعث وہ ان سے گھبرا جاتے ہیں اور پھر اتائی انھیں ڈرا کر بے وقوف بنا کر ان سے ہزاروں روپے بٹورتے ہیں۔

ہر مسئلہ دوا سے حل نہیں ہوتا

کچھ لوگ کاؤنسلنگ اور کوچنگ کی جگہ بھی دوا کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید دوا کا استعمال ان کے مسائل کا حل ہے۔ اس لیے وہ بھاگے بھاگے اپنے معالج کے پاس جاتے ہیں۔ یاد رکھیے، دواؤں کی اپنی اہمیت ہے، مگر پچانوے فیصدی سے زائد مسائل کو کسی دوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انھیں درست ماہرانہ رہ نمائی سے حل کیا جاسکتا ہے۔ کاؤنسلنگ اور کوچنگ ایک ایڈوائس انڈسٹری ہے، یعنی نصیحت دینے کی صنعت ہے۔ اس میں کوئی میڈیسن نہیں ہوتی۔ کاؤنسلر کی سمجھانے کی صلاحیت اتنی اچھی ہوتی ہے کہ وہ باتوں ہی

باتوں سے متاثرہ فرد کو مسئلے کا حل سمجھا دیتا ہے، کیوں کہ وہ ان مسائل کو سمجھتا ہے۔

کاؤنسلر یا کوچ کسی فرد کا مسئلہ خود حل نہیں کرتا، لیکن وہ یہ ضرور بتا دیتا ہے کہ یہ مسئلہ کیوں کر حل ہو سکتا ہے۔ کاؤنسلر تین حصوں میں کام کرتا ہے۔ پہلے وہ اس مسئلے کو سمجھتا ہے، پھر حقائق بتاتا ہے، پھر اس مسئلے کو حل کرنے کا طریقہ بتاتا ہے۔

کامیاب مشاور

بعض کاؤنسلر اور کوچ بہت زیادہ متاثر کن ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت، ان کا انداز اور ان کا علم زیادہ موثر ہوتا ہے۔ اچھا کاؤنسلر بننے کیلئے علم ہونا چاہیے۔ اسے اپنے بارے میں پتا ہو، اسے انسانی نفسیات کا پتا ہو، زمانے کے علم کا پتا ہو۔ کاؤنسلر کو ہمدرد ہونا چاہے۔ اگر وہ ہمدرد نہیں ہے تو پھر وہ اچھا کاؤنسلر نہیں بن سکتا۔ کاؤنسلر کے پاس ویژن ہونا چاہیے۔ اسے پتا ہو کہ میں جو نصیحت کر رہا ہوں، اس کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے، یہ کدھر جائے گی اور اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ کاؤنسلر کے اندر یہ خاصیت ہونی چاہیے کہ وہ کلائنٹ کی جگہ پر آ کر سوچ سکے اور مسئلے کو سمجھ سکے۔ کاؤنسلر کو پتا ہونا چاہیے کہ اس نے جو کیس شروع کیا ہے، اسے کیسے نمٹانا ہے۔ بہت سے لوگ کیس تو کھول لیتے ہیں، پھر انھیں سمیٹنا نہیں آتا۔

اچھا کاؤنسلر اور کوچ وہ ہوتا ہے جو اپنے سیشن میں ستر فیصد سنتا ہو اور تیس فیصد بولتا ہو۔ جو آدمی صرف بولتا ہے، سنتا نہیں ہے، وہ کاؤنسلنگ نہیں کر سکتا۔ جو شخص علم کے راستے پر چلتا ہے، اس کا مطالعہ بڑھتا ہے، اس کی شخصیت میں بہتری آتی ہے۔

اچھی چیزوں کی لاعلمی

اس معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں پر اچھی چیزیں متعارف نہیں ہوئیں۔ مغرب میں علم متعارف ہو چکا ہے۔ بدھاپسٹ میں لوگوں کے ہاتھ میں ٹکٹ تھے

اور ایک لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ ایک پاکستانی نے ایک شخص نے پوچھا کہ یہاں کون سی فلم لگی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس دفعہ جس شخص نے لٹریچر میں نوبل انعام لیا ہے، اسے سننے کیلئے یہ تمام لوگ یہاں کھڑے ہیں۔ پاکستان میں علم کا، کاؤنسلنگ کا اور سیکھنے کا کلچر ابھی تک نہیں آیا۔ یہاں لوگ کتاب پر پیسے نہیں لگاتے، سیکھنے پر پیسے نہیں لگاتے، اپنی ذات پر پیسے نہیں لگاتے۔ یہاں صرف ایک ہی دوڑ لگی ہوئی ہے کہ کھانے پر کتنے پیسے لگائے جاسکتے ہیں۔ جب یہی ہوگا تو پھر سیکھنے والوں کو مسائل کا سامنا ہوگا۔

پاکستان میں کاؤنسلنگ اور کوچنگ پروفیشن

پاکستان میں کاؤنسلنگ اور کوچنگ کا شعور نہ ہونے کی وجہ سے یہاں ان مہارتوں کی تربیت فراہم نہیں کی جاتی۔ تاہم جو شخص کاؤنسلر بننا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ پہلے نفسیات کی ڈگری ضرور حاصل کرے، کیونکہ اس میں باقاعدہ وہ تمام چیزیں ہوتی ہیں جو انسانی نفسیات کو سمجھنے میں مددگار ہوتی ہیں۔

جن کے پاس نفسیات کی ڈگری نہیں ہے یا پھر ان کیلئے ڈگری لینا ممکن نہیں ہے اور وہ کسی اور سمت میں جاچکے ہیں، ان کیلئے آج بھی دنیا میں سرٹیفکیشن ہو رہی ہیں۔ اس کا ڈگری سے تعلق نہیں ہے، لیکن اس سرٹیفکیشن کے بعد اس فیلڈ کی طرف آیا جاسکتا ہے۔

یہ فیلڈ بہت حوصلہ اور توجہ مانگتی ہے، اس لیے مشاہدہ اور تجربہ بہت ضروری ہے۔ یہ وہ فن ہے جس کو سیکھنے میں زندگی لگ جاتی ہے اور پھر آدمی کہیں جا کر منجھتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس پروفیشن میں آتا ہے تو جس طرح دوسری فیلڈ میں زندگی لگتی اور اس کے بعد آدمی پروفیشنل بنتا ہے، اسی طرح کاؤنسلر اور کوچ بننے کیلئے بھی زندگی درکار ہوتی ہے۔

تعلیم، تربیت، استاد

''کبھی نیا سیکھنا نہ چھوڑو، تم ایک دن کامیاب ہو جاؤ گے!''

جو کارلوزو

علم اسے ملتا ہے، جو اس کا متلاشی ہوتا ہے۔ یہ علم کی تلاش ہی ہے کہ تندور پر روٹی لگانے والا ٹاپ کر جاتا ہے، دودھ بیچنے والا وزیر اعظم بن جاتا ہے، گلیوں میں گولیاں ٹافیاں بیچنے والا گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں نظر آتا ہے۔

افغانستان کا ایک گاؤں غزالہ تھا۔ اس گاؤں میں ایک امیر شخص رہتا تھا۔ اسے تعلیم کا بہت شوق تھا۔ وہ خود تو تعلیم حاصل نہ کر سکا، لیکن اس نے اپنے بیٹے کو تعلیم دلانے کیلئے استاد رکھا ہوا تھا۔ استاد گاؤں سے بیس میل دور شہر میں رہتا تھا۔ وہ روزانہ اس لڑکے کو پڑھانے گاؤں آتا تھا۔ اسی گاؤں میں ایک بچہ اور بھی تھا جسے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن غربت اتنی تھی کہ وہ تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن اس بچے نے استاد کو دیکھا اور انہیں کہا کہ مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے، آپ مجھے بھی تھوڑا وقت دے دیا کریں تاکہ میں بھی تعلیم حاصل کر سکوں۔ استاد نے جواب دیا کہ میں صرف اس بچے کو پڑھانے کا معاوضہ وصول کرتا ہوں۔ اگر میں نے تمہیں بھی پڑھانا شروع کر دیا تو یہ ناانصافی ہوگی۔ بچے نے کہا، جب آپ گھوڑے پر سوار ہو کر واپس شہر جاتے ہیں تو اس وقت میں آپ کے ساتھ ساتھ پیدل چلا کروں گا۔ آپ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے مجھے سبق دے دیا کریں۔ میں اسے یاد کر لیا کروں گا۔ استاد نے بچے کی بات قبول کر لی اور

یوں وہ بچہ تعلیم حاصل کرنے لگا۔ جب استاد نے اس بچے کا شوق دیکھا تو اسے کہا کہ میں تم کو ایک سہولت اور دیتا ہوں وہ یہ کہ جہاں ہمارا سفر ختم ہوتا ہے، تم میرے شہر سے آنے سے پہلے اس مقام پر کھڑے ہو جایا کرو۔ جب میں آؤں گا تو تم میرے ساتھ ساتھ چلنا اس طرح تمہیں مزید سبق مل جائے گا۔ بچے نے استاد کی بات قبول کر لی اور یوں اس بچے نے چھ سال پیدل چل کر اس استاد سے تعلیم حاصل کی۔ بعد میں اسی بچے نے دنیا میں پہلی مرتبہ بجٹ، دینی اور دنیاوی تعلیم کا تصور پیش کیا۔ آج دنیا اس بچے کو حضرت امام غزالیؒ کے نام سے جانتی ہے۔

تعلیم ڈگری کا نام نہیں

اگر طالب علم، علم کا طلبگار نہیں ہے، علم کا متلاشی نہیں ہے، علم کیلئے سفر نہیں کرتا، استاد کیلئے جوتیاں سیدھی نہیں کرتا، علم کیلئے تکلیف برداشت نہیں کرتا تو پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہو اور اسے علم کے نتائج ملیں۔ تعلیم چار نتائج دیتی ہے۔ تخلیق، تربیت، اقدار اور ٹیکنالوجی۔ لیکن ہمارے تعلیمی نظام میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ تخلیق اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے ہم دنیا میں بہت پیچھے ہیں۔ بیرونِ ممالک ہم تہذیب کا اظہار تو کرتے ہیں، لیکن اپنے ملک میں نہیں اپناتے۔ مذہبی رسومات ہیں، مذہبی اجتماعات ہیں لیکن کردار ٹھیک نہیں ہے۔ تعلیم رویوں کے انقلاب پر بات کرتی ہے۔ تعلیم رویے بدلتی ہے۔ تعلیم، تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ میں فرق کرتی ہے۔ لیکن اس سسٹم میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ دونوں برابر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے تعلیم کے معنی بدل دیے ہیں۔ ہم نے تعلیم کا نام "ڈگری" رکھ دیا ہے۔

جس طرح شہد کے اردگرد مکھیاں رہتی ہیں، اسی طرح استاد کے گرد بھی طلبہ کا میلہ لگا رہتا ہے۔ اگر استاد کے گرد طلبہ نہیں ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ استاد نہیں ہے۔ جب تک

انسپائریشن نہیں ہوگی، اس وقت تک بچہ پیروی نہیں کرے گا۔ پیروی متاثر ہونے سے ہی ہوتی ہے۔ جس شخصیت سے انسپائریشن ہوتی ہے، اگر وہ کوئی کام کرنے کو کہے تو کام ہوگا۔ کتاب پڑھی جائے گی اور علمی بات بھی ہوگی۔ ہماری زندگی میں افراد اور ہیرو معتبر نہیں رہے۔ جب ہیرو معتبر نہ رہیں تو پھر ان کی باتیں بھی معتبر نہیں رہتیں۔ ہمیں ماننا چاہیے کہ ہم میں غلطیاں ہیں، ہمیں ماننا پڑے گا کہ ہم زیادتیاں کر رہے ہیں۔ یہ قوم ایک سوالیہ نشان ہے جس نے ایٹم بم تو بنا لیا لیکن کردار نہیں بنایا۔ آخر کب تک ہم ایٹم بم کا نعرہ لگاتے رہیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دفاع کیلئے بہت ضروری ہے، لیکن ہمیں تعلیم کے میدان میں بھی انقلاب لانا ہے۔

کردار کی تشکیل کی ضرورت

کردار بنانے کی پہلی ذمہ داری ماں کی ہوتی ہے۔ پھر استاد کی، پھر عالم کی اور پھر میڈیا کی۔ لیکن ان چاروں میں کوئی بھی کردار بنانے کے حوالے سے اپنا کردار ادا نہیں کر رہا۔ ہمیں ان چاروں میں سے کسی ایک کو بہتر کرنا ہے۔ بہت ضروری ہے کہ استاد کو بہتر کیا جائے، کیونکہ میڈیا ان لوگوں کے پاس ہے جن پر ہم بات نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے علما کو جدید نہیں کر سکے، ماں تعلیم یافتہ نہیں ہے، باپ کو فکر معاش سے فرصت نہیں۔ سکھوں کی تاریخ پڑھیں تو پتا چلتا ہے کہ رنجیت رانے رنجیت سنگھ کو کہا تھا کہ اگر تم نے قوم پر احسان کرنا ہے تو عورت کی تعلیم لازم کر دو۔ تمہاری قوم میں بھکاری پیدا نہیں ہوں گے۔

استاد وہ شخصیت ہے جس کا شاگرد ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اس نے ہزاروں لوگوں کو پڑھایا ہوتا ہے۔ اگر ان ہزاروں میں سے چند کو تیار کیا جائے تو انقلاب آ سکتا ہے۔ ہمیں ان اساتذہ کی ضرورت ہے جو اپنے پیشے سے عشق کرتے ہیں، جو اپنے استاد ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں لاکھوں کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں ہزاروں چاہئیں، مگر اندر سے بنے

ہوئے۔ اگر ایسے چند ہزار اساتذہ ہی مل جائیں تو وہ لاکھوں کروڑوں کو بدل دیں گے۔

کمرشلزم کا طوفان

ہمارے پاس کبھی پی ٹی وی کی صورت میں میڈیا کا ذریعہ ہوتا تھا جس میں کچھ نہ کچھ کردار سازی ہوتی تھی، لیکن اس وقت ہمارے پورے میڈیا میں شام ساڑھے پانچ سے ساڑھے سات تک بچوں کی تربیت کا کوئی پروگرام ہی نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ کمرشلزم ہے۔ یہی کمرشلزم اپنی مرضی کے مطابق میڈیا کو چلاتا ہے۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ اس ٹیکنالوجی کا مثبت استعمال کیسے کرنا ہے۔ اس کا مثبت استعمال تبھی ہوسکتا ہے کہ جب کوئی مقصد ہو۔ اگر مقصد ہو تو یہی ٹیکنالوجی فائدہ مند ہوتی ہے۔ اگر مقصد نہ ہو تو یہی ٹیکنالوجی نقصان دہ ہوتی ہے۔ ہم نے بہ حیثیت مجموعی، قوم میں نہ مقصد، نہ علم، نہ گرومنگ، نہ تہذیب اور نہ لٹریچر کی تحریک پیدا کی۔ جہاں کسی زمانے میں علمی حلقے لگا کرتے تھے، وہ جگہیں اب ویران ہیں۔ اس کی جگہ سوشل اور الیکٹرونک میڈیا ہمارے معاشرے کو چلا رہا ہے۔

استاد کی تربیت سب سے ضروری ہے

ہمیں آنے والی نسلوں کی بہتری کیلئے سب سے پہلے استاد کی تربیت کرنی پڑے گی۔ استاد بادشاہ بنانے والی شخصیت ہوتا ہے۔ جو بادشاہ بنانے کی قابلیت نہیں رکھتا، وہ کسی قابل نہیں ہے۔ ہمیں وہ استاد چاہیے جو فزکس کیمسٹری کے ساتھ ساتھ زندگی کے قوانین بھی پڑھائے تاکہ لیڈرز پیدا ہوں۔ اشفاق احمدؒ فرماتے ہیں، ''گونگلوؤں سے مٹی جھاڑنی چاہیے لیکن دیکھ لینا چاہیے کہیں گونگلو کم اور مٹی زیادہ نہ ہو جائے۔'' استاد اپنے اسٹائل میں بادشاہ ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ یہ بڑا انسان ہے، اس لیے جو بنانے والا ہے پہلے اسے بنانے کی ضرورت ہے۔ طلبہ پر کام کرنے کیلئے پہلے استاد پر کام کرنے کی ضرورت

ہے۔

جس شخص کی اپنی خودی بیدار نہیں، وہ دوسرے کی خودی کو کیسے بیدار کر سکے گا۔ حضرت علامہ اقبالؒ کے پاس ایک شخص شعر کا مطلب سمجھنے گیا۔ اس شعر میں قلندر کا لفظ آتا تھا۔ اس نے آپؒ سے کہا کہ مجھے یہ شعر سمجھ نہیں آیا۔ آپؒ نے فرمایا، اس شعر کو سمجھنے کیلئے آدھا قلندر بننا پڑتا ہے۔ جب تک تم اس کیفیت سے نہیں گزرو گے، تب تک یہ شعر سمجھ نہیں آئے گا۔ ہم باتیں کرتے ہیں کہ ہمیں آنے والی نسل کو تیار کرنا ہے لیکن خود تیار نہیں ہیں۔ اگر ہم وہ استاد نہیں دیں گے تو ہم کبھی بھی وہ انقلاب نہیں لا سکیں گے۔ پاکستان میں دیگیں بانٹنے سے کوئی انقلاب نہیں آئے گا، پاکستان میں جب بھی انقلاب آئے گا تو وہ شعور کا انقلاب ہوگا، وہ تربیت کا انقلاب ہوگا۔

ماضی، حال، مستقبل

''آپ وہی ہیں جو آپ نے آج منتخب کیا، نہ کہ ماضی میں جو انتخاب کیا!''

وین ڈبلیو ڈائر

دن تین طرح کے ہوتے ہیں۔ایک وہ جو گزر گیا، ایک وہ جس میں ہم رہتے ہیں، یعنی آج اور تیسرا وہ جو ابھی آنا ہے۔

ہم آج میں رہتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں۔ کچھ چیزیں گزرے ہوئے کل کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔ وہ کئی طرح کی ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ شعور نہیں تھا، منصوبہ بندی نہیں تھی، حادثات تھے، اچھی یادیں تھیں۔ان میں ہم اچھی یادوں کو یاد نہیں رکھتے، جبکہ بری یادوں کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ حال وہ لمحہ ہے جس میں زندگی گزارتے ہیں۔اگر وہ لمحہ اچھا ہے تو حال اچھا ہوگا اور اگر لمحہ برا ہے تو حال برا ہوگا۔حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''جو اپنے مستقبل سے اچھی امید وابستہ نہیں کرتا، اس نے اپنے حال کا بیڑا غرق کر دیا۔''

ماضی کی بیڑی

عموماً لوگ اپنے ماضی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔اس کے بعد مستقبل کی مینجمنٹ کو اہمیت دیتے ہیں۔ہم اپنا مستقبل تو اچھا بنانا چاہتے ہیں، لیکن اپنے پاؤں میں ماضی کی بیڑی باندھ کر رکھتے ہیں۔ جب یہ روش ہوتی ہے تو پھر اڑان اعلیٰ نہیں ہوتی۔ وہ بوجھ بن

جاتی ہے۔ ہم جب کسی کے گھر جاتے ہیں تو ایک ہی کمرے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ گھر کس طرح کا ہے، گھر والے کیسے ہیں، وہ کتنے مہذب ہیں۔ ہم کچن میں جاتے ہیں تو برتنوں کی ترتیب بتاتی ہے کہ وہ عورت کتنی منظم ہے جس کے ہاتھ میں یہ کچن ہے۔ جس طرح ایک فیکٹری میں تین بنیادی سیکشن ہوتے ہیں۔ ایک سیکشن میں خام مال ہوتا ہے۔ دوسرے سیکشن میں تیار چیزیں ہوتی ہیں جبکہ تیسرے سیکشن میں ضائع شدہ مال ہوتا ہے۔ یہ ضائع شدہ مال اس لیے رکھا ہوتا ہے کہ اسے بھی کہیں نہ کہیں کام آنا ہوتا ہے۔ جس طرح ضائع شدہ مال کو کام میں لایا جاتا ہے، بالکل اسی طرح، ہم ماضی کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھتے ہیں۔ جو شخص ماضی کے ساتھ یہ سلوک نہیں اپناتا، وہ خسارے کا سودا کرتا ہے۔ حدیث کا مفہوم ہے کہ "وہ شخص ہلاک ہے جس نے اپنے آج کو پچھلے دن سے بہتر نہیں بنایا۔"

اگر ہمیں ہوٹل سے کوئی چیز کھانی ہو تو ہم آرڈر دیں گے، پھر اس کی قیمت ادا کریں گے۔ لیکن جب چیز تیار ہو کر آ جائے اور ہم اسے نہ لیں تو یہ رویہ ہماری حماقت کو ظاہر کرے گا۔ یہی غلطی ہم زندگی میں کرتے ہیں۔ ہم نے غلطیوں کی اچھی خاصی قیمت ادا کی ہوتی ہے، لیکن ان سے سیکھتے کچھ نہیں ہیں۔ جب اپنی غلطیوں سے سیکھا نہیں ہوتا تو پھر وہی غلطیاں دہراتے رہتے ہیں۔ یوں ان کا وزن بڑھ بڑھ کر پچھتاوے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ماضی کا شکر

ہمیں اپنے ماضی کی اچھی یادوں کو بھی ساتھ رکھنا ہوتا ہے تاکہ شکر ادا ہو سکے۔ بعض اوقات اتنی بدبختی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ساری نعمتیں بھلا کر ایک آدھ پریشانی کو یاد رکھ کر اسی پر مرے جاتے ہیں۔ ماضی اس لیے بھی بڑا ضروری ہے کہ بقول سرفراز شاہ صاحب، "شکرگزاری کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ کبھی کبھی سونے سے پہلے پیچھے مڑ کر دیکھیں

کہ اللہ تعالیٰ نے کب کب کرم کیا۔ پھر بہت بڑا جواز بن جائے گا کہ میرا حق نہیں تھا، لیکن اس نے پھر بھی مجھے نوازا اور جگہ جگہ نوازا۔

ہمیں جتنی بہترین اصلاح اپنے ماضی سے مل سکتی ہے، اتنی شاید ا استاد سے بھی نہیں مل سکتی، گویا ماضی بذاتِ خود ایک بہترین استاد ہے۔ مگر اس کیلئے وہ ادراک ضروری ہے جو اصلاح لے سکے۔

ماضی کے اسباق

کبھی کبھی کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جایا کیجیے اور ماضی کے ان واقعات کو لکھا کیجیے جن سے سبق ملا ہو۔ پھر آپ ان اسباق کو سامنے رکھتے ہوئے ان پر عمل کیجیے۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو پھر سمجھ لیجیے کہ آپ نے ماضی کو ٹھکانے لگایا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ چیز پڑی ہو، لیکن اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ آدمی کتابوں سے اتنا نہیں سیکھتا، جتنا اپنے تجربے سے سیکھتا ہے۔ اس لیے اپنی زندگی کے تجربات کو ضرور سامنے رکھئے۔ جس کی زندگی میں نمو یا بہتری نہیں آ رہی، اس کا مطلب ہے کہ اس نے اپنے ماضی سے سیکھا نہیں ہے۔ بے شمار لوگ سوچے بغیر کام کرتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کام کر کے سوچتے ہیں۔ بے شمار ادوار ملیں گے جو بے مقصدیت کے نام ہوئے ہوں گے، کئی سال کا رونا ملے گا، یہ اقرار ملے گا کہ میں نے یہ سال ضائع کر دیا، یہ دن میں نے ضائع کر دیا، یہ گھنٹہ میں نے ضائع کر دیا، یہ لمحہ میں نے ضائع کر دیا۔ ممکن ہے، اس سے اللہ تعالیٰ ایک صفت یہ بھی پیدا کر دے کہ آپ سونے سے پہلے اپنا محاسبہ کرنا شروع کر دیں۔ اپنے گزرے ہوئے دن کا محاسبہ کرنا شروع کریں اور دیکھیں کہ آپ کی ذات سے کسی کو کوئی فائدہ ملا، کیا آپ نے کچھ نیا سیکھا؟

اپنی زندگی کے وہ تلخ تجربات جو آپ کی شخصیت پر غلط اثرات مرتب کر رہے ہیں یا

جن کی وجہ سے آپ کی نفسیات تباہ ہو رہی ہے، انھیں نکال فارغ کریں، کیونکہ وہ رکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ ماضی کے یہ تجربات آپ کو آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ دو شخص کسی جزیرے پر چلے گئے اور وہاں مٹر گشت کرتے رہے، یہاں تک کہ رات ہوگئی۔ رات کے آخری پہر میں انھوں نے سوچا کہ اب ہمیں واپس جانا چاہیے۔ وہ اپنی کشتی میں بیٹھے اور چپو چلانا شروع کر دیا۔ کشتی چلاتے چلاتے صبح ہوگئی۔ روشنی پھیلی تو انھوں نے دیکھا کہ کشتی تو وہیں کی وہیں کھڑی ہے۔ کیوں؟ انھوں نے کشتی کی وہ رسی کھولی ہی نہیں تھی جو درخت کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ اپنی زندگی میں ماضی کی وہ رسی نہیں کھولتے جو انھوں نے ماضی کے فضول خیالات و واقعات سے باندھی ہوتی ہے۔ جبکہ آگے بڑھنے کیلئے ضرورت ہوتی ہے کہ ماضی کی یادوں اور فضول واقعات کی رسی کو کھول کر اپنا سفر شروع کیا جائے۔

آگے بڑھنے اور کچھ کرنے کیلئے ماضی سے نکلنا ضروری ہے۔ ماضی سے جڑے رہنا ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ یہ جو آپ کی زندگی میں فرضی قسم کا ماضی ہے کہ ہم تو نوابوں کی اولاد ہیں، ہمارا آدھا خاندان پاکستان بنانے میں شامل تھا، ہمارا اتنا شان دار ماضی ہے، ان سب کہانیوں سے نکلئے۔ اصل یہ ہے کہ آپ اب کیا ہیں۔ عظیم تو وہ ہے جو اگرچہ امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتا ہو، لیکن کامیابی اس کی ذاتی ہو۔

حال کی دھجیاں

حال بھی عجیب لمحہ ہے۔ جیسے جیسے ہم اس کو حال کہتے جاتے ہیں، ویسے ویسے وہ ماضی بنتا جاتا ہے۔ حال بہت ہی محدود اور چھوٹا سا لمحہ ہوتا ہے۔ لوگ اپنے اس چھوٹے سے لمحے کو ضائع کرتے ہیں۔ بعض لوگ اپنا ایک پاؤں ماضی میں رکھتے ہیں اور دوسرا مستقبل میں رکھتے ہیں، جبکہ یہ حال سے فارغ ہوتے ہیں۔

لوگ سب سے زیادہ اپنے حال کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔ مثلاً شادیوں پر عورتیں اپنے

بڑوں کو رو رہی ہوتی ہیں اور اپنے حال کو خراب کر رہی ہوتی ہیں۔ جو اپنے حال کو خراب کرنے والا شخص ہے، اس کے پاس دو ہی مسئلے ہوتے ہیں۔ ماضی کی پشیمانیاں یا مستقبل کے خدشے۔ کمال یہ ہے کہ حال کو بچایا جائے اور اسے بہترین بنایا جائے، کیوں کہ ماضی تو گزر گیا جواب آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ مستقبل ابھی دور ہے، نہیں معلوم کب آئے گا۔ اب حال ہی وہ زمانہ ہے کہ جو آپ کے ہاتھ میں ہے اور جسے آپ کنٹرول کر سکتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ جس لمحے میں ہیں، اسی لمحے میں رہیں اور اس سے لطف اٹھائیں۔ اس لمحے آپ جس حالت میں بھی ہیں، اس پر متوجہ ہوں اور اسے قبول کر لیں۔

سانس روکیے، حال میں آئیے

حال میں آنے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ ابھی اپنی سانس روکیے۔ سانس روک کر غور کیجیے کہ آپ اس وقت کیا محسوس کر رہے ہیں۔ جب آپ سانس روکتے ہیں تو خیال در خیال کا سلسلہ رک جاتا ہے، اس لیے آپ سانس روک کر موجودہ لمحے کا مزہ لے کر دیکھئے۔ آج یہ ایک بہت بڑی سائنس ہے جس کی تربیت دنیا کی بڑی یونیورسٹیز میں دی جا رہی ہے۔

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ حال درحقیقت قدرت کی طرف سے ڈش ہوتی ہے اور قدرت یہ تحفے کے طور پر انسان کو دیتی ہے۔ اگر انسان اس تحفے سے لطف اندوز نہیں ہوتا تو پھر وہ اپنے آنے والے کل کو بھی خوش گوار نہیں کر سکتا۔ اپنے حال سے لطف اندوز ہونے والے کو "صاحب حال" بھی کہا جاتا ہے اور صاحب حال وہ ہوتا ہے جس کو اپنے حال پر گرفت ہوتی ہے۔ حال پر گرفت پانے کی بہترین مشق نماز ہے۔ مگر آج نمازی اپنی نماز میں بھی ماضی یا مستقبل کی سوچوں میں گھرا ہوا ملتا ہے۔ اگر وہ صاحب حال ہو جائے تو وہ دورانِ نماز اللہ سے ہم کلام ہونے کا لطف اٹھائے۔

ایک کپ کا لطف

حال میں رہنے کو اپنی عادت بنایئے۔ اپنی عادت میں حال میں آیئے۔ اپنی خوشی میں حال میں آیئے۔ اپنی اس کیفیت میں آیئے جو حال پر ہو۔ جاوید چوہدری کہتے ہیں، "جو اپنے بیس روپے کا چائے کا کپ انجوائے کرسکتا ہے، وہ اپنے حال کو گرفت کرسکتا ہے۔" ہم چائے کے ایک کپ کا مزہ نہیں لے سکتے اور کہتے ہیں کہ جب ہمارے پاس گاڑی آئے گی، زیادہ پیسہ آئے گا، تب خوشی ملے گی۔

مستقبل ایک آنے والی حقیقت ہے۔ مستقبل کو بہتر بنانے کیلئے حال میں خواب بنانے پڑتے ہیں۔ جس نے شعوری کوشش کر کے اپنے خواب بنائے، اس کا مستقبل بہترین ہوتا ہے۔ جو آدمی یہ کہتا ہے کہ "پتا نہیں ہماری کب سنی جائے گی" وہ سخت خطرے میں ہے۔ وہ ذات تو ہر وقت سنتی ہے۔ جب آدمی یہ جملہ کہتا ہے تو اس فقرے میں شرط لگ جاتی ہے کہ شاید وہ کبھی سنے گا ہی نہیں۔ جب یہ شرط لگا دی جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے سمیع و بصیر ہونے کو گویا کہ چیلنج کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس کو سخت ناپسند کرتی ہے، کیوں کہ وہ تو کہتا ہے کہ میں ہر وقت سنتا ہوں۔

ایک اژدہا ایک پیر کا مرید ہو گیا۔ وہ اپنے مرشد سے کہنے لگا، میرے لیے بھی کوئی حکم فرمائیں۔ پیر صاحب نے کہا، تیرے لیے صرف ایک ہی حکم ہے کہ کسی کو ڈسنا نہیں۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے۔ باہر گیا تو سوچنے لگا کہ اب تو میں نے بیعت کر لی ہے، اب کسی کو ڈسوں گا نہیں۔ وہ جیسے ہی باہر نکلا، لوگوں نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے آپ کو بچاتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں بھی لوگوں کا وہی سلوک رہا۔ غرض وہ جدھر بھی جاتا، لوگ اسے مارتے۔ وہ واپس پیر صاحب کے پاس آیا اور انھیں کہنے لگا، پیر صاحب، میں تو رُل گیا ہوں۔ جدھر بھی جاتا ہوں، میرے ساتھ بہت برا سلوک ہوتا ہے۔ پیر صاحب نے کہا، میں

نے نہیں صرف ڈسنے سے منع کیا تھا، رعب ڈالنے سے نہیں، یعنی کچھ حصہ رکھنا ہوتا ہے۔
ماضی کا کچھ حصہ ایسا ہوتا ہے جو مستقبل میں کام آتا ہے۔ اسے سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

مستقبل کے خواب

اپنے مستقبل کے حوالے سے خواب بنائیے، مقصد بنائیے، اپنے ماضی کی سمجھ سے کچھ فیصلے کیجیے۔ ہم صرف اتنا ہی دیکھ سکتے ہیں جتنی ہماری گاڑی کی ہیڈ لائٹ ہوتی ہے۔ ہیڈلائٹ سے مراد ہمارے اندر کے فہم کی روشنی ہے۔ اگر ہمارے اندر یہ روشنی پیدا نہیں ہوئی تو ہم زیادہ دور تک دیکھ نہیں سکتے، بلکہ بعض لوگ تو چند قدم آگے کا نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے ہمیں اپنے اندر دور اندیشی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا بہترین اوزار ماضی ہے۔ جو آدمی تنہا بیٹھ کر اپنے آپ کو بے عزت کر سکتا ہے، وہ بہت اعلیٰ انسان ہے، کیونکہ پھر اسے دنیا بے عزت نہیں کر سکتی۔ اپنا بھرم قائم رکھنے کیلئے ماضی سے کچھ اچھا نکالیے۔ اپنے مستقبل میں کچھ نیا داخل کیجیے۔ ماضی کی ان چیزوں اور یادوں کو چھوڑ دیجیے جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ اپنے مستقبل کے بارے میں خیر کا خواب دیکھیں اور وہ خیر کا خواب دوسروں کیلئے ہو۔

جو آج سے ایک نیکی شروع کرتا ہے اور پھر اس پر استقامت بھی قائم کرتا ہے اور اسے بڑی نیکی میں تبدیل کرتا ہے تو پھر وہ اعلیٰ انسان ہے۔ آج جس نے آم کا پودا لگایا ہے، لیکن وہ دعائیں امرود کی مانگ رہا ہے تو کبھی امرود نہیں لگیں گے۔ آج جو چیزیں بونا چاہتے ہیں انھیں شعوری طور پر بونا شروع کیجیے تا کہ ان کے پھل مستقبل میں مل سکیں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ برکت بھی ڈالے گا اور خیر بھی۔ پھر آنے والا وقت بہت اعلیٰ ہوگا۔

دانہ پانی

"جو شخص سیکھنا چھوڑ دیتا ہے، اس کی عمر کتنی ہی کم ہو، وہ بوڑھا ہے؛
اور جو سیکھتا رہتا ہے، وہ جوان ہے!"

ہنری فورڈ

اکثر بچے اسکول میں چیونگم کھاتے ہیں۔ جب اس کی مٹھاس ختم ہو جاتی ہے تو اس وقت انھیں سمجھ نہیں آتا کہ اب اس کا کیا کیا جائے۔ چنانچہ اگلے ہی لمحے وہ اسے منہ سے نکالتے ہیں اور بنچ پر لگا دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ چیونگم کئی بچوں کی یونیفارم پر لگتی ہے انھیں خراب کرتی ہے۔ کچھ عرصے بعد چیونگم اتر تو جاتی ہے، لیکن داغ چھوڑ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح ہماری زندگی میں بھی کچھ واقعات یادداشت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہم جتنا چاہیں، انھیں نکالنے کی کوشش کریں، وہ نہیں جاتے۔ اگر وہ واقعات نکل بھی جائیں تو ان واقعات سے جو کچھ سیکھا ہوتا ہے، وہ نہیں نکلتا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب ہمارے ٹیم ممبرز کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ بس یہی کوئی سات آٹھ لوگ تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ چھٹیوں کی وجہ سے ہماری اکیڈمی صبح کے وقت کھلا کرتی تھی۔ جب ہم پڑھا کر فارغ ہو جاتے تو گیارہ بج چکے ہوتے تھے۔ تب جا کر ہم ناشتہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ناشتا بچ گیا۔ ایک چائے کا کپ بھی ساتھ تھا۔ ہم انتظار کر رہے تھے کہ اس بچے ہوئے ناشتے کا کیا کیا جائے۔ اسی دوران اکیڈمی کے باہر سے مکئی کے دانے بیچنے والے خان صاحب گزرے۔

اس وقت میرے ذہن میں خیال آیا، کیوں نا اس سے پوچھا جائے۔ میں نے خان صاحب کے قریب جا کر کہا، آپ نے ناشتہ کیا ہوا ہے؟ وہ میرا منہ دیکھنے لگے اور کہنے لگے کہ میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔ میں نے پھر پوچھا، آپ نے ناشتہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا، ہاں صبح سات بجے کا کیا ہوا ہے۔ میں نے کہا، اگر آپ چاہیں تو ہمارے پاس ایک چائے کا کپ اور ناشتہ ہے، وہ آپ لے سکتے ہیں۔ خان صاحب میری بات مان گئے اور ناشتا کرلیا۔ جب خان صاحب ناشتہ کر کے چلے گئے تو یہ واقعہ میرے دماغ میں چیونگم کی طرح چپک گیا۔

پھر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں گھر آیا تو مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس وقت گھر میں جو کھانا پکا ہوا تھا، اسے کھانے کو جی نہ چاہا تو میں گھر سے نکلا، گاڑی میں بیٹھا اور ایسے ہی شہر میں گھومنا شروع کر دیا۔ جب مجھے زیادہ بھوک لگی تو میں چوک یتیم خانہ پر موجود ایک ہوٹل پر چلا گیا اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔ جیسے ہی میرے سامنے کھانا آیا، ایک دم میرے ذہن میں خیال آیا کہ تم نے تو زندگی میں کبھی اکیلے کھانا نہیں کھایا۔ میں نے اسی وقت آسمان کی طرف دیکھا تو اس دوران مجھے ایک شخص کی آواز آئی، ”سر، میں نے کھانا نہیں کھایا۔ میری مدد کر دیں۔“ میں نے اسے کہا، بیٹھ جاؤ۔ اور یوں ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ وہ کھانا کھا کر چلا گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ میں نے بل ادا کیا اور چل پڑا۔ اسی اثنا میں مجھے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا جملہ یاد آیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ”جس پہ احسان کرو، اس کے ساتھ نظر بھی نہ ملاؤ کہ کہیں وہ شرمندہ نہ ہو جائے۔“ یہ واقعہ بھی میرے ذہن میں چیونگم کی طرح چپک گیا۔

مجھے جب بھی یہ واقعات یاد آتے ہیں تو میرے ذہن میں خیال آتا ہے کہ انسان کا رزق، انسان کا دانہ پانی اللہ تعالیٰ نے کہیں نہ کہیں لکھ رکھا ہوتا ہے۔ انسان کسی نہ کسی بہانے سے وہاں پہنچ جاتا ہے اور اپنا رزق لے لیتا ہے۔

جس طرح رزق کا دانہ پانی ہوتا ہے، بالکل اسی طرح انسان کی زندگی میں علم کا بھی دانہ پانی ہوتا ہے۔ وہ دانہ پانی انسان کو کہیں نہ کہیں سے ملنا ضرور ہوتا ہے۔ قدرت نے جب انسان کو سکھانا ہوتا ہے وہ کسی بہانے سے اسے وہاں لے جاتی ہے اور وہ وہاں سے سبق لے لیتا ہے۔ انسان بڑے مزے سے زندگی گزار رہا ہوتا ہے، اچانک اس کی زندگی میں ایک شخص داخل ہوتا ہے اور اس کی زندگی بدل جاتی ہے۔ انسان کو زندگی میں بے شمار ایسے سبق ملتے ہیں جو اس کے وہم و گمان میں نہیں ہوتے۔ لیکن وہ اس کی زندگی کو بدل دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس وقت قدرت مہربان ہوتی ہے۔ حضرت واصف علی واصف ؒ فرماتے ہیں، ''آج تک جس نے بھی خدا کی تلاش کی ہے، اس کی تلاش کسی انسان پر ختم ہوئی ہے۔''

اللہ کی مدد

ایک شخص پانی میں ڈوبنے لگا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اس کی دعا قبول ہوئی۔ اسی وقت کشتی پر کچھ لوگ اسے بچانے کیلئے آ گئے۔ انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تو اس ڈوبتے شخص نے اپنا ہاتھ انھیں نہیں دیا اور بولا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے مدد لینی ہے، کسی انسان سے نہیں لینی۔ وہ چلے جاتے ہیں۔ وہ پھر دعا کرتا ہے تو دو تین کشتیاں مزید اسے بچانے آ جاتی ہیں۔ لیکن وہ ان کی مدد لینے سے بھی انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد لوں گا۔ وہ بھی چلے جاتے ہیں۔ وہ پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے تو اس بار اسے بچانے کیلئے ہیلی کاپٹر آ جاتا ہے۔ رسی پھینکی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسے پکڑو، ہم تمہیں اوپر اٹھا لیں گے۔ وہ رسی پیچھے کر دیتا ہے اور یہی کہتا ہے کہ میں تو صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگوں گا۔ ہیلی کاپٹر چلا جاتا ہے اور وہ شخص ڈوب کر مر جاتا ہے۔ مرنے کے بعد جب وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے گلہ کرتا ہے کہ تو نے میری

مدد کیوں نہیں کی۔ میں نے تجھے کتنی ہی بار پکارا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں کئی بار تیری مدد کو آیا تھا۔ اس نے کہا نہیں، وہ تو دوسرے لوگ تھے جو مجھے بچانے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وہ میں نے ہی تو بھیجے تھے۔

بات یہ ہے کہ اللہ جب بھی مدد کرتا ہے تو وہ خود نہیں کرتا، اس کی مدد بھی مختلف اسباب کی صورت میں ہوتی ہے۔ ہم تک اگر کوئی شے آتی ہے تو اس کا کوئی ذریعہ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کوئی سبق دینا ہوتا ہے تو پھر وہ کوئی بہانہ بنا دیتا ہے۔

علم کا بھی دانہ پانی ہے۔ ممکن ہے، ہماری زندگی میں ہمارا کوئی عزیز آجائے جس کے ساتھ روزانہ ہمارا اٹھنا بیٹھنا شروع ہو جائے اور یوں اس سے علم ملنا شروع ہو جائے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو ایسے لوگ مل جاتے ہیں جن کا تجربہ ستر ستر سال کا ہوتا ہے اور وہ تجربہ اسے دنوں میں مل جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی سے کوئی جملہ مل جاتا ہے اور اس جملے سے کسی بڑی مشکل کو حل کرنے کا راستہ مل جاتا ہے۔

پھر وہ اس کو اپنا مرشد ماننا شروع کر دیتا ہے۔ وہ مزید سیکھنے کیلئے اس کے پاس جاتا ہے، لیکن کچھ نہیں ملتا۔ جب اس کی وجہ پوچھی جاتی ہے تو جواب ملتا ہے کہ بس اس وقت قدرت نے میرے منہ سے کہلوایا تھا۔ قدرت اشارے دیتی ہے۔ وہ جب بھی رحم کھاتی ہے تو آدمی کو محسوس ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ مجھے ان باتوں پر عمل کرنا چاہیے۔ میں بہت آگے نکل سکتا ہوں۔

دانش کا تعلق تجربہ سے ہے

شعوری زندگی میں، میرے ساتھ یہ معاملہ ہوا کہ میرے جتنے بھی دوست بنے، اُن کی عمر مجھ سے دوگنی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے سیکھنے کی تمنا بہت تھی۔ مجھے علم کا بہت زیادہ شوق ہے اور مجھے وزڈم کی ضرورت تھی جبکہ وزڈم اکثر سفید بالوں اور تجربوں کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مہربان ہوتا ہے تو زندگی میں وہ لوگ آجاتے ہیں جن کے پاس وزڈم بھی ہوتا

ہے، علم بھی ہوتا ہے، شعور بھی ہوتا ہے اور آگہی بھی ہوتی ہے۔ زندگی میں ان درختوں کی قدر ضرور کیجیے جنھوں نے آپ کو چھاؤں دی ہے اور پھل دیے ہیں۔ یہ بات بہت بڑی ہے کہ ہے کہ کسی کی زندگی میں ایسے درخت ہوں جو اس کی زندگی میں سخت دھوپ کے وقت چھاؤں بن گئے۔ یہ درخت والدین بھی ہو سکتے ہیں، عزیز رشتہ دار بھی ہو سکتے ہیں اور استاد بھی ہو سکتے ہیں۔ ہماری زندگی میں جس نے چھاؤں اور پھل دیئے ہیں، وہ ہمارے لیے اہم ہونا چاہیے۔ جنھوں نے ہمیں بے لوث وقت دیا ہے ان کی قدر ضرور کرنی چاہیے۔

اولاد کی ذمے داری

جب میں چھوٹا تھا تو اس وقت ہمارے مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے، اس لیے والدین زیادہ شاپنگ نہیں کرا پاتے تھے۔ صرف عید کی شاپنگ ہی ہوا کرتی تھی۔ اسکول کا یونیفارم بھی ایک ہی دفعہ لیتے تھے، لیکن جیسے ہی زندگی نے رخ بدلا، میں کمانے لگا تو حالات اچھے ہو گئے۔ پھر میں نے جب بھی بیوی بچوں کیلئے شاپنگ کی تو اپنے والدین کو ساتھ لے کر ضرور گیا۔ یہ اس بات کا احساس ہے کہ انھوں نے ہمیں تب پالا جب حالات اچھے نہیں تھے۔ اب میری ذمے داری بنتی ہے کہ میں بھی ان کی قدر کروں۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے سر کی کھوپڑی اتنی نرم ہوتی ہے کہ اگر وہاں انگلی رکھ کر دبایا جائے تو انگلی اندر چلی جائے گی۔ ذرا سوچیے، جب بچہ اتنا نازک ہوتا ہے تو ماں اس وقت بھی بچے کو پالتی ہے۔ اس کی اتنی محبت اور شفقت ہوتی ہے کہ انگلی نہیں لگنے دیتی۔ وہ اسے پال کر جوان کرتی ہے۔ پھر بچے کی ذمے داری بنتی ہے کہ جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو تو وہ ان کی قدر کرے۔ لیکن جب ہم بڑے ہوتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ماں عقلمند کیوں نہیں ہے، والد اتنے سمجھدار کیوں نہیں ہے۔ انہیں سمجھدار ہونا چاہیے۔ ماں باپ سمجھدار تھے، تبھی تو تمہیں اتنا بڑا کر دیا۔ یاد رکھیے، دنیا کا سب سے اچھا باپ اپنا باپ ہوتا ہے اور

سب سے اچھی ماں اپنی ماں ہوتی ہے۔ ہمارے والدین کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ہمارے والدین ہیں۔ اسی بات پر ان کا ادب کرنا چاہیے۔

قدر کرنا سیکھیے، آپ کی قدر کی جائے گی

میرے ایک استاد ہیں۔ میں جب بھی ان کی طرف گیا، کبھی خالی ہاتھ نہیں گیا۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ضرور لے کر گیا۔ وہ ہمیشہ گلہ کرتے کہ اس کی کیا ضرورت تھی۔ میں ہمیشہ دل میں سوچتا کہ جو کچھ انھوں نے مجھے دیا ہے، اس کے مقابلے میں یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ ہے ویلیو دینا، قدر کرنا۔ اگر خود عقل نہیں آئی کہ میں نے ان سے کیا پایا ہے تو پھر جو کچھ سیکھا، اس کی بھی قدر نہیں ہو گی۔ وہ لوگ جنھوں نے ہمیں قیمتی بنایا، کھوٹے سے کھرا کیا تو پھر فرض بنتا ہے کہ ان کی قدر کریں۔ مٹھائی، کیک بسکٹ...ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اصل قیمت خلوص کی ہوتی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر دو تو امیر کبیر لوگوں نے بہت زیادہ پیسہ دیا۔ ایک بڑھیا آئی۔ اس کے پاس صرف ایک روپیہ تھا۔ اس نے وہ آپ علیہ السلام کو پیش کیا اور کہا کہ اسے قبول کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا، اے اللہ، آج جو کچھ تیرے نام پر اکٹھا کیا ہے، اس میں تجھے سب سے اچھا کیا لگا؟ جواب ملا، بڑھیا کا ایک روپیہ۔ آپ علیہ السلام نے کہا، وہ تو سب سے کم تھا۔ جواب ملا نہیں۔ بڑھیا کے پاس تھا ہی ایک روپیہ جو اس نے مجھے دے دیا۔

ہماری زندگی میں بے شمار چیزیں ایسی آتی ہیں جو ہمارا حق نہیں ہوتیں، لیکن پھر بھی ہمیں مل جاتی ہیں۔ ہمیں اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور یہ شکر صرف لفظوں کا نہیں ہوتا بلکہ شکریہ احساس کا ہوتا ہے، عزت سے ہوتا ہے اور اہمیت دینے سے ہوتا ہے۔

سیلف امیج

''انسان جیسا سوچتا ہے ویسے ہی ہوتے ہیں، انسان جیسا ہے ویسا ہی رویہ ہوتا ہے''

مارکس اوریلیس

لوگوں کی کارکردگی کا دارومدار چونکہ حالات پر ہوتا ہے اس میں اہم عامل یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو کس طرح دیکھتے ہیں۔ گلاس میں آدھا پانی ہوتا ہے اور آدھا خالی ہوتا ہے۔ کسی کو آدھا خالی لگتا ہے تو کسی کو آدھا بھرا ہوا لگتا ہے۔ ایک ہی چیز کے دو مختلف معنی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر آدمی اپنے بارے میں مختلف سوچ رکھتا ہے اور ذہن میں اپنے بارے میں ایک تصویر بنا کر رکھتا ہے۔ نفسیات میں اسے ''سیلف امیج'' (Self image) کہا جاتا ہے یعنی اپنی ذات کا وہ خاکہ جو آپ اپنے ذہن میں بناتے ہیں۔

خود کو منوانے کا شوق

یہ سیلف امیج جتنا معیاری اور اعلیٰ ہوتا ہے، اتنا ہی وہ شخص زندگی میں ترقی کرتا ہے۔ دنیا میں آگے وہ بڑھتا ہے جسے اپنا آپ منوانے اور ثابت کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ دنیا کے جتنے بڑے نام ہیں، وہ اس لیے زندہ ہیں کہ ان میں اپنے آپ کو منوانے کا شوق دوسروں سے زیادہ تھا۔ یہ مادہ جس میں جتنا زیادہ ہوتا ہے اس کی چڑھائی اتنی اونچی ہوتی ہے اس کا کام اتنا اچھا ہوتا ہے اور وہ اتنا ہی ترقی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر آپریشن سے پہلے بے ہوشی کا ٹیکہ لگایا جاتا ہے کہ تکلیف نہ ہو۔ اگر اس کی مقدار کم ہو تو پھر تکلیف ہوگی۔ اگر مقدار

بڑھا دی جائے تو تکلیف نہیں ہوگی۔ بالکل اسی طرح، اپنے آپ کو منوانے کا مادہ جتنا زیادہ ہوگا، کامیابی کے راستے میں آنے والی مشکلات سے تکلیفیں اتنی ہی کم ہوں گی اور کوئی راستے کی رکاوٹ آپ کو روک نہیں سکے گی۔

آپ جیسا کوئی نہیں

زندگی میں دو ہی کام ہو سکتے ہیں۔ انسان مسئلے کو بڑا سمجھتا ہے یا پھر اپنے آپ کو مسئلے سے بڑا سمجھتا ہے۔ جس شخص کو زندگی میں مسئلے چھوٹے لگتے ہیں، اس کیلئے ترقی کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ جو لوگ مسئلوں کو بہت کچھ سمجھتے ہیں، اصل میں انھوں نے اپنے آپ کو بہت چھوٹا کیا ہوتا ہے حالانکہ وہ چھوٹے نہیں ہوتے بلکہ تصور میں اپنے آپ کو چھوٹا کر لیتے ہیں۔ اپنے بارے میں تصور کو بڑا کرنا چاہیے اور وہ تب بڑا ہوتا ہے کہ جب پتا لگتا ہے کہ آٹھ ارب کی آبادی میں ایک بھی مجھ جیسا نہیں ہے۔

آج تک جتنی دنیا ہو کر جا چکی ہے، جتنی ہے اور جتنی آنی ہے، اس میں ہم جیسا نہ کوئی آیا تھا، نہ ہے اور نہ آئے گا۔ ہمیں ایک چانس ملا ہے اور ہم اس دنیا میں ایک بار آئے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ یقین ہونا چاہیے کہ مجھے اپنے آپ کو منوانا ہے۔ جن لوگوں کو شہرت مل جاتی ہے، ان میں یہ مادہ زیادہ پایا جاتا ہے۔

خود کو مانئے

اگر ہم اپنے آپ کو نہیں مانتے تو پھر دنیا ہمیں نہیں مانے گی۔ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو مانیں اور یہ یقین کریں کہ ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ جب یہ یقین ہو جاتا ہے تو پھر مستقبل کی تصویر مختلف بنتی ہے۔

جو لوگ حق تلفی کرتے ہیں، زیادتی کرتے ہیں، بداخلاق ہوتے ہیں، ان کا سیلف امیج

بہت کمزور ہوتا ہے۔ ہماری دو غذائیں ہوتی ہیں۔ ایک جسم کی اور ایک ہمارے اندر کی۔ اندر کی غذا ہمارا اچھا اخلاق ہوتا ہے۔ جو لوگ اچھے کام کرتے ہیں، ان کا سیلف امیج مضبوط ہوتا ہے۔ ان میں خود اعتمادی زیادہ ہوتی ہے۔ ان میں کچھ کر گزرنے کا زیادہ جذبہ ہوتا ہے۔ سیلف امیج تب ترقی کرتا ہے کہ جب ہم اچھے کام کرتے ہیں۔ جو لوگ عبادت کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، قرآن پاک پڑھتے ہیں یا دیگر اچھے کام کرتے ہیں، ان کا سیلف امیج زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے مقاصد واضح ہوتے ہیں، ان کا سیلف امیج بھی مضبوط ہوتا ہے، یعنی اگر اپنے سیلف امیج کو بہتر کرنا ہے تو بہتر کام کرنے پڑیں گے۔

خود کلامی

سب سے زیادہ انسان اپنے اندر بولتا اور سمجھتا ہے۔ کان نہیں سنتے، اندر سنتا ہے۔ اندر کہتا ہے کہ تم وہ نہیں ہو جو دنیا تمہیں کہہ رہی ہے۔ مثال کے طور پر، ایک بچے پر الزام لگا کہ اس نے اس کو محسوس نہیں کیا جبکہ دوسرے بچے پر ابھی شک کی نظر سے ہی دیکھا گیا تو اس نے فوری طور پر برتن توڑ کر اس کا اظہار کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سیلف امیج میں چور نہیں ہے جس کی وجہ سے شک کی تکلیف ہوئی۔ جب اندر کو غذا ملتی ہے تو سیلف امیج طاقتور ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ طاقتور ہوتے ہوتے اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ پھر زمانے پچھاڑ دیتا ہے اور زمانہ اس کی صلاحیتوں کو ماننا شروع کر دیتا ہے۔

اپنا آپ منوانا پڑتا ہے۔ یہ کوئی بات نہیں ہے کہ مجھے مانو۔ بعض اوقات یہ جذبہ کہ مجھے کچھ کر کے دکھانا ہے، اس کا پتا پڑھائی کے رزلٹ میں لگتا ہے۔ جو لائق بچہ ہوتا ہے، اس میں عام بچوں والی عادتیں نہیں ہوتیں، اس لیے کہ اس نے اپنا آپ منوایا ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑا ڈاکو تھا۔ اس کو جب سزائے موت ہونے لگی تو اس سے آخری خواہش پوچھی گئی تو اس نے کہا کہ پہلے میری ماں کو پھانسی دو۔ اس سے پوچھا گیا، کیوں؟ اس نے کہا، جب

میں چھوٹا سا تھا تو میں نے انڈے چوری کیے تھے۔ اس وقت میری ماں نے مجھے روکا نہیں تھا بلکہ شاباشی دی تھی۔ اگر اس وقت وہ مجھے روک لیتی تو آج میں اتنا بڑا مجرم نہ ہوتا۔

چھوٹی غلطی، چھوٹی نہیں

جن لوگوں کو چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر نہیں روکا جاتا، ان کا سیلف امیج کمزور ہو جاتا ہے۔ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ آخر کار مر جاتا ہے۔ جب مر جاتا ہے تو پھر اس میں اچھائی اور برائی کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کسی شخص میں اچھائی برائی کی تمیز ختم ہو چکی ہو تو اس کیلئے چوری کرنا، ڈاکا ڈالنا یا کوئی بھی برا کام کرنا مشکل نہیں رہتا اور وہ ایک کے بعد دوسرا گناہ کرتا چلا جاتا ہے۔

اچھے آدمی کیلئے برا کام کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، جبکہ برے کیلئے اچھا کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اچھے کیلئے اچھائی بڑی آسان ہے، برے کیلئے برائی آسان ہے۔ آدمی کا سیلف امیج اسے باور کراتا ہے کہ وہ اچھا ہے یا برا ہے۔

کھلاڑیوں کا سیلف امیج بہت مضبوط ہوتا ہے، کیونکہ انھوں نے میدان میں جیت کر دکھایا ہوتا ہے۔ اگر کوئی کھلاڑی نیشنل لیول کا چیمپین بن جائے تو وہ محسوس کرے گا کہ ملک میں مجھ جیسا کوئی نہیں ہے۔ جب یہ پتا لگ جاتا ہے کہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں ہے تو پھر سیلف امیج طاقتور ہو جاتا ہے۔ جب آدمی اپنے کام میں کامیابی حاصل کرنے لگتا ہے تو اس کے اعتماد میں اضافہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر اس کو ثابت کرنے کا بار بار موقع ملتا ہے۔ جن لوگوں کو ثابت کرنے کا موقع نہیں ملتا یا ثابت نہیں کرتے، وہ ترقی نہیں کرتے۔

خوبی تلاش کیجیے

شاباشی سیلف امیج کی غذا ہے۔ سیلف امیج کو قوی کرنے کیلئے تعریف بہت ضروری

ہے۔اچھے کام کے بعد تعریف اس کام کی قیمت ہوتی ہے جیسے تحفے کی قیمت شکریہ ہے۔ جب ثابت کرنے کا موقع ملے تو اسے ضرور حاصل کرنا چاہیے، کیونکہ قدرت ہمیں کئی بار یہ موقع دیتی ہے۔آئن سٹائن کہتا ہے، بڑا استاد وہ ہے جو میری خوبی مجھے بتائے اور پھر اس خوبی کو پالش کردے۔جس نے آپ کو آپ کا اپنا آپ دکھا دیا، وہ آپ کا محسن ہے۔

ہمارے ہاں بچوں کے سیلف امیج اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ وہ غلط کاموں کی طرف چلے جاتے ہیں۔اسی وجہ سے آج معاشرے میں ہمیں منافقت نظر آتی ہے۔ہم زندگی میں لوگوں کا انتخاب ان کی ظاہری شکل وصورت کو دیکھ کر کرتے ہیں جبکہ ہمیں کردار کی وجہ سے انتخاب کرنا چاہیے۔شکل وصورت نظر آرہی ہوتی ہے، لیکن کردار اندر ہوتا ہے۔اچھا کردار کئی لوگوں کا ہوتا ہے اور کئی لوگوں کا نہیں ہوتا۔

کبھی کسی کی تذلیل نہیں کرنی چاہیے۔اگر کسی نے کوئی اچھا کام کیا ہے تو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیے۔دوسروں کے اچھے کاموں میں اگر ساتھ نہیں چل سکتے تو اُن کے بارے میں حسن خیال ضرور رکھنا چاہیے۔

غیر ضروری چیزیں

اپنے بارے میں ضرور غور کرنا چاہیے، کیونکہ جب آدمی اپنے بارے میں غور کرنا شروع کردیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اندر سے ٹھیک کرنا شروع کرتا ہے۔پھر وہ اپنے اندر سے غیر ضروری چیزیں نکالنا شروع کردیتا ہے۔علم، عقل اور فہم کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ آدمی غیر ضروری چیزوں سے احتراز کرے۔یوں وہ اپنے آپ کو ہلکا کرلیتا ہے۔

جب دل اور زبان ایک ہوجاتے ہیں تو پھر مومن والا مقام آجاتا ہے، کیونکہ مومن وہ ہوتا ہے جس کا قول اور فعل ایک ہوتا ہے۔وہ اوپر سے نہیں کہتا ہے، بلکہ دل سے کہتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمان کا مفہوم ہے کہ درحقیقت اندھے وہ نہیں ہیں جن کی

آنکھیں نہیں ہیں، اندھے وہ ہیں جو دل کے اندھے ہیں۔ دل کے اندھے کا مطلب سیلف امیج کا اندھا ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ جس کا سیلف امیج اندھا ہوتا ہے، وہ کوئی اچھی چیز دیکھ نہیں سکتا۔ جس کا سیلف امیج بہرا ہوتا ہے، وہ کوئی اچھی بات سن نہیں سکتا۔

آج سے نیت کیجیے کہ ہم اس دنیا میں آئے ہیں اور اپنے آپ کو ثابت بھی کریں گے، کیونکہ دلوں پر بات تب ہی اثر کرتی ہے جب وہ دل سے نکلے۔

بلھیا، کی جاناں میں کون؟

''جب تک جنیدؒ کی نیت نہ اپنالو، تمہیں جنید والا اجر نہیں ملے گا!''

حضرت جنید بغدادیؒ

جب وقت کی گرد اٹھتی ہے تو بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ پہلے کے بعد دوسرے لوگوں نے جس آئیڈیے کو اپنایا ہوتا ہے، وہ آئیڈیا بے کار ہو جاتا ہے، جیسے کوئی آدمی کسی پیر صاحب کی محبت میں غرق ہو اور اپنی اس محبت میں وہ پیر کو سب کچھ سمجھ لے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: (مفہوم) دو طرح کی زمینیں ہیں۔ ایک وہ زمین جو بیج لیتی ہے اور بہترین کھیتی دیتی ہے جبکہ دوسری زمین جو بیج لیتی ہے لیکن بہترین کھیتی نہیں دیتی۔

تصوف پر زمانے کی گرد

تصوف پر اتنی گرد پڑ چکی ہے کہ جب بھی کوئی نئی آئیڈیالوجی آتی ہے تو مزید مخمصے جنم لیتے ہیں۔ ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو تصوف کا غلط تصور رکھتی ہے اور اس بنا پر بہت سے ایسے بھی ہیں جو تصوف کے یکسر انکاری ہو جاتے ہیں۔ اپنے اندر امن اور اپنے سے منسلک لوگوں کی زندگی میں امن کا نام تصوف ہے۔ اپنی ذات کو نامکمل سمجھتے ہوئے کسی مکمل ذات سے تعلق کا نام تصوف ہے۔ جب آدمی اپنی ذات کی محرومیوں کو ختم کرنے کیلئے ایک راستہ تلاش کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ایسی طاقت ہے جس کے سامنے مجھے جھکنا ہے جو حالات وواقعات مجھے پیش آ رہے ہیں، ان میں سے ہی ایک اور چہرہ بھی ہے جو بہ ظاہر چہرہ

تو نہیں ہے، لیکن اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی معانی ضرور ہے کہ آخر یہ سارے کے سارے حالات وواقعات ایک اوزار کے طور پر میرے اندر کچھ نہ کچھ تبدیلی لے کر آرہے ہیں۔

برصغیر میں صدیوں پرانا کلچر چلا آرہا ہے مثلاً ذات برادری کے مسئلے ہیں یا کھشتری برہمن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اس طرح کی وہ تمام خرابیاں جو اس معاشرے میں ہیں ان خرابیوں نے تصوف پر بھی اثر ڈالا۔ اس وجہ سے تصوف کے متعلق تاثر خراب ہو گیا۔ جب بھی قومی سطح پر شعور کی کمی ہو گی تو پھر دو نمبر چیزیں جگہ بنائیں گی۔ یہی معاملہ تصوف کے ساتھ ہوا۔ چنانچہ لاعلمی اور جہالت کا نام تصوف پڑ گیا۔ جب یہ ہو گا تو پھر ہم تصوف کو فقط ڈھول دھمال سے آگے نہیں لے کر جا سکتے۔ ہم کسی خاص رنگ کے کپڑے کے لباس کا نام تصوف رکھ دیں گے یا کسی خاص ٹوپی کو تصوف سمجھنے لگیں گے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ حضور، مجھے آپ کا خرقہ چاہیے تو آپؒ نے پوچھا، تمہیں یہ لباس کیوں چاہیے؟ اس نے جواب دیا، میں فیوض و برکات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپؒ نے فرمایا، تم اس (جنید) کی کھال بھی پہن لو تب بھی تمہیں جنید والا اجر یا نتیجہ نہیں ملے گا جب تک کہ تم جنید کی نیت نہ اپنا لو۔ پتا چلا کہ اس لباس اور اس کھال سے نیچے بھی ایک چیز ہے جس کا نام "نیت" ہے۔ اور نیت میں خلوص کا نام تصوف ہے۔

تصوف، کسی خاص طرز کا نام نہیں

ہم فوری طور پر اطوار، طور طریقے اور کلچر میں پھنس جاتے ہیں۔ ہم اس مغز تک پہنچتے ہی نہیں ہیں۔ ہم سمجھتے ہی نہیں ہیں کہ جو میلہ لگا ہوا ہے، اس کا مقصد اور مصرف کیا ہے۔ سرفراز اے شاہ صاحب کے استاد محترم حضرت یعقوب بھلی شاہ نے ساری زندگی شربت بنا کر بیچ کر زندگی گزاری۔ وہ خدمت کرنے والے انسان تھے۔ ان کو انتہا کا شوق تھا کہ ان کے پاس جو آئے، اسے وہ خود چائے بنا کر پلائیں۔ ایک دفعہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ سنا

ہے کہ آپؒ کے پاس کیمیا گری ہے۔ آپؒ فوری طور پر اٹھے اور جذباتی انداز میں اپنے صندوق میں سے مٹی کے ڈھیلے نکالے اور ان کو ایک برتن میں ڈالا اور پگھلا دیا۔ وہ سونے کی طرح چمکنے لگے۔ سامنے نالی بہہ رہی تھی۔ آپؒ نے ان کو اس میں بہا دیا اور کہا، یاد رکھ خود کو سونا بنائے گا تو بات بنے گی۔

اصل تصوف علم ہے جو اصحاب صفہ نے حاصل کیا تھا۔ وہ علم والے لوگ تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی مجلس کو ذکر سے زیادہ پسند فرمایا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے ساتھ علم کی بات ہوتی تھی، جن کے ساتھ خاص کی بات ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ آگے لے کر چلنے کی بات ہوتی تھی۔ انھوں نے پیغام لے کر آگے جانا تھا۔ صرف عبادت ہی نہیں تھی، بلکہ مقصد پانے کی بات ہوتی تھی۔ آج یہ ساری باتیں ختم ہوتی گئیں اور ان کی جگہ رسوم آ گئیں۔

بدلتی عمر، بدلتی ترجیحات

ہم کبھی اپنی زندگی کے سفر میں پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ہمیں یاد آئے گا کہ ایک ننھا منا سا بچہ جس کی معصومیت یہ تھی کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوش ہو جاتا، اس کے کھلونوں کی تعداد تھوڑی تھی مگر پھر بھی وہ ان سے راضی تھا۔ اگر کھلونا گم جاتا تو چند گھنٹوں بعد وہ مکمل طور پر بھول جاتا اور ایک نئی دنیا میں گم ہو جاتا۔ اس کو کوئی لالچ نہیں تھا، حرص نہیں تھا۔ اس کی خوشی یہ تھی کہ بڑی عید آ رہی ہے۔ اس کی خوشی یہ تھی کہ نیا جوڑا بن گیا ہے۔ اس کی خوشی یہ تھی کہ نئے کھلونے مل گئے ہیں۔ ایک تو یہ بچہ ہے جبکہ ایک شخص وہ ہے جو جوان ہوتا ہے، ایک وہ شخص ہے جو جوان ہو کر بوڑھا ہو جاتا ہے، اور ایک وہ شخص ہے جو بوڑھا ہو کر مر جاتا ہے۔

عمر کے بدلنے سے اپنے اندر کی تبدیلی کو دیکھیے تو وہ دراصل انتخاب کی تبدیلی نظر آتی ہے۔ ہم نے ہر دور میں انتخاب سے ظاہر کیا کہ ہماری عمر کیا ہے۔ اگر آج بھی کسی بوڑھے شخص کا انتخاب کھلونے ہوں تو لوگ کہیں گے کہ یہ بچہ ہے، یہ بڑا ہی نہیں ہوا، یعنی انتخاب

اس بات کا اظہار ہے کہ یہ اپنی عمر میں کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی عمر میں تو بڑھ گئی ہے، لیکن ذہنی طور پر کچھ چیزیں پیچھے رہ گئی ہیں۔ ایک ہی انتخاب کسی اور وقت کے انتخاب پر لے کر جائیں تو پچھلا انتخاب ہمیں حماقت لگتا ہے۔ ہماری زندگی کے بے شمار ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ جب کبھی ہمارے سامنے اُن کا ذکر ہوتا ہے تو ہمیں شرم آجاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ وہی ہماری ذات کا حصہ ہے جو پیچھے کہیں کٹ گیا تھا اور آج اس کو ماننے اور سننے کیلئے ہم تیار نہیں ہیں۔

ہمارے چوہے

سوال یہ ہے کہ کیا وہ اصل تھا؟ تو جواب ہے، نہیں۔ کیا اگلا مرحلہ اصل ہے؟ جواب ہے، نہیں۔ ہم لمحہ موجود کے سوا کسی لمحے کو مانتے ہی نہیں ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم جس شعور کی حالت میں موجود ہیں، یہی میں ہوں اور یہی درست ہے۔ کیا یہی آگہی ہے کہ میں کون ہوں، اور میرے باہر کے حالات بدل جائیں تو میرا جواب بدل جاتا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ تھوڑے سے حالات بدلنے سے اتنی بڑی تبدیلی آجائے کہ ہم موسیٰ سے فرعون بن جائیں۔ جنگل میں بلی تقریر کر رہی تھی۔ تمام جانور سن رہے تھے کہ اسی دوران اس کے آگے سے چوہا گزرا۔ بلی نے تقریر چھوڑ دی اور چوہے کے پیچھے بھاگ گئی۔ صوفیا فرماتے ہیں کہ آدمی کے اندر ایک بلی ہوتی ہے اور ہر آدمی کا ایک چوہا ہوتا ہے۔ جیسے ہی وہ سامنے آتا ہے، وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور اس کا حقیقی اندر سامنے آجاتا ہے۔ ہم ہر شعبے میں نیک ہوتے ہیں، لیکن ہمارا ایک شعبہ ایسا ہوتا ہے جس کو گرفت کرنے کے بعد سمجھ آتا ہے کہ وہ ''جن'' ہمارے اندر ہی ہے جسے قابو کرنا ہے۔

رویوں کی تبدیلی، انتخابات کی تبدیلی، مزاج کی تبدیلی، سوچ کی تبدیلی اور بالخصوص ردِعمل کی تبدیلی... اتنی تیز ہے کہ دنیا کی شاید ہی کسی مخلوق میں اس طرح ہو۔ ایک ہی چیز سامنے آنے

کے بعد ہر انسان کا ردِعمل الگ الگ ہوتا ہے۔ ہماری فہم (انڈر اسٹینڈنگ) ہمارے ماضی کے مطابق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، جس نے ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی دیکھی ہے، جس نے جنرل ضیاء الحق کے فضائی حادثے کا واقعہ دیکھا ہے، اس کیلئے آج جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کسی اور طرح ہے جبکہ جس نے یہ واقعات صرف سنے ہیں، اس کیلئے اور طرح ہیں۔

جو بچہ آج چیزیں دیکھ رہا ہے، اس کیلئے یہ ایک نیا تجربہ ہے، کیونکہ اس کے پیچھے کوئی چیز نہیں ہے۔ پتا چلا کہ زندگی میں آنے والے ہر واقعہ یا چیز کا ردِعمل ظاہر کرتا ہے کہ اس فرد کا ماضی کیا ہے۔ کسی صوفی نے کہا ہے کہ اگر زمین اور آسمان کے درمیان گز کر دیے جائیں تو اس فاصلے کو ماپا جا سکتا ہے لیکن انسان کے مزاج کی وجہ سے جو شخصیتیں بن جاتی ہیں، وہ اتنی زیادہ ہیں کہ انھیں گنا نہیں جا سکتا۔ جس طرح ہم انگلیوں کے نشان سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اسی طرح ہم مزاج، عادات اور اطوار کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد و یکتا ہیں۔

کردار بچپن سے بنتا ہے

کتاب ''عظیم انسان بطور طالب علم'' میں ہمارے مقامی ہیروز کی زندگی کی کہانیاں ہیں۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ جب یہ ہیروز بچے تھے تو کیا تھے، طالب علم تھے، تب کیا تھے، جب بڑے ہوئے تو کیا تھے اور پھر ان کی اس سوچ کے بننے میں کس کا کردار تھا۔ پھر اس میں پتا لگتا ہے کہ ان کی عظمت کا سفر کیسے شروع ہوا۔ جیسے سر سید احمد خاں کو پڑھتے ہیں تو پتا لگتا ہے کہ گیارہ سال کی عمر میں انھوں نے اپنے بوڑھے ملازم کو تھپڑ مارا تو والدہ نے ردِعمل میں ان کو گھر سے نکال دیا۔ والدہ کے اس عمل سے ان کے دل میں اتنا ڈر پیدا ہوا کہ خالہ کے گھر میں تین دن چھپے رہے۔ جب معاملہ صلح صفائی کا ہوا تو والدہ نے کہا کہ تم اس بوڑھے ملازم سے معافی مانگو اور کہو کہ آئندہ میں آپ کا دل نہیں دکھاؤں گا۔ اس واقعے پر غور کیا

جائے تو دیکھیں کہ کردار کی پختگی کیسے نہ آئے کہ جس کی والدہ گیارہ سال کے بچے کی غلطی کو بھی بڑی غلطی سمجھتی ہے اور اس کو پتا ہے کہ اس غلطی کو معمولی سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تو کل کو اس کی شخصیت میں جتنی بڑی خرابی پیدا ہوگی، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

ہار اور جیت اصل نہیں

اپنی زندگی میں ضرور سوچیے کہ ہم کس صف میں کھڑے ہیں۔ ہم موسیٰ والی صف میں ہیں یا فرعون کی صف میں۔ سب کو عظمت نہیں ملتی، لیکن کم از کم اس صف میں ضرور ہونا چاہیے جس میں لوگوں کا فائدہ ہو۔ اس صف میں ضرور ہونا چاہیے جس میں خیال کی آسانی ہو۔ اس صف میں ضرور ہونا چاہیے جس میں حماقتیں نہ ہوں بلکہ سیکھنے کی جستجو ہو۔ جب ہم اپنی صف نہیں دیکھیں گے تو پھر حضرت بابا بلھے شاہؒ والی بات آئے گی کہ میں موسیٰ ہوں کہ فرعون ہوں، یہاں پر یہ مقام نہیں ہے کہ ہم خود کو تلاش کریں بلکہ یہاں پر فیصلہ کرنے کا مقام ہے۔ بعض اوقات موسیٰ کی ہار وقتی ہار ہو سکتی ہے۔ بعد کا زمانہ اور وقت بتاتا ہے کہ امام عالی مقامؓ ہوں، موسیٰ ہوں یا سقراط کہ جسے زہر کا پیالہ پینا پڑے، وہ اگلے وقتوں میں ثابت کرتا ہے کہ جیتا کون ہے۔

ایک شخصیت ہوتی ہے جبکہ ایک ذات ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ کہاں نکھر کر سامنے آتی ہے۔ قرآن مجید میں موسیٰ اور فرعون کی کہانی اس لیے ہے کہ زندگی کا کوئی دَور ہو، عمر کا کوئی حصہ ہو، ہم یہ فیصلہ کریں کہ موسیٰ کی صف میں کھڑے ہوں گے یا فرعون کی صف میں۔ اگر ہم موسیٰ کی صف میں کھڑے ہیں تو پھر گھبرانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سلام بھیجنا ہے۔ دنیا مانے نہ مانے، یہی کافی ہے کہ اندر اطمینان ہے اور یہ یقین ہے کہ وہ ذات سلام بھیج کر بہتری کے راستے اور اجر ضرور دے گی۔ ممکن ہے، وہ اجر کچھ یہاں ملے اور کچھ آخرت میں ہو۔

رہ نمائی کی تلاش

''بند راستہ بھی درست راستے کی رہ نمائی کرتا ہے!''

میسن کولی

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ انسانی زندگی کا سفر ضرورت سے جڑا ہوا ہے۔ ضرورت کا کمال یہ ہے کہ آج ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں، اس کی وجہ ضرورت ہے۔ انسان کبھی چلو میں پانی پیتا تھا، جب تسلی نہ ہوئی تو پہلے پیالہ پھر گلاس بنا لیا۔ اگر چلو سے گلاس تک کے سفر کو لیا جائے تو کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح انسان نے اپنی آسانی کیلئے اور بہت ساری اشیا بنا لیں۔ لیکن ان چیزوں کے ساتھ ساتھ انسان کو ہمیشہ رہنمائی کی ضرورت رہی۔

قدرت نے ہر زمانے میں کچھ لوگ ایسے ضرور پیدا کیے جن کا فہم، جن کی عقل، جن کی سمجھ اور جن کی دانش زمانے سے بہتر تھی۔ وہ اپنے فہم اور فکر میں اتنے بلند تھے کہ اس وقت کو بھی دیکھ رہے ہوتے تھے کہ جس وقت کو زمانہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہر دَور میں ان کی سنگتیں، ان کی محفلیں، ان کی گفتگو اور ان کی تبلیغ لوگوں تک پہنچتی رہی۔ یہ سارا سلسلہ چلتے چلتے آگے بڑھا۔ مادی دنیا میں نئی سے نئی چیزیں بنتی رہیں، لیکن کبھی رہ نمائی کی اہمیت ختم نہیں ہوئی۔ ہر دور میں رہنمائی، رہنما، استاد، مرشد اور مربی کی اہمیت باقی رہی ہے۔

جس طرح گلاس کے سفر پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، اسی طرح رہنما اور رہنمائی کے سفر پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، کیونکہ یہ انسان کا ذاتی سفر ہے۔ اس سفر میں بے شمار چیزیں شامل ہوئیں جیسے کلچر، مذہب، علاقائی رسم و رواج، لوگوں کے تجربات، جہالت و تبدیلی وغیرہ

وغیرہ۔ ایک وہ وقت بھی تھا کہ جب بادشاہ وقت کو سجدہ لازم تھا، لیکن پھر وہ زمانہ بھی آیا کہ جس دَور میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مفہوم) ''اگر تمہارے احترام سے لوگ کھڑے ہو رہے ہیں اور تمہارے دل کو اس سے راحت محسوس ہوتی ہے تو سمجھ لو کہ تم جہنمی ہو۔''

سیکھنے سکھانے کے انداز، ادب اور تعلقات کے اطوار چلتے چلتے جب اس دور میں آتے ہیں تو معلومات اور علم کی اتنی بھرمار ہے کہ رہنمائی کیلئے دانشور اور استاد کی اہمیت کم ہونے کی بجائے اور زیادہ بڑھ گئی۔

سچی طلب کا حیرت انگیز واقعہ

حضرت امام ابن حنبلؒ ایک دفعہ سفر کر رہے تھے۔ پیسے ختم ہو گئے تو سوچا کہ کسی مسجد میں جا کر رک جاتے ہیں۔ مسجد میں گئے۔ رات کے پچھلے پہر مسجد کے رکھوالے نے انھیں باہر نکال دیا۔ باہر بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور کہا، آپ میرے ساتھ چلیں۔ میرے گھر میں ٹھہر جائیں۔ جب دونوں گھر چلے گئے تو آپؒ نے دیکھا کہ وہ آدمی مصلے پر بیٹھا گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہا ہے۔ جب وہ دعا سے فارغ ہوا تو آپؒ نے پوچھا، تم اللہ تعالیٰ سے کیا دعا مانگ رہے تھے؟ اس نے جواب دیا کہ میری بہت سی خواہشیں تھیں وہ سب اللہ تعالیٰ نے پوری کر دیں۔ بس ایک خواہش رہ گئی ہے جو آج تک پوری نہیں ہوئی۔ آپؒ نے پوچھا، وہ کیا خواہش ہے۔ اس نے کہا، میری خواہش یہ ہے کہ وقت کے امام حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے میری ملاقات ہو جائے۔ آپؒ رو دیے اور کہا کہ تمہاری طلب اتنی سچی تھی کہ مجھے گھسیٹ کر تمہارے گھر تک لایا گیا۔ یہ معاملہ جتنی سچی طلب سے جڑا ہوا ہے، کسی اور چیز سے نہیں جڑا۔

حضرت مولانا رومؒ کلاس میں بیٹھے درس دے رہے تھے۔ پیچھے اُن کی لکھی ہوئی کتابیں

رکھی تھیں۔ اسی دوران ایک درویش آیا اور کہا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو اور یہ کتابیں کیسی ہیں؟
مولانا رومؒ نے فرمایا، باباجی چھوڑیں، آپ کو کیا پتا یہ کیا ہے۔ یہ صرف ونحو کی باتیں ہیں۔
آپ جائیں۔ درویش کو جلال آیا اور کتابیں تالاب میں پھینک دیں جس کی وجہ سے کتابیں خراب ہونے لگیں۔ مولانا نے یہ حالت دیکھی تو رو پڑے اور کہا، آپ نے میری زندگی کی کمائی ضائع کردی۔ درویش نے کہا، گھبراؤ نہیں۔ انھوں نے پانی میں ہاتھ ڈالا، خشک کتابیں جھاڑیں اور واپس رکھ دیں۔ مولانا رومؒ نے کہا، یہ کیا ہے؟ درویش نے جواب دیا، تم صرف ونحو کی باتیں کرو، یہ میرا کام تھا۔ یہ کہہ کر وہ درویش چل پڑا اور غائب ہوگیا۔ مولانا رومؒ سے رہا نہ گیا اور اس درویش کی تلاش میں نکل گئے یہاں تک کہ تین سال گزر گئے۔ تین سال بعد کہیں جا کر وہ درویش ملے تو حضرت مولانا جلال الدینؒ پاؤں پڑ گئے اور کہا کہ مجھے معافی دے دیں، مجھے آپ کو تلاش کرنے میں تین سال لگ گئے۔ درویش نے مڑ کر کہا، تمھیں تو صرف تین سال لگے ہیں، مجھے تم جیسا سچا شاگرد تلاش کرنے میں تیس سال لگ گئے۔ طلب اتنی طاقتور چیز ہے کہ وہ خود راستے بنالیتی ہے۔

انسان کی زندگی کا سب سے بڑا رہنما اس کی سچی طلب ہے۔ یہ اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ بعض اوقات جھوٹے پیر سے بھی فائدہ دے جاتی ہے۔ تاریخ میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے اپنا سفر کسی جھوٹے فرد کے ساتھ طے کیا، لیکن قدرت دیکھ رہی تھی۔ اس نے ان کے خلوص کا ایسا انعام دیا کہ ہدایت مل گئی۔ حضرت واصف علی واصفؒ سے کسی نے پوچھا، مجھے سچا پیر نہیں ملتا۔ انھوں نے جواب دیا، ایک ہفتے بعد بات کریں گے۔ ہفتے بعد اس سے پوچھا، بھائی تمہارا کیا سوال تھا۔ اس شخص نے کہا، میں سوال بھول گیا۔ آپؒ نے جواب دیا، جس سوال کو تم ایک ہفتہ نہیں رکھ سکے، اس کا جواب کہاں سے ملے گا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے پیٹ میں درد ہو اور مریض دوائی لینے جائے لیکن راستے میں لگے میلے میں چلا جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ پیٹ میں درد نہیں ہے یا پیٹ کا درد ختم کرنے میں سنجیدہ نہیں ہے۔

اگر طلب ہے تو دعا کرو

سچی طلب انسان کو بھگاتی ہے، رلاتی ہے، دعا مانگنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ گلی گلی دوڑاتی ہے۔ ہم کنفیوژ لوگ ہیں۔ اول تو ہم دعا ہی نہیں کرتے۔ کرتے ہیں تو اپنی دعاؤں پر بھی شک کرتے ہیں کہ پتا نہیں یہ قبول ہوگی کہ نہیں۔ ہم جب اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہوتے ہیں تو ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ جیسے وہ لوگوں کی طرح (معاذ اللہ) کم ظرف ہے۔ وہ تو کائنات کی اعلیٰ ترین ظرف والی ذات ہے۔ جب ہم اس سے مانگتے ہیں تو سوچنا چاہیے کہ ہم کس سے مانگ رہے ہیں۔

ایک بزرگ واقعہ سناتے ہیں کہ مجھے ایک آدمی کی تلاش تھی، لیکن وہ مل نہیں رہا تھا۔ خاصی محنت اور تگ ودو کے بعد اس کا پتا لگا کہ وہ فلاں شہر میں رہتا ہے۔ اس کے پاس فون نہیں تھا۔ پڑوسیوں کے گھر فون تھا۔ میں نے اس فون پر اس سے رابطہ کیا۔ جب اسے میرا پیغام پہنچا تو اس نے جواب میں پیغام بھیجا کہ کل صبح میرے ساتھ ناشتہ کرنا، کیونکہ میں تمہارا شدید انتظار کر رہا ہوں۔ بزرگ کہتے ہیں، میں بڑا حیران ہوا کہ مجھے صبح کے ناشتے ہی میں کیوں بلایا۔ خیر میں جب اس کے پاس پہنچا تو ناشتہ تیار تھا۔ ہم نے ناشتا کیا جو میں نے ان سے پوچھنا تھا، پوچھ لیا تو اس نے کہا، اب آپ جاسکتے ہیں۔ جب میں واپس اپنے گھر پہنچا تو مجھے ایک پیغام ملا کہ آپ جس سے ملاقات کرکے آئے ہیں، ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ بزرگ کہتے ہیں کہ میں حیران ہوا کہ پتا نہیں وہ کب سے انتظار میں تھا کہ مجھے اس کو یہ باتیں سکھانی ہیں۔ ہم نے جو سیکھنا ہوتا ہے، وہ بھی رزق کی طرح بہانوں بہانوں سے چلتے چلتے دروازے پر آجاتا ہے یا پھر بعض اوقات آدمی خود اس تک پہنچ جاتا ہے۔

کیا ہم خود سچے نہیں

ہمیں سچا مرشد یا سچے لوگ اس لیے نہیں ملتے کہ ہم خود سچے نہیں ہوتے، کیونکہ جھوٹا جھوٹے کی تلاش کر رہا ہوتا ہے۔ جبکہ سچے کی تلاش کا نام ہی سچ ہے۔ طلب کا سچا ہونا راستے کو آسان کر دیتا ہے۔ آج تک کسی رانجھے نے کسی سے پوچھ کر کسی ہیر سے عشق نہیں کیا۔ جیسے جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسی وقت اللہ تعالیٰ اس عورت میں ممتا کی محبت ڈال دیتا ہے، اسی طرح کبھی بھی پوچھ کر ادب نہیں ہوتا، سیکھ کر ادب نہیں ہوتا۔ یہ وہ قدرتی انداز ہے جو خود بہ خود ہو جاتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی میں کچھ ہو اور اس کیلئے ہماری نگاہیں نہ جھکیں اور اس کیلئے احترام پیدا نہ ہو۔ ہم لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ دوسرے کتنی عقیدت سے جھک رہے ہیں اور اسی کو عقیدت سمجھ لیتے ہیں۔ ہم جو احترام کرتے ہیں، یہ سیکھا ہوا نہیں ہوتا، یہ دل کا رجحان ہوتا ہے۔ یہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہو جاتا ہے۔ جب ہم عقیدے کو لے کر عقیدت ماپتے ہیں تو کنفیوژ ہو جاتے ہیں۔ ہمیں دوسروں کے عقیدوں کو ماپنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ سوال خود لاگو کرنا چاہیے کہ ہمارا عقیدہ کیا ہے، ہمارا خدا سے تعلق کیا ہے۔ میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان آنے والی چیز اصل ایشو ہے اور وہ میرا ہے، کسی اور کا نہیں ہے۔

تعلق کی ضرورت

اکثر ہمارا جی یہ چاہتا ہے کہ ہم جیسے ہی دو بول بولیں، یہ دنیا بدل جائے۔ ہم جہاں جائیں، ہمارے لیے تالیاں بجیں، پھول نچھاور کیے جائیں۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''بغیر تعلق کے تبلیغ بالکل ایسے ہی ہے جیسے غیر زبان میں تقریر۔'' اگر تعلق نہیں ہے تو تبلیغ نہیں ہوسکتی۔ یہ وہ پرابلم ہے جو تبلیغ کرنے والے کر جاتے ہیں، کیونکہ جب آپ بغیر تعلق کے تبلیغ کرتے ہیں تو آپ کلمے میں تو شامل کرتے ہیں لیکن روٹی میں شریک نہیں

کرتے۔ خلوص صرف زبان کی حد تک ہوتا ہے۔ تبلیغ تعلق سے ہوتی ہے۔ وہ تعلق چاہے نفرت کا ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ نفرت نے کبھی محبت میں بدلنا ہوتا ہے۔ اگر روز کوڑا پھینکا جائے اور سامنے کائنات کی سب سے معتبر ہستی ہو تو نفرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمیں بات نہیں منوانی ہوتی، ہمیں اپنا آپ منوانا ہوتا ہے۔ اگر ہم سچے نہیں ہیں، ہمارا معاملہ ٹھیک نہیں ہے، ہمارے کردار میں کمزوریاں ہیں اور ان کمزوریوں کے ساتھ تبدیلی کی جنگ لڑیں گے تو ہار جائیں گے۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آدمی صادق اور امین ہو، چاہے وہ چھوٹے حلقے میں ہی ہو، اس کی بات سنی جاتی ہو۔ اگر وہ معاملے میں ٹھیک نہیں ہے تو بات نہیں سنی جائے گی۔ تنگ دل انسان تبلیغ نہیں کرسکتا۔ وہ کبھی اچھا استاد نہیں ہوسکتا، کیونکہ استاد کا اگر دنیا میں کوئی دوسرا نام رکھا جائے تو سخی سے خوبصورت کوئی لفظ نہیں ہے۔ علم کے معاملے میں استاد سخی ہوتا ہے۔ ہماری شاید کوئی وراثت آگے نہ جائے، لیکن علم ایک واحد چیز ہے جو مرنے کے بعد بھی ساتھ چلتا ہے۔ ایک پہلوان مرنے لگا تو کسی نے اسے طعنہ دیا کہ تمہاری تو کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا، نہیں، میں بے اولاد نہیں مرسکتا کیونکہ جو سو کو سکھا دے، وہ بے اولاد تو نہیں ہوتا۔ وہ سو ہی اس کی اولاد ہوتے ہیں۔ مرشد کی اصل اولاد وہ ہوتے ہیں جنھوں نے اس سے سیکھا ہوتا ہے۔ وہ اس کے علم کے محافظ ہوتے ہیں۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ”مسجد سے جاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو ساتھ لے کر جاؤ۔“ اس ساری محفل میں ایک نہ نظر آنے والی طاقت بھی ہے۔ اگر ہم سب کا یقین ہے کہ وہ دیکھ رہی ہے تو پھر معاملہ کچھ اور ہوگا، اور اگر خیال ہے کہ وہ نہیں دیکھ رہی، صرف مسجد میں دیکھتی ہے تو پھر یہ منافقت ہے۔

کامیابی میں ناکامی

''کامیابی کی بنیاد عمل ہے!''

پیبلو پیکاسو

کہتے ہیں کہ کامیابی حاصل کرنا آسان ہے اور اسے برقرار رکھنا مشکل ہے۔ دراصل، جس طرح کامیابی کے اسباب ہوتے ہیں، اسی طرح، ناکامی کے بھی اسباب ہوتے ہیں۔ یہ دنیا علت و معلول (Cause and Effect) کے اصول پر چل رہی ہے۔ کچھ لوگ اچانک آتے ہیں اور چھا جاتے ہیں، لیکن کچھ ہی عرصے بعد اچانک غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کی کامیابی بلبلے کی طرح ہوتی ہے۔

کامیاب ہونا جتنا مشکل ہے، کامیابی کا برقرار رکھنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ کامیابی کے کوئی عوامل ہو سکتے ہیں، مثلاً محنت، کوشش، جنون وغیرہ، لیکن اس کامیابی کے بعد اسے برقرار رکھنے میں سب سے زیادہ اہم آدمی کا ذاتی کردار ہوتا ہے جو بہت مشکل کام ہے۔ پہاڑ پر سب چڑھنا چاہتے ہیں، لیکن پہاڑ پر جو ہوائیں چلتی ہیں، ان کا سامنا چند ہی کر پاتے ہیں۔ برطانیہ میں ان لوگوں پر تحقیق کی گئی جن کی لاٹری نکلتی ہے۔ پتا چلا کہ جن لوگوں کی لاٹری نکلتی ہے، وہ اگلے چند ماہ بعد ہی دوبارہ اسی معاشی حالت پر پہنچ جاتے ہیں جہاں لاٹری کھلنے سے پہلے تھے۔ لاٹری کھلنے کے بعد ملین ڈالرز کا ملنا اپنی جگہ، لیکن ان ملین ڈالرز کو سنبھالنا اس سے زیادہ اہم ہے۔ اس نکتے کو ایک اور مثال سے سمجھیے۔ کوئی بھی شخص کسی قسم کی گاڑی لے سکتا ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ گاڑی چلانی آتی ہے یا نہیں۔ بعض لوگ گاڑی

تو لے لیتے ہیں، لیکن صحیح طریقے سے چلا نہیں پاتے جس کی وجہ سے نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ بعض لوگ گاڑی چلانا جانتے ہیں، مگر اس کی دیکھ بھال نہیں کرتے۔ گاڑی کچھ ہی عرصہ میں خراب ہو جاتی ہے۔ پھر یہی نقصان اُن کیلئے ڈپریشن بن جاتا ہے۔

برصغیر کی ثقافت میں ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں وجوہ کا ڈھونڈنا سکھایا ہی نہیں جاتا۔ خاص طور پر، اگر معاملہ ناکامی، ناخوشی اور نقصان کا ہو تو "اللہ مالک ہے" کہہ کر اپنی ذمے داری سے پہلو تہی برتی جاتی ہے۔

کامیابی کا نقصان

کامیابی آدمی کو آزادی دیتی ہے اور آزادی سے وہ کمفرٹ زون میں چلا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کیلئے خطہ آرام میں رہنا بہت خطرناک ہے۔ کیوں کہ ہر کامیابی کیلئے نظم (ڈسپلن) چاہیے اور کامیابی کو برقرار رکھنے کیلئے کامیابی کے حصول سے زیادہ نظم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جبکہ آدمی اس غلط فہمی میں رہتا ہے کہ میرا مطلوبہ ہدف مجھے مل گیا، یعنی کامیابی مل گئی تو اب مجھے آرام کرنا چاہیے۔ ڈسپلن کا حصول خطہ آرام میں رہتے ہوئے ناممکن ہے۔

کوئی بھی کامیاب شخص جو کام کرتا ہے، اس کام کے پیچھے اس کی سخت محنت ہوتی ہے، اسلوب ہوتا ہے، خاص ترتیب ہوتی ہے، تب جا کر کامیابی ملتی ہے۔ کامیابی کے بعد نام بنتا ہے، شہرت ہوتی ہے، عزت ملتی ہے، پیسہ آتا ہے۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ہی اسے آزادی ملتی ہے۔ یہ آزادی اسے اختیار دیتی ہے کہ وہ تنظیم اور ترتیب کے مطابق زندگی گزارتا ہے یا نہیں۔ عموماً لوگ ایسے میں ڈسپلن اختیار نہیں کر پاتے۔ وہ توازن جو زندگی میں درکار ہے، وہ اس سے محروم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا، کامیابی ملنے پر انسانی کردار اور زندگی میں بگاڑ کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

کامیابی محنت سے تو مل جاتی ہے، لیکن اسے کردار سے برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ کردار دو

طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک ذاتی کردار ہوتا ہے اور ایک پروفیشنل کردار ہوتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں ڈسپلن ضروری ہے۔ اگر کسی ادارے کے سربراہ کے پروفیشنل کردار میں ڈسپلن نہیں ہے تو وہ ڈنڈے کے زور سے اپنی ٹیم کو چلا تو لے گا، لیکن ٹیم ممبرز کو جہاں بھی موقع ملے گا، وہ اسے نقصان ضرور پہنچائیں گے۔ جو ادارے کردار پہ چلتے ہیں، وہ زیادہ ترقی کرتے ہیں۔

کم تر معیارات

آج کے معاشرے میں کسی چیز کے بننے، جڑنے اور چلنے میں کردار کی بہت کمی ہے۔ دکھاوا بہت زیادہ ہے۔ پیکنگ دیکھ کر چیز کا معیار پرکھا جاتا ہے۔ کتاب کی جلد اور وزن کے مطابق کتاب کے معیار کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہ معاشرہ کھوکھلے ذہنوں کا معاشرہ ہے جہاں ضرورت کی شے سے نہیں، اس کی پیکنگ سے انسپائر ہوا جاتا ہے، اور جہاں کتاب کے مواد سے نہیں، کتاب کی جلد بندی سے متاثر ہوا جاتا ہے۔ یہی معاملہ تعلقات میں اختیار کیا جاتا ہے۔ جہاں حسین شکل دیکھی، اسے پسند کرلیا اور جھٹ فیصلہ بھی کرلیا کہ اس سے شادی کرنی ہے۔ لیکن شادی کے بعد جب ایک دوسرے کے کردار سے واقفیت ہوتی ہے تو نتیجہ علیحدگی کی صورت میں نکلتا ہے۔ ٹونی روبنس کے بہ قول، یہ عرصہ عموماً اٹھارہ سے تیئیس ماہ کا ہوتا ہے۔ پاکستان میں مجھے کہنے دیجیے کہ یہ دو سے پانچ سال چل جاتا ہے، کیوں کہ یہاں برداشت زیادہ ہے اور معاشرے کا دباؤ کہ ''لوگ کیا کہیں گے'' کی وجہ سے معاملے کو آخری حد تک سنبھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ معیار کا تعین ہوتا ہی غیر فطری انداز میں ہے تو برداشت کا پیمانہ کہاں تک برداشت کرے گا۔

جب ظاہر کو دیکھا جاتا ہے تو اس کے اندر مغز دیکھنے سے محروم رہتا ہے۔ ایسے میں کامیابی دکھاوے کی ہوتی ہے اور بہت ہی سطحی۔ اس کی جڑیں گہری نہیں ہوتیں، جبکہ اصل

کی جڑیں گہری ہوتی ہیں۔ یاد رکھیے، کامیابی کوئی منزل یا مقام نہیں ہے بلکہ یہ ایک راستہ ہے۔ کامیابی ایک مقام پر پہنچنے کے بعد اگلے مقام کی طرف سفر جاری رکھنا ہے۔ جو لطف کوشش میں ملتا ہے، وہ مزا اسے حاصل کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اصل ہیرو وہ ہے جو کامیاب ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں اصل ہیرو وہ ہے جو ناکام ہوتا ہے، کیونکہ اسے پتا ہوتا ہے کہ کامیابی کی قیمت کیا ہے۔

ایک کے بعد دوسرا ہدف

جو مزہ کامیابی کیلئے کوشش کرنے میں ہے، وہ مزہ کامیابی کے بعد نہیں ملتا۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں، ''ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا... حیات ذوق سفر کے سوا کچھ نہیں''۔ زندگی سفر ہے اور یہ سفر نہ ختم ہونے والا سفر ہے۔ ٹارگٹس پورے ہونے کے بعد نئے ٹارگٹس بنتے ہیں۔ دنیا کے بڑے فاتح ایسے تھے جنھوں نے ایک ملک فتح کیا، لیکن انھیں مزہ نہیں آیا۔ پھر دوسرا ملک فتح کیا، لیکن مزہ نہیں آیا۔ پھر انھوں نے پوری دنیا فتح کر ڈالی۔ لیکن پھر بھی تشفی نہیں ہوئی۔

اگر خواب، خواہش، کوشش اور مشقت ہے تو پھر زندگی ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو زندگی نہیں رہتی۔ ایک تحقیق کے مطابق، لمبی عمر پانے کی کئی وجوہ ہوتی ہیں۔ ان میں ایک وجہ جین ہے۔ بعض لوگ زیادہ عمر ہونے کے باوجود چھوٹے لگتے ہیں۔ جبکہ بعض لوگ کم عمر ہونے کے باوجود بڑے لگتے ہیں۔ لمبی عمر کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ خوش کتنا رہتا ہے۔ اگر زندگی میں خوشی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی عمر بھی زیادہ ہوگی۔ جو شخص خوش ہوتا ہے، اس کے جسم کا ایک ایک خلیہ (سیل) خوش ہوتا ہے۔ اگر خوشی نہیں ہے تو وہی خلیات مرجھانے لگتے ہیں۔ تیسری وجہ زندگی میں کوشش ہے۔ زندگی میں جتنے زیادہ اہداف ہوں گے، ٹارگٹس ہوں گے، آدمی اتنا زیادہ طویل عمر پا سکتا ہے، کیونکہ اہداف انسان کو متحرک رکھتے ہیں۔

چوتھی وجہ ورزش ہے، لائف اسٹائل ہے۔ جسمانی صحت جتنی زیادہ اچھی ہوتی ہے، زندگی اتنی ہی متحرک رہتی ہے۔ پانچویں وجہ سیکھنے کی جستجو ہے۔ اگر زندگی میں حیرت ہے، علم حاصل کرنے کا شوق ہے، سیکھنے کی لگن ہے تو عمر زیادہ ہوگی۔

جب یہ سوچ ہوگی کہ کام صرف اپنے لیے ہی کرنا ہے تو اس سے سوچ کا دائرہ محدود ہوگا، لیکن اگر یہ سوچ ہوگی کہ مجھ سے کتنے لوگوں کی زندگی جڑی ہے تو سوچ وسیع ہوگی۔

کامیابی ایسا گھوڑا ہے جس سے اترا نہیں جا سکتا۔ اگر اتر گئے تو چڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یا تو انتخاب نہ کیا جائے، اگر انتخاب کر لیا ہے تو پھر واپسی نہیں ہے۔ جو پیچھے مڑ کر دیکھے گا، پتھر کا ہو جائے گا۔ جس کو اپنی کامیابی کی قدر نہیں ہوتی، وہ اسے گنوا دیتا ہے۔ جسے جتنی قدر ہوتی ہے اور اتنا ہی شکر گزار ہوتا ہے، یہ شکر اور قدر کامیابی کو محفوظ بناتے ہیں۔

زندگی آسان نہیں ہے

کامیابی کیلئے خطہ آرام سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ جب کام کرنے کو دل نہیں چاہتا، لیکن پھر بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ گھر میں ایسا کام ہوتا ہے یا آدمی ایسے معاملات میں پھنس جاتا ہے کہ گھر سے نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی کام کیلئے نکلا جاتا ہے۔ کمفرٹ زون سے نکلنے والا اصل میں اپنی مطلوبہ کامیابی کی قیمت ادا کرتا ہے اور یہ قیمت ادا کیے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے۔

کوئی بھی انسان اچانک ہیرو سے زیرو نہیں ہو جاتا۔ اس کے پیچھے کئی اسباب ہوتے ہیں۔ دیوار ٹوٹتے ٹوٹتے ہی ٹوٹتی ہے۔ ناکامیاں ایک دم نہیں آتیں۔ صرف ان کی طرف دھیان نہیں ہوتا۔ کمرے میں جس کھڑکی سے گرد آ رہی ہوتی ہے، اُس طرف دھیان نہیں جاتا۔ قدرت کا نظام احساس کی زبان کے ذریعے پہلے محسوس کراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والے زندگی کے واقعات بھی محسوس ہونے لگتے ہیں۔ بعض اوقات قدرت سبق

سکھاتی ہے۔ وہ روکتی ہے اور گراتی ہے۔ جب ناکامی کے بعد لوگ دوبارہ کامیاب ہوتے ہیں تو انھیں پتا لگتا ہے کہ اگر یہ ناکامی نہ ملتی تو اتنی بڑی کامیابی ممکن نہ ہوتی۔

کامیاب کہانی کی تعریف یہ ہے کہ آدمی گرے اور پھر اٹھ جائے۔ گر کر اٹھنے والا زیادہ بہادر ہوتا ہے، کیونکہ اس کے پاس درد ہوتا ہے۔ ناکامی کی تلخی چکھنے کے بعد کامیابی کی مٹھاس زیادہ شیریں ہو جاتی ہے۔

زندگی کے چھوٹے، مگر اہم اسباق

بعض اوقات قدرت چھوٹی چوٹ دے کر بڑا اسبق دیتی ہے۔ گرنے والے پر لازم ہے کہ وہ دوبارہ اٹھے اور گرنے کا سبب جانے تاکہ وہ کامیابی کا سبب جان سکے۔ جب آدمی پانی میں ڈوبتا ہے تو سب سے آخر میں اس کا ہاتھ ڈوبتا ہے۔ گویا، انسان کی آخری حد تک کوشش ہوتی ہے کہ میں بچ جاؤں، مجھے کوئی سہارا مل جائے۔ جو آخری حد تک کوشش کرتا ہے، اس کے بچنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن جو کوشش ہی نہ کرے، وہ بچ نہیں سکتا۔

انسان کا جسمانی نظام بعض خلیات اس وقت متحرک ہوتے ہیں کہ جب وہ شدید اسٹریس میں ہوتا ہے۔ موت سے بڑھ کر اسٹریس کوئی نہیں ہے۔ جب آدمی کو لگتا ہے کہ میں مرنے لگا ہوں تو اس شدید پریشر میں اس کے دماغ کے خاص خلیات متحرک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح، کچھ لوگوں کی زندگی میں تلخیاں اتنی ہوتی ہیں، دکھ اتنے ہوتے ہیں، تکلیفیں اتنی ہوتی ہیں کہ ان کی زندگی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک تکلیف سے پہلے والی زندگی اور ایک بعد والی زندگی۔ پہلی زندگی عام زندگی ہوتی ہے جبکہ بعد والی زندگی سپر مین والی زندگی ہوتی ہے۔ انسان سپر مین اس لیے بنتا ہے کہ وہ شدید پریشر سے گزرا ہوتا ہے۔ زندگی کے مسائل اور مشکلات اسے کندن میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ پھر، اُس کی آواز میں کشش آجاتی ہے۔ اس کا ہاتھ لگنے سے مٹی سونا ہونے لگتی ہے۔ وہ من چاہی زندگی کی

کوشش کرنے لگتا ہے۔اس کی خواہشیں حقیقت کا روپ دھارنے لگتی ہیں۔اس کے خوابوں کو تعبیر ملنے لگتی ہے اور لوگ اسے قسمت کا دھنی کہنے لگتے ہیں۔

آپ قوانین حیات سے بھاگ نہیں سکتے

زندگی کا اپنا راستہ ہے۔ یہ انسان کو بھاگنے نہیں دیتا۔انسان بھاگنے کی کوشش کرے تو بھی زندگی اسے اٹھا کر پھر اسی جگہ لا کر رکھ دیتی ہے۔ چیلنج آخری سانس تک رہتے ہیں۔زندگی عجیب ہے۔ انسان مار کھاتا ہے، گرتا ہے، پھر اٹھ جاتا ہے۔انسان سوچتا ہے کہ میں اسکول کا امتحان پاس کرلوں تو سکون آجائے گا، میں کالج کا امتحان پاس کرلوں تو قرار ملے گا، میں یونیورسٹی کا امتحان پاس کرلوں تو کامیاب ہوجاؤں گا، مجھے جاب مل جائے، شادی ہوجائے، بچے ہوجائیں، بچوں کی پرورش ہوجائے، بچے کامیاب ہوجائیں، بچوں کی شادیاں کردی جائیں تو میری زندگی کامیاب ہے۔ یہ زندگی کی زنجیر ہے۔ جب تک انسان مرتا نہیں ہے، مسئلے ختم نہیں ہوتے۔انسان جب تک زندہ ہے، مسائل باقی رہتے ہیں۔

دنیا میں چند لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جنھیں یہ نکتہ سمجھ آجاتا ہے کہ اس دنیا کا نظام یہی ہے۔ یہ ایسے ہی ہونا ہے۔ پھر وہ گلے شکوے نہیں کرتے۔وہ کہتے ہیں کہ کبھی خوشی، کبھی غم، کبھی اچھے دن ہیں تو کبھی برے دن۔قرآن مجید میں ارشادِ پاک ہے، ”میں دن کو پھیرتا ہوں“، اور ”ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔“ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔جو اس دانش پر پہنچ جاتا ہے، اور اس عظیم تر حقیقت کو پالیتا ہے، وہ پُرامید رہتا ہے۔اکبر بادشاہ نے بیربل سے کہا کہ ایسا جملہ بتاؤ کہ میں خوش ہوں تو غمگین ہوجاؤں اور جب غمگین ہوں تو خوش ہوجاؤں۔ بیربل نے جواب دیا، ”یہ وقت بھی گزر جائے گا۔“ واقعی، اگر خوشی میں یہ جملہ کہیں گے تو آپ غمگین ہوجائیں گے اور غم میں کہیں گے تو پھر خوش ہوجائیں گے۔

ہم جولیوں کا حلقہ بنائیے

کامیابی کو برقرار رکھنے میں حوصلہ افزائی کا کردار بھی بہت اہم ہے۔صرف پیسے سے بات نہیں بنتی۔حوصلہ افزائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔جو شخص جہاں بھی کامیاب ہے، اسے چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو بھی یاد رکھے جنھوں نے کبھی اُس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ جنھوں نے اس سے کہا تھا کہ تم کچھ ہو، تم کر سکتے ہو۔آپ کا ایک حلقہ، ایک گروپ ایسے لوگوں کا ہونا چاہیے جن کے ساتھ آپ گھل مل سکیں، بلاتکلف مگر بہ احترام گفتگو کر سکیں۔ آئیڈیل تو یہ ہے کہ یہ حلقہ گھر میں بنے۔گھر کے علاوہ ہمیں معاشرے میں بھی ایسے لوگ ضرور تلاش کرنے چاہئیں جن سے بات ہو سکے۔حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں،''اس سے زیادہ غریب شخص کوئی نہیں ہے جس کا کوئی دوست نہیں ہے۔'' دو لوگوں کا بغیر کسی لالچ کے ملنا جس میں مقصد ''کتھارسس'' ہو، جس کا مقصد دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہو، جادوئی نتائج رکھتا ہے۔ایسے کئی گروپس لاہور، کراچی وغیرہ میں ہیں جو ہفتے میں ایک مرتبہ یا کم از کم مہینے میں ایک مرتبہ آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔اگر آپ کے شہر میں ایسا کوئی گروپ ہے تو اس میں شامل ہوں۔اگر نہیں ہے تو آپ ایسے گروپ کا آغاز کر سکتے ہیں۔

ہم سب کو مستقلاً آگے بڑھنے کیلئے ستائش باہمی کی ضرورت ہوتی ہے۔اس طرح سفر چلتا رہتا ہے۔یوں، کارواں بنتا رہتا ہے اور منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ہر انسان دوسرے انسانوں کا محتاج ہے۔اسے محبت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، تعریف کی بھی ضرورت ہے، توجہ کی بھی ضرورت ہے۔وقت، توجہ اور قربانی اگر کسی تعلق میں یہ تین چیزیں نہیں ہیں تو اس میں روح نہیں ہوگی۔پھر وہ نام کا تعلق ہوگا۔وہ دنیا کو تو نظر آئے گا، وہ کاغذوں میں تو نظر آئے گا، لیکن اس میں سے اسپرٹ غائب ہوگی۔

کرپشن، اقدار سے لاعلمی کے باعث

آج انسان نے اخلاقی اقدار کو بے ہنگم اور بے ترتیب کر کے رکھ دیا ہے۔ بعض اقدار کا تعلق ذاتی زندگی سے ہے تو بعض کا اس کی پیشہ وارانہ زندگی سے۔ بعض اقدار اسلامی ہیں۔ لیکن، یہ سب اقدار کا شعور نہ ہونے کے باعث تتر بتر ہیں۔ نہیں معلوم کہ کون سی قدر کہاں درکار ہے۔ اقدار کا تعین نہ ہو تو معاشرے میں سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ کرپشن پھیلتی ہے۔ مثلاً بینکوں میں پروفیشنل خامیاں ہیں۔ ایک شخص پروفیسر ہے۔ جاب کرتا ہے لیکن پڑھاتا نہیں ہے۔ یہ کرپشن ہے، بددیانتی ہے۔ ایک دودھ فروش دودھ بیچتا ہے لیکن پانی ڈالتا ہے۔ یہ کرپشن ہے۔ ایک ملازم اپنی ذمے داری قبول نہیں کرتا۔ یہ کرپشن ہے۔ یہ سب چیزیں کردار کو ظاہر کرتی ہیں۔ اگر کردار اچھا نہیں ہے تو کامیابی زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ جو شخص یہ کہے کہ صرف میں ہی میں ہوں، وہ زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکتا۔ کامیابی کیلئے لازم ہے کہ آدمی یہ مانے کہ میری کامیابی کئی لوگوں کے دم سے ہے۔ سب ہیں تو میں ہوں۔ جو مانتا ہے کہ سب کے دم سے میری کامیابی ہے، سب ہیں تو میری کامیابی ہے۔ جو اپنے ہر ملازم کو اہم سمجھتا ہو، جو یہ سمجھتا ہو کہ چھوٹے چھوٹے دانوں کے ملنے سے تسبیح بنتی ہے، وہی زیادہ آگے جاتا ہے اور اسی فرد کی کامیابی برقرار بھی رہتی ہے۔

محرومیوں کو کامیابی میں بدلیے

''ناکامیاں اور محرومیاں تمہاری کامیابی کا پہلا قدم ہیں۔ کبھی ہمت نہ ہارو!''

جمی والوانو

انسان کا دنیا میں ہونا اور کام کرنا اس بات کی علامت ہے کہ قدرت کا جو کارخانہ چل رہا ہے، اس میں اس کا کوئی نہ کوئی کردار ہے۔ جس طرح ایک گاڑی بہت سے کل پُرزوں کا مجموعہ ہوتی ہے، ہر پُرزے کا اپنا کردار ہوتا ہے اور ہر شے اپنی جگہ پرفٹ ہوتی ہے، اسی طرح انسان بھی قدرت کے نظام میں کہیں نہ کہیں فٹ ہے اور اس کا اہم کردار جاری ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کردار کس نوعیت کا ہے، کتنا چھوٹا ہے یا کتنا بڑا ہے۔

بعض لوگ یہاں اس مخمصے میں پڑ جاتے ہیں کہ ہمارے اندر فلاں کمزوری ہے، ہمارے ساتھ فلاں محرومی ہے وغیرہ۔ یاد رکھیے، اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو برابر کے وسائل کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ قدرت ظلم نہیں کرتی۔ اس کیلئے کوئی امیر ہے اور نہ کوئی غریب ہے۔ امیری غریبی، حاکم و محکوم کے تصورات انسانی تصورات ہیں جو اس نے اس دنیا کا نظم چلانے کیلئے اختیار کیے ہیں۔ اگر کوئی بہ ظاہر کسی محرومی کے ساتھ پیدا ہوا ہے تو وہ محرومی بے وجہ نہیں ہو سکتی۔ اس میں بھی قدرت کی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔

ایک محروم ترین نوجوان کی کہانی

محرومی کے حوالے سے بہترین مثال نک وائے چچ کی ہے۔ نک ایسا نوجوان ہے جس

کے دونوں بازو ہیں اور نہ دونوں ٹانگیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ کام کر رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر محرومی کے باوجود میرا اس دنیا میں کردار ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جو شخص صحیح سلامت ہے، دنیا میں اس کا کوئی کردار نہ ہو۔

نک وائے چچ جب اپنی دنیا میں آیا تو اپنی حالت دیکھ کر اس زندگی سے تنگ آ گیا۔ اس نے پہلی دفعہ آٹھ برس کی عمر میں خودکشی کرنے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام رہا۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ خودکشی کی کوشش کی تب بھی ناکام ہوا۔ جب دوسری بار بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے سوچا کہ ضرور کچھ نہ کچھ ایسا ہے جس کی وجہ سے مجھے ناکامی ہو رہی ہے۔ وہ غور کرنے لگا کہ ضرور میرا دنیا میں آنے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ مجھے جینا ہے۔ پھر وہ تعلیم حاصل کرنے لگا۔ تعلیم کے دوران اسے دنیا کی باتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے خوشی سے اس زندگی کو قبول کر لیا۔ وہ کہتا ہے کہ ''چونکہ مجھے زندگی سے محبت ہے، اس لیے میں خوش ہوں۔''

ایک لیکچر کے دوران نک نے کہا کہ میں محروم ہوں، لیکن اس کے باوجود ایک نارمل شخص کی طرح زندگی گزار رہا ہوں اور خوش ہوں۔ کیا کوئی لڑکی مجھے قبول کرے گی۔ اسی لیکچر میں ایک خوبصورت لڑکی نے اس کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر لیا۔ خوشی کیلئے پہلی شرط یہ ہے کہ آپ کو زندگی سے محبت ہو۔

اس کی فکر چھوڑیے جو آپ کے اختیار میں نہیں

سائنس جتنی بھی ترقی کر لے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ والدین بدل جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ سانسوں میں اضافہ ہو جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ موت کا وقت بدل جائے۔ انسان اپنی شکل و صورت نہیں بدل سکتا، لیکن اپنی عقل، سمجھ اور فہم ضرور تبدیل کر سکتا ہے۔ جن چیزوں کو بدلا جا سکتا ہے ان میں ہمارا رویہ، سوچنے کا انداز اور ردِعمل یعنی برتاؤ ہے۔

زندگی ایک عمل ہے اور زندگی کے بعد کا وقت ردِ عمل ہے جسے آخرت کہا جاتا ہے۔ آخرت میں انسان اپنے عمل کو کیش کرتا ہے۔ اگر زندگی میں اس کا عمل صحیح رہا تو بہترین اجر ملے گا، ورنہ سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔

سب سے بڑا استاد

اس کائنات میں فطرت سب سے بڑی استاد ہے۔ یہ ہر لمحہ انسان کو سکھاتی ہے۔ قدرت جس کو سکھانا چاہتی ہے، اس کے ساتھ ایک عمل کو اتنی بار دہراتی رہتی ہے جب تک انسان سیکھ نہیں جاتا۔ لیکن جو انسان غور نہیں کرتا تو وہ سبق سے محروم رہتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی عمل بار بار ہوتا رہے۔ قدرت انسان کے ساتھ یہ معاملہ اس لیے کرتی ہے کہ وہ زندگی کو قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "تم میرا شکر ادا کرو، میں تمہیں اور دوں گا۔" شکر کا مطلب ہے کہ ہمیں جو کچھ ملا ہے، ہم اس کو قبول کر لیں، گلے شکوے نہ کریں۔ نک کہتا ہے کہ "کامیابی یہ نہیں کہ میں کھڑا ہوں بلکہ کامیابی یہ ہے کہ میں اپنا کام خود کرتا ہوں۔"

حضرت شیخ سعدیؒ کہیں جا رہے تھے۔ پاؤں میں جوتی نہیں تھی۔ دل میں خیال آیا کہ میرے پاؤں میں جوتی نہیں ہے۔ جب تھوڑا آگے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص کے پاؤں ہی نہیں تھے۔ آپؒ فوراً سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اے باری تعالیٰ، میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں صحیح سلامت ہوں۔ کیا ہوا اگر پاؤں میں جوتی نہیں ہے، آپ نے مجھے پاؤں کی دولت سے تو نوازا ہے۔

شکوہ یا شکر؟

انسان جس مقام پر گلہ کرتا ہے، اکثر اصل مقام شکر وہی ہوتا ہے۔ کمی اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خاص برتاؤ ہے ورنہ جن لوگوں کے پاس سب کچھ ہوتا ہے،

لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق نہیں ہوتا، وہی درحقیقت محروم لوگ ہوتے ہیں۔

امریکا میں ایک شخص حادثے کی وجہ سے کوما میں چلا گیا۔ انیس دن بعد جب اسے ہوش آیا تو اس نے رونا شروع کر دیا اور کہا کہ اے اللہ، اگر یہ جسم کام میں نہیں آ سکتا تھا تو پھر تو نے مجھے زندہ کیوں رکھا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ تو مجھے اٹھا لے۔ اسی دوران اسے آواز آئی کہ جس زبان سے تم یہ شکوہ کر رہے ہو، اس سے شکر بھی ادا کر سکتے تھے۔ اس آواز کے بعد اس نے غور کیا اور سوچا کہ اس زبان سے تو میں ہزاروں کام لے سکتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے ان کاموں کی فہرست بنائی جو وہ اس حالت میں بھی کر سکتا تھا۔ پھر اس نے وہ کام شروع کر دیا۔ ایک دن وہ بھی آیا کہ وہ امریکا کا بہترین موٹیویشنل اسپیکر اور ٹرینر بن گیا اور اس کے لیکچر کے ٹکٹ مہنگے داموں فروخت ہونا شروع ہو گئے۔ نک کہتا ہے کہ ''معجزے کی تلاش میں نہ رہو بلکہ خود معجزہ بنو۔''

نک مزید کہتا ہے: ''میں نے آج تک کسی شکر گزار انسان کو پریشان نہیں دیکھا، اور میں نے آج تک پریشان کو شکر گزار نہیں دیکھا۔''

''اس دنیا میں سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ تم نہیں کر سکتے۔''

''ہاتھوں اور بازوؤں سے زیادہ طاقتور چیز آپ کا ولولہ اور جوش ہوتا ہے۔''

''مقصد والی زندگی میں خود ترسی نہیں ہوتی۔''

''شاید ممکن ہے، آپ کو راستہ نظر نہ آ رہا ہو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ راستہ ہے ہی نہیں۔''

''زندگی کے بعض غم چوٹیں، تکلیفیں اور پریشانیاں آپ کو فائدہ دے کر جاتی ہیں۔''

''اگر میں خدا کا کوئی اور نام رکھوں تو محبت رکھوں۔''

''دنیا میں جن کی وجہ سے فرق پڑتا ہے وہ برا نہیں مناتے اور جو برا مناتے ہیں ان کی وجہ سے فرق ہی نہیں پڑتا۔''

''تبدیلی کا انتظار چھوڑ کر خود تبدیلی بن جاؤ۔''

''دنیا میں تم ایک بار آئے ہو۔ یہ ایک بار بھی کافی ہے، اگر تم کچھ کر کے دکھا دو۔''

ہم نے اپنی محرمیوں اور خامیوں کے باوجود اپنا وجود ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی خامیوں کو قبول کیجیے۔ جو چیزیں تبدیل نہیں ہو سکتیں، انھیں چھوڑ دیجیے اور جو تبدیل ہو سکتی ہیں، انھیں تبدیل کرنے کی کوشش کیجیے۔

خامیوں پر فوکس نہ کیجیے

اپنی خامیوں پر توجہ مرکوز کرنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ یہ خود اعتمادی میں کمی کر دیتی ہیں۔ آدمی زندگی کا سامنا کرنے کی بجائے دوسرے ذرائع تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لہٰذا، جو جو خامیاں ہیں ان کی فہرست بنائیے اور اس طرح کے لوگ تلاش کیجیے جن میں یہ خامیاں تھیں اور انھوں نے کیسے ان خامیوں پر قابو پا کر کامیابی حاصل کی۔ انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جو اپنی ناکامیوں کو کامیابیوں میں بدل سکتا ہے۔ سو بار ناکام ہونا اس کو ناکام نہیں کرتا، بہ شرط یہ کہ وہ ناکام ہونا نہ چاہے۔

اپنی زندگی میں شکر گزاری کو شامل کیجیے۔ شکر گزاری کا مطلب یہ نہیں کہ صرف زبان سے کہہ دیا کہ شکر ہے بلکہ شکر آپ کی حرکات و سکنات سے بھی نظر آئے۔ جو شخص شکر گزار ہوتا ہے، اس سے مثبت شعاعیں نکلتی اور کائنات میں منتشر ہو جاتی ہیں۔ اس کے بدلے میں اسے بھی مثبت شعاعیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں جس کے نتیجے میں اس کی زندگی میں کامیابی کے زیادہ ذرائع پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ حدیث کا مفہوم ہے کہ ''جو شخص انسانوں کا شکر گزار نہیں ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر گزار نہیں ہے۔'' جو شخص لوگوں کا شکر ادا کرتا ہے، درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔

حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''پہاڑ پر جانے کے سو راستے ہوتے ہیں،

لیکن تمہارے لیے ایک راستہ ہوتا ہے جس پر تم چلتے ہو۔ تم اپنا راستہ واضح کرو کہ تم نے کس راستے پر چل کر منزل پر پہنچنا ہے۔" ہر بڑے انسان کو اپنے حال سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ تبدیلی چاہتا ہے۔ یہ مادہ جتنا زیادہ ہوتا ہے، اتنی جلدی تبدیلی آتی ہے۔ کسی نے انھونی روبنس سے پوچھا، تم اتنے بڑے ٹرینر کیسے بن گئے؟ اس نے کہا، لوگوں نے جو کام برسوں میں کیا، میں نے وہ دنوں میں کیا۔ آج سے اپنی زندگی کو اس طرح دیکھیے جس طرح ایک ہیرو دیکھتا ہے، جس طرح ایک کامیاب شخص دیکھتا ہے۔

خاندانی نظام اور عورتوں پر تشدد

"اپنے بزنس کی خاطر کبھی اپنی فیملی کو نظر انداز نہ کرو!"

والٹ ڈزنی

پاکستانی معاشرے میں عورتوں پر تشدد کے کئی عوامل ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس وسیع موضوع پر اس تحریر میں مختصراً تمام عوامل پر جستہ جستہ بات کی جاسکے۔

ہمارے ہاں یہ آگہی نہیں ہے کہ جس کی شادی ہونے جارہی ہے، کیا وہ شادی کے قابل بھی ہے کہ نہیں۔ فقط بلوغت کا آجانا، نوکری کا لگ جانا ہی قابلیت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں ہیں جو خوشگوار ازدواجی زندگی کیلئے ضروری ہیں۔ ہمارے ہاں والدین نہ اچھا داماد تیار کررہے ہیں اور نہ اچھی بہو۔ وہ صرف اچھا بیٹا اور بیٹی تیار کررہے ہیں۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ جس کی شادی ہورہی ہے، اس کا رویہ ہمارے ساتھ اچھا نہیں ہے، رشتے داروں کے ساتھ اچھا نہیں ہے، دوستوں کے ساتھ اچھا نہیں ہے تو پھر اس کی زندگی میں آنے والی عورت کے ساتھ کیسے اچھا ہوسکتا ہے۔

عورت ملکیت نہیں

برصغیر میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ عورت برابری کی سطح پر نہیں ہے۔ یہاں مرد عورت کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ بھی مسئلہ ہے کہ لوگوں کے اندر شک ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ منفی ہوجاتے ہیں۔ پھر یہی منفی سوچ انھیں متشدد رویہ اپنانے پر مجبور کرتی ہے۔ منفی

سوچ کی تشکیل میں معاشرے کا کردار بہت ہے۔ جہاں مرد پر ملازمت کا دباؤ اور گھر کی ذمے داریاں ہیں تو یہی دباؤ بیوی پر نکلتا ہے۔ منفی سوچ بنانے میں غربت کا بھی بہت بڑا کردار ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکا نفسیاتی عارضے کا شکار ہوتا ہے۔ گھر والے اس کا آسان حل یہ ڈھونڈتے ہیں کہ اس کی شادی کر دیتے ہیں۔ شادی کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ لڑکی خود ہی اسے ٹھیک کر لے گی۔ لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ لڑکے کے نارمل نہ ہونے کی وجہ سے ازدواجی زندگی بھی نارمل نہیں رہتی۔ جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی نفسیاتی عارضے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ عورت کا کردار بہت کمزور ہے، اس لیے وہ اسی کمزوری کو قسمت کا لکھا سمجھ لیتی ہے۔

ہمارے ہاں کسی بدکردار شوہر سے طلاق لینے کو بھی غلط سمجھا جاتا ہے۔ وہاں پر بھی نباہ کرنے کی بات کی جاتی ہے۔ اگر کوئی اس عورت کی جگہ پر آ کر سوچے تو پتا چلے کہ یہ بات اسے زندہ درگور کر دینے کے مترادف ہے۔

جنازہ ہی آنا چاہیے

ایک یہ بھی رویہ پایا جاتا ہے کہ جب والدین اپنی بیٹی کو رخصت کرتے ہیں تو اسے کہتے ہیں کہ اب اس گھر سے تمہارا جنازہ ہی آنا چاہیے۔ یہ بہت زیادتی والی بات ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ عورت پھر ایک دن نہیں مرتی، بلکہ وہ روز مرنا شروع ہو جاتی ہے۔ والدین کا یہ کہنا دراصل اسلام کے علیحدگی کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ یہ اسلامی طریقہ نہیں، ہندوانہ کلچر ہے۔

شادی کے ان مسائل سے بچنے کیلئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ کس کی شادی کس کے ساتھ ہونی چاہیے۔ شادی کیلئے صرف لڑکا اور لڑکی ہونا کافی نہیں ہے بلکہ دونوں کے مزاج کو پرکھنا، مزاج کا ساتھ چلنا اور مستقبل کی منصوبہ بندی ضروری ہے۔ مثال کے

طور پر، ایک لڑکی جاب کرتی ہے۔ اس کی وجہ سے اس پر جاب کی ذمے داری ہے اور گھر کی بھی۔ اگر کوئی اس کے ساتھ شادی کا سوچتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ کل کلاں کو جب بچے ہوں گے تو اُن کی پرورش کیسے ہوگی، گھر کس طرح چلے گا، زندگی کا ڈھب کیا ہوگا تو پھر ایسی شادی کامیاب نہیں ہوگی۔

شادی کیلئے ماہرین سے کیوں رہنمائی نہیں لیتے

آنکھ کی دوائی لینے کیلئے ہمیں آئی اسپشلسٹ کا پتا ہوتا ہے۔ دانتوں کے علاج کیلئے ڈنٹسٹ کے پاس جاتے ہیں۔ ہمیں دل اور گردے کے ڈاکٹر کا پتا ہوتا ہے لیکن جب دو بچوں کی شادی کرانے جا رہے ہوتے ہیں تو جس کو کچھ پتا نہیں ہوتا، اس سے استخارہ نکلواتے ہیں۔

شادی طے کرتے وقت یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا لڑکی اور لڑکے کا مزاج آپس میں ملتا ہے یا نہیں۔ صرف ظاہری کردار سے کام نہیں چلتا، اگر ان دونوں کی شخصیت نہیں ملتی تو زندگی کے چھوٹے بڑے معاملات میں بے تکے جھگڑے جنم لیتے ہیں۔

جدید کمرشل ازم سے خاندانی زندگی پر تباہی

آج شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کریں تو راستے میں کتنے ہی برانڈز اور کتنے ماڈل نظر آتے ہیں۔ اس گلیمر کی وجہ سے اسٹینڈرڈ بدلتے ہیں اور احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔ فلموں اور ٹی وی ڈراموں نے جو ظلم ڈھایا ہے، اس کا ادراک تو والدین کو ہے ہی نہیں۔ پھر جس کی زندگی اچھی نہیں ہوتی تو وہ خود کو تخیلاتی دنیا میں ایک ہیروئن یا ہیرو سمجھنے لگتا ہے۔ چونکہ ڈراموں اور اشتہاروں میں دکھائی جانے والی زندگی، حقیقی زندگی سے کوئی تال میل نہیں رکھتی، اس لیے شادی کے بعد میاں بیوی میں شدید ذہنی اور جذباتی بُعد پیدا ہو جاتا

ہے۔اس کے بلاواسطہ اثرات ان کے بچوں پر پڑتے ہیں۔

بے شمار لوگ ایسے ہیں جو شادی شدہ ہیں، لیکن کردار اچھا نہیں ہے۔ مزاج پر گرفت نہیں ہے۔جذباتی طور پر مضبوط نہیں ہیں۔اس وجہ سے ان کے گھروں میں الجھنیں اور گھٹن پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اس فرسٹریشن کو کہیں نہ کہیں نکالتے ہیں۔

جھگڑوں کی ایک وجہ غربت ہوتی ہے۔لیکن ساری وجوہ غربت نہیں ہیں۔ایسا نہیں کہ امیر گھرانوں میں میاں بیوی کے درمیان جھگڑے نہ ہوتے ہوں۔ بڑے بڑے اسٹیٹس والے لوگوں کے ہاں بھی طلاقیں ہو جاتی ہیں۔ وہاں پیسہ مسئلہ نہیں ہوتا، وہاں نفسیاتی خلیج حائل ہوتی ہے۔ امیر گھرانوں میں تفہیم اور انا کا مسائل زیادہ ہوتے ہیں۔ عدم برداشت کا مسئلہ ہوتا ہے۔

خواتین کی زبان درازی

تشدد کے حوالے سے عورتیں بھی زیادتی کر جاتی ہیں۔ وہ اس کا اظہار اپنی زبان کے ذریعے کرتی ہیں۔ بعض مرد دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں، ان کا رویہ بہت اچھا ہوتا ہے لیکن وہ عورت پر اس لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں کہ عورت اپنی زبان سے انھیں ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یا پھر ایسا رویہ اپناتی ہے یا اس کا انداز اچھا نہیں ہوتا یا ضد اختیار کر لیتی ہے یا جلد بازی اختیار کرتی ہے کہ مرد ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات ایسے معاملات ہوتے ہیں کہ اگر مرد اپنی بیوی کو دن بھر کی روداد سنانا چاہتا ہے تو آگے سے بیوی منہ بسور لیتی ہے۔ یوں رابطے کا احساس پیدا ہونے کی بجائے دوری پیدا ہوتی ہے۔ پھر مرد اسے کچھ سنانے کی بجائے اپنے اندر نفرت پالنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر ایک دوسرے کو سمجھا نہیں جائے گا تو گھر سکون کا باعث نہیں بنے گا۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''اگر اپنا گھر سکون کا باعث نہیں ہے تو پھر توبہ کا مقام ہے۔''

چار تعلق

شادی صرف جسمانی تعلق کا نام نہیں ہے۔شادی دماغی تعلق، جذباتی تعلق اور روحانی تعلق کا بھی نام ہے۔عورت اور مرد کے درمیان پہلا تعلق قدرتی ہے، جبکہ باقی تین تعلق خود پیدا کرنے پڑتے ہیں۔اگر یہ تعلقات پیدا نہیں کیے جاتے تو پھر پہلا تعلق بھی مضبوط نہیں رہتا۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مرد جب بوڑھا ہوتا ہے تو اس وقت اسے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے تو بیوی سہارا دینے کو تیار نہیں ہوتی۔جب بڑھاپا تنہائی والا ہوگا تو اس کا مطلب ہے، زندگی میں کاروبار چلایا ہے، پیسہ بنایا ہے، جبکہ تعلق نہیں بنایا۔

دنیا کی بہترین نرس سے بہتر اپنی بیوی ہے۔اگر وہ محبت کرتی ہے تو اس سے زیادہ اچھی نگہداشت کرنے والی اور کوئی نہیں ہے۔ہم ماؤں کی عظمت پر مضمون لکھتے ہیں، بیویوں کی عظمت پر بھی بات کرنی چاہیے۔دوسری طرف یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ خاوند کتنی محنت کرتا ہے۔دکان چلانا کتنا مشکل ہے۔کاروبار کرنا کتنا مشکل ہے۔جاب کرنا کتنا مشکل ہے اور کما کر لانا کتنا مشکل ہے۔اس کی بھی عزت اور قدر کرنی چاہیے۔یہ دوطرفہ قدر ہے۔بیوی خاوند کی قدر کرے جبکہ خاوند بیوی کی قدر کرے۔

اسلامی اقدار سے لاعلمی، ہندوانہ اقدار کی عمل داری

ایک رپورٹ کے مطابق، عورتوں پر بدترین تشدد کے حوالے سے پاکستان کا نمبر 147 واں ہے۔جبکہ ایک اور رپورٹ کے مطابق عورتوں کیلئے خطرناک ملک حوالے سے پاکستان کا تیسرا نمبر ہے۔تناسب کے لحاظ سے خیبر پختونخواہ پہلے نمبر پر ہے۔پھر اس کے بعد بلوچستان آتا ہے، پھر سندھ اور پھر پنجاب آتا ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں کا کلچر بہت سخت ہے۔عورت کو بھیڑ بکری سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں عورت سماج کی قدروں کی وجہ سے پس جاتی ہے۔ وہ ان اقدار کی وجہ سے اپنے حق کی بات نہیں کر سکتی بلکہ ستم تو یہ ہے کہ عورت اپنی شکایت کرنے سے بھی ڈرتی ہے۔

اگر ہم اپنی بیٹی کو، بہن کو یا بیوی کو حق نہیں دے سکتے تو پھر ہمیں جینے کا حق نہیں ہے۔ اگر ہم اسے مقام نہیں دے سکتے تو ہمیں بھی کوئی مقام نہیں ملنا چاہیے۔ جس عورت کیلئے لازم ہے کہ اسے عزت دی جائے، اگر اسے عزت نہیں ملتی تو پھر اچھی نسل کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔

ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ اسلام کی اقدار کیا ہیں۔ اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا۔ ہم جس نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ روز پڑھتے ہیں، ذرا دیکھیں کہ آپؐ اپنی بیٹی کیلئے چادر کیسے بچھاتے تھے۔ ہم کس کلمے اور کس وعدے کی بات کرتے ہیں۔ ہم صرف بات کرتے ہیں، عمل نہیں کرتے۔ ہم عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں، لیکن آپؐ کی سیرت مبارکہ کو رول ماڈل نہیں مانتے۔ ہمارے ہاں روایت، کلچر، سماج آگے نکل جاتا ہے، دین پیچھے رہ جاتا ہے۔

ہمیں اپنی اسلامی اقدار کو آگے بڑھانا ہوگا۔ ہمیں دین کی بات کرنی ہوگی۔ ہمارا دین تو وہ ہے جو عورت کو علم دینے کی بات کرتا ہے۔ ہمارا دین تو وہ ہے جو عورت کو جائیداد میں حصہ دیتا ہے۔ اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو کہتا ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جو کہتا ہے کہ والدین کو اف تک نہ کہو۔ یہ واحد مذہب ہے جو کہتا ہے کہ والدین کو مسکرا کر دیکھنے سے حج کا ثواب ملتا ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جو کہتا ہے کہ تم میں قابل قدر وہ ہے جو حیادار ہے۔ اسلام کا موازنہ کلچر، روایات اور سماج کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

جذبات اور خاندانی نظام

دنیا میں آج تک انسانی نفسیات پر جتنی بھی تحقیق ہوئی ہے، اس کے مطابق انسان کے

اندر 27 طرح کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ان میں سب سے طاقتور غصہ اور پیار ہے۔ ان میں اتنی طاقت ہے کہ یہ جنگیں کرا دیتے ہیں۔ یہ کھوپڑیوں کے مینار بنوا دیتے ہیں۔ یہ انسانی لاشوں کے ڈھیر لگوا دیتے ہیں۔ یہ ایسے خوف ناک جذبات ہیں کہ اگر کسی ایک پر غصہ ہو تو لقمہ اجل چار لوگ بن جاتے ہیں۔میاں بیوی کے جھگڑوں میں سب سے زیادہ نقصان بچوں کا ہوتا ہے۔ دونوں مل کر ایک ایسا گڑھا کھود لیتے ہیں کہ جس میں پوری نسل دفن ہو جاتی ہے۔ میاں بیوی کے جھگڑوں کی وجہ سے بچوں میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔اُن کے فیصلوں میں جلد بازی آ جاتی ہے۔ان کے اندر معاملہ فہمی نہیں ہوتی۔ان میں فیصلے کی قوت اچھی نہیں ہوتی۔ وہ زندگی میں ویژن کے بغیر ہوتے ہیں۔اور سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ انھوں نے بچپن میں اپنے ماں باپ کا جو غصہ دیکھا ہوتا ہے، وہی ان کے اندر پلنا شروع ہو جاتا ہے۔ جلتے رہنا، کڑھتے رہنا، تکلیف کو اکھٹے کرتے رہنا، اپنے جذبات کو دبا دیتے رہنا، ان بچوں کے اندر جارحانہ رویہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہ بہت زیادتی کی بات ہے۔اس سے بڑھ کر یہ نسلوں کی تباہی کی علامت ہے۔

مل بیٹھ کر فیصلہ کیجیے

اگر میاں بیوی دونوں سمجھ رکھتے ہوں تو دونوں کو مل کر جھگڑے کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ بعض اوقات ایک کی سمجھ داری، ایک کی مصلحت، ایک کا حوصلہ، ایک کا ظرف، ایک کی برداشت پورے خاندان کو بچا لیتی ہے۔ بعض اوقات عورتیں برداشت تو کر لیتی ہیں لیکن اپنے رویے میں وہ تبدیلی نہیں لا پاتیں کہ جس سے جھگڑا ختم ہو جائے۔ معاملہ فہمی یہ ہے کہ بیوی اپنی برداشت میں، اپنے رویے میں وہ تبدیلی لائے کہ خاوند کا ناپسندیدہ کردار بھی بدل جائے۔

اگر بیوی کی محبت سچی ہے، اس میں اخلاص ہے، اس کے اندر صبر ہے، اس کا واقعی اللہ تعالیٰ پر توکل ہے تو پھر خاوند کے رویے میں ضرور تبدیلی آئے گی۔ حضرت واصف علی

واصف" فرماتے ہیں، "جو بیوی اپنے خاوند کو دیوتا بناتی ہے، وہ دیوی کہلاتی ہے اور غلام کی بیوی غلام ہی کہلاتی ہے۔" اگر کسی میاں بیوی کا جھگڑا چل رہا ہے تو آج ہی بیوی فیصلہ کرے کہ اگر میرے میاں کا رویہ ٹھیک نہیں ہے تو کیا ہوا، میں اسے ٹھیک کر کے ہی رہوں گی۔ اسی طرح، خاوند یہ فیصلہ کرے کہ اگر میری بیوی میرے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہے تو کیا ہوا، مجھے یہ مسئلہ حل کر کے ہی چھوڑنا ہے۔

ایک شخص نے سقراط سے کہا کہ تم میں اتنی دانش کہاں سے آئی؟ اس نے جواب دیا، میرے گھر آ جانا۔ جب وہ شخص سقراط کے گھر گیا تو وہاں اسے عورت کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ یہ سن کر واپس آ گیا اور سقراط سے کہا کہ میں آپ کے گھر گیا تھا، لیکن آپ کے گھر میں تو کوئی دانش والی باتیں نہیں تھیں۔ وہاں سے کسی خاتون کے لڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سقراط نے جواب دیا، وہ میری بیوی کی آواز تھی۔ یہ دانش مجھے اس عورت کو برداشت کرنے سے ملی ہے۔

مہنگا گھر، مہنگی گاڑی، بڑی آسانیوں کا نام خوشی نہیں ہے۔ نکاح کے موقع پر جو دعا مانگی جاتی ہے، کبھی اس کے ترجمے پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ہم کیا مانگ رہے ہیں۔ شادی کے بعد دو طرفہ ذمے داریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک کی ذمے داری دوسرے پر ہوتی ہے اور دوسرے کی ذمے داری پہلے پر۔ جو شخص بھی نصیب کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے، اس کی زندگی میں سکون نہیں آ سکتا۔ سکون لانے کیلئے لازم ہے کہ اپنے نصیب پر راضی رہا جائے اور یہ سیکھا جائے کہ جو میرا نصیب ہے، وہ مجھے مل کر ہی رہے گا۔

موازنہ تباہی لاتا ہے

نصیب سے موازنہ کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ جب اختلاف ہوتا ہے تو گھر کا سسٹم نہیں بن پاتا۔ جس گھر میں سسٹم نہ ہو کہ چولھا کیسے چلنا ہے، کھانا کس نے پکانا ہے، گھر

کیسے چلانا ہے، معاملات کو کیسے ڈیل کرنا ہے، کس کی کیا ذمے داری ہے، یہ واضح نہ ہو کہ کس کا کیا مقام ہے تو پھر وہاں پر تشدد ہوتا ہے۔ یہ وہ سارے پروٹوکولز ہیں جو مل کر طے کرنے چاہئیں اور یہ پروٹوکولز تب طے ہوتے ہیں کہ جب آپس میں انڈراسٹینڈنگ ہو۔

جب خاوند اپنے والدین کی دل سے عزت کرے گا تو بیوی بھی ان کی خدمت کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ہمیں ادب بھی نہیں کرانا آتا۔ ساس بہو کے جھگڑوں کی سب سے بڑی وجہ گھر کا سسٹم نہ ہونا ہے۔ ایک چھوٹا سا نظام چلانا ہو تو اس کیلئے ایس او پیز طے کیے جاتے ہیں، جبکہ گھر تو زندگی کا سب سے اہم ادارہ ہے، اس کیلئے کوئی معیار اور کوئی نظام طے نہیں کیا جاتا۔ جب گھر میں کوئی قواعد وضوابط نہیں ہوں گے تو پھر برتن کے ساتھ برتن تو ٹکرائے گا۔

بیوی اور ماں کا کردار

والدین سے الگ ہونے میں یا تو بیوی کا کردار ہوتا ہے یا پھر ماں کا۔ اگر ماں اس نہج پر لے گئی ہے تو ماں کو چاہیے کہ اپنے بیٹے پر رحم کھائے۔ ان کے ادب کی وجہ سے وہ اچھا بیٹا تو بن جائے گا، لیکن اس کی نسل تباہ ہو جائے گی۔ اگر بیوی اس نہج پر لے گئی ہے تو وہ بھی رحم کھائے اور خاوند کو اپنی ماں کا گستاخ نہ بننے دے۔

ہمیں صرف اپنی ڈیوٹی ادا کر کے پاکستان کی خدمت نہیں کرنی، بلکہ ہمیں پاکستان کو اچھے شہری دینے ہیں۔ اگر ہم اچھے بیٹے کی شکل میں، اچھی بیٹی کی شکل میں ذمے دار داماد کی شکل میں، ذمے دار بہو کی شکل میں معاشرے کو نئی نسل نہیں دیں گے تو معاشرے میں کوئی انقلاب نہیں آئے گا، کوئی بہتری نہیں ہوگی۔ یہ بنیاد کا انقلاب ہے جو گھروں سے شروع ہوتا ہے، پھر یہ نسلوں کا انقلاب بنتا ہے اور پھر معاشروں کا انقلاب بنتا ہے۔

ولی ساز

''اس شخص کا شکریہ ادا کرو کہ جس نے ایسی زیادتی کی کہ اس کے بعد اللہ یاد آ گیا!''

واصف علی واصف

ہماری زندگی میں عمر کا بھی سفر ہے اور فکر کا بھی سفر ہے۔ بہت سے لوگ اسے صرف عمر کا سفر سمجھتے ہیں۔ عمر میں اضافے کے ساتھ فکر کا نہ بڑھنا، زندگی کا مزہ کرکرا کر دیتا ہے۔ پھر سفید بالوں کی وجہ سے اپنے چھوٹوں پر رعب تو ڈالا جا سکتا ہے، لیکن اندر اطمینانِ قلب پیدا نہیں ہوتا اور نہ ذہنی پختگی آتی ہے۔ ہم بزرگانِ دین کی سوانح حیات پڑھتے ہیں اور ان کے واقعات سے متعارف ہوتے ہیں کہ ایک بزرگ بارہ سال پانی میں کھڑے رہے یا ایک بزرگ دن میں دو بار قرآن پاک ختم کرتے تھے۔ اس طرح کے اور بھی بے شمار واقعات ہیں جنھوں نے اگر اُن بزرگوں کی شان بلند کی تو ساتھ ہی ساتھ ولایت کو یا اللہ کے تعلق کو مشکل بنا دیا۔

آج کے دور میں جو نوجوان تعلیم حاصل کر رہا ہے یا نوکری کر رہا ہے یا اپنا کاروبار کر رہا ہے، اس کیلئے ممکن نہیں ہے کہ وہ بارہ سال چلّے میں گزار دے۔ آج کے انسان کی زندگی میں بہت تیزی آ گئی ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ شہر کی زندگی میں دن گزرنے کا پتا نہیں چلتا جبکہ گاؤں دن اور رات بہت بڑے معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ وقت ایک ہی جیسا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہروں میں بہت سارے معاملات انسان کے ساتھ جڑ گئے ہیں جو گاؤں میں نہیں ہوتے۔ آج کا دور اتنا تیز ہو گیا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے گناہ بہت

جلدی پھیل جاتا ہے، وہیں نیکی پھیلنے کی رفتار بھی بہت تیز ہوگئی ہے۔ آج سے بیس تیس سال پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ویڈیو انٹرنیٹ پر اپ لوڈ کی جائے تو یہ منٹوں میں پوری دنیا میں پھیل جائے گی۔

بھگوڑا

انسان کے اندر ایک بھگوڑا ہے جسے نفس کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا خوف ناک ہے کہ وہ اپنے سوار کو ایسے برے طریقے سے گراتا ہے کہ ساری ریاضت تباہ ہو جاتی ہے۔ نفس لالچ کو، ہوس کو، شہرت کی تمنا کو، کسی کی حق تلفی کو معبود بنا دیتا ہے۔ شیطان صرف معبود بنانے میں معاون ہوتا ہے، وہ معبود نہیں بنتا۔ اس کو پتا ہے کہ میں تخلیق ہوں، میں مخلوق ہوں۔ خالق وہی ہے۔ یہ نفس ہی ہے جو اتنی بڑی غلطی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سارا کچھ مجھ پر لگا دو، جبکہ ہم کسی محترمہ پر لگا دیتے ہیں، یعنی مجاز پر لگا دیتے ہیں۔ یہ کام کرانے میں شیطان معاون ہوتا ہے۔ بزرگانِ دین کو یہ حکمت سمجھ آ گئی تو انھوں نے اس حکمت کو جاننے کے بعد نفس کو اتنی ریاضت میں ڈال دیا کہ نفس سر ہی نہ اٹھا سکے۔

عمارت کی بلندی سے زیادہ بنیاد کی گہرائی اہم ہے

ہم بننے کے بعد لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ اس کے بننے کے مراحل نہیں دیکھتے۔ ہمیں عمارت نظر آتی ہے، مگر عمارت کی بنیادوں میں جو محنت کی گئی ہے، وہ نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ بننے کا عمل غارِ حرا کی سنت کو پورا کرتا ہے۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہدایت کا پیغام لے کر مخلوق کی طرف لوٹتی ہے۔ ریاضت کا سفر اس لیے ہوتا ہے کہ کہیں یہ نہ ہو کہ بندہ خدمت کرنے کی اہلیت کے بغیر چلا جائے۔

نفس کو قابو کرنے کے بعد خدمت کا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے تقرب کا راستہ

دراصل خدمت کا راستہ ہے۔ ہم یہ نہیں دیکھتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف عبادت کرنا ہی بہت بڑا تقرب ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے شدید عبادت کی، لیکن مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا، کبر آ گیا، یہ غلط فہمی آ گئی کہ میرے سوا سب گناہگار ہیں۔ خالق کا قرب جب بھی ملے گا، آدمی مخلوق پر مہربان ہو جائے گا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ مصور سے تو محبت ہو، جبکہ اس کی مصوری سے نفرت ہو۔ جس انسان سے ہم بڑی نفرت کرتے ہیں، اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اگر اس کی تخلیق بھی اللہ تعالیٰ نے کی ہے تو پھر نفرت کا حق نہیں بنتا۔ تو پھر، یا تو خالق سے محبت کا دعویٰ جھوٹا ہے یا اگر خالق سے سچی محبت ہے تو اس کی مخلوق سے بھی محبت ہوگی۔

خدمت کا معیار

خدمت دو طرح کی ہے۔ ایک خدمت تو ''خدمت برائے خدا'' ہے کہ میں اللہ کیلئے خدمت کرتا ہوں، اسی سے مجھے اس خدمت کا اجر چاہیے۔ جبکہ ایسے بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے خدمت کے نام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں، ہم مخلوق کی خدمت کر رہے ہیں لیکن ساتھ ہی آواز آتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی فیس دو ہزار روپے ہے۔ بہت سے لوگ پڑھا رہے ہیں۔ وہ اس پیشے کو پیغمبری پیشہ بھی سمجھتے ہیں، لیکن اس کی اجرت بھی طلب کرتے ہیں۔ غور کیا جائے تو یہ ایک بیماری ہے اس کا تعلق جسم سے نہیں، دل سے ہے۔ اس کو لالچ کہا جاتا ہے اور یہ مر کر ہی ختم ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی میں سکونِ قلب نہیں ہوتا، کیونکہ لالچ نے سکونِ قلب پر قبضہ جمایا ہوتا ہے۔ ان کے پاس پیسہ تو بہت آ جاتا ہے، لیکن سکونِ قلب نہیں آتا۔

ایک عورت نے شکایت کی کہ میرا بیٹا مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ اس کے اندر شدید بغاوت ہے۔ جب اس عورت کا ماضی دیکھا گیا تو پتا چلا کہ جب اس کا بیٹا چھوٹا تھا تو اس وقت وہ

عورت نوکری یا کوئی کام کرتی تھی جبکہ اس کے بیٹے کو دوسری عورت سنبھالتی تھی۔ وہ عورت اپنے بیٹے کو زیادہ وقت نہیں دے پاتی تھی۔ اب یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی کو پیار دیا ہو اور وہ جواب میں پیار نہ دے۔ جو چیز جب رکھنی چاہیے تھی، وقت بھی تھا، جب رکھی نہیں اور آج اس کا تقاضا ہو رہا ہے۔ قدرت کے قانون میں یہ ممکن نہیں ہے۔

خالق کے ساتھ تعلق کیلئے

اگر ہم اللہ تعالیٰ کے تقرب کے راستے پر چلنا چاہتے ہیں تو اس کیلئے لازم ہے کہ اس کی مخلوق کے ساتھ وابستگی اور محبت پیدا کریں۔ اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی نیک لوگ گزرے ہیں، انھوں نے مخلوق کی خدمت کی۔ مخلوق تو چلی گئی لیکن خالق نے ان کا نام زندہ رکھا۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم چاہتے کہ کوئی ہمیں یاد رکھے، مگر خدمت کیلئے تیار نہیں۔ مخلوق کی خدمت آسان نہیں ہے۔ اس کیلئے ٹینشن لینی پڑے گی۔ اس کے بعد خیال آئے گا کہ میری بھی خدمت کی جائے، مجھ پر بھی نیکی ہو، مجھ پر بھی احسان ہو، میرے ایکشن پر بھی ردعمل آئے اور میری نیکی کی شہرت ہو۔ اللہ تعالیٰ کیلئے جو کرے گا، اسے پورا یقین ہوگا کہ وہ سمیع و بصیر ہے۔ جس کو پورا یقین ہے کہ کائنات کی بہترین سے بہتر آنکھ اللہ کی آنکھ ہے اور وہ دیکھ رہی ہے۔ اس کائنات میں سب سے محفوظ بینک اللہ تعالیٰ کا بینک ہے۔ سب سے بہترین حساب دینے والا اور نفع دینے والا اللہ ہے۔ پھر وہ مخلوق پر نیکی کر کے مخلوق سے طلبگار نہیں ہوگا۔

معاف کر دینا آسان نہیں

آج کے دور میں کہ جب بے حیائی کی بھرمار ہے، گناہ جھولیوں میں گر رہے ہیں، اس کے باوجود نیکی کا راستہ اختیار کرنا ولی والا عمل ہے۔ حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں، "یہ دنیا جنگل ہے۔ اس دنیا میں دیانت داری سے زندگی گزارنا پورا چلہ ہے۔" سب سے بڑا چلہ

انسانوں کے ساتھ رہنا ہے۔ان کو برداشت کرنا،ان کی برائیوں کے باوجود ان پر آسانیاں کرنا ہے۔اس سے بھی نفس مرتا ہے۔ہٹلر کے گھر کے سامنے سے ایک بوڑھا گزر رہا تھا۔اس نے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔سر پر مٹی بھی پڑی ہوئی تھی۔ہٹلر نے اپنی چھت سے اسے دیکھا تو اسے کہا، رُکو۔بوڑھا رک گیا۔ہٹلر اندر گیا اور الماری سے ایک پتھر نکال کر اس بوڑھے کے قریب آیا اور اسے کہا کہ دوسری طرف دیکھو۔جب اس نے دوسری طرف دیکھا تو ہٹلر نے پیچھے سے اس کو وہ پتھر مار دیا۔پتھر مارنے کے بعد اسے کہا کہ یہ پتھر میں نے اس وقت سے سنبھال کر رکھا ہوا ہے جب تو نے اسکول کے زمانے میں مجھے یہ مارا تھا۔

ایک یہ عمل تھا،لیکن دوسری طرف ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے جو ہر کسی کو معاف فرما دیتے ہیں۔پھر کیوں نا ہم اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کو دیکھیں اور ان کی پیروی کریں، کیونکہ آپ تو مخلوق پر آسانیاں کرتے تھے۔آپ تو اس بڑھیا کو بھی معاف فرما دیتے جو کوڑا پھینکتی تھی۔ہم اپنے گھر کا کوڑا دیکھ نہیں سکتے،لیکن جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوڑا پھینکا،آپؐ نے اسے بھی معافی دی۔

بھٹی سے گزرنا ہوگا

اللہ تعالیٰ کی ذات جس کسی کو کوئی مقام دینا چاہتی ہے تو اسے خاص پروسس سے گزارتی ہے۔حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلے گا کہ آپؒ کیسے جناح سے قائداعظم بنے۔کیسے اللہ تعالیٰ کی ذات نے آپؒ کو کامیاب وکیل بنایا، پھر کیسے آپؒ وکالت سے نکلے اور لیڈر بن گئے۔پھر کیسے مالک کائنات انھیں بہترین پلیٹ فارم پر لے آیا اور لوگوں کے دلوں میں دھاک بٹھا دی کہ ایک گاؤں کا رہنے والا بھی تقریر سنتا ہے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ تو انگلش میں تقریر کر رہا ہے، اس کی تمھیں کیا سمجھ آ رہی ہے؟ تو دیہاتی جواب دیتا ہے کہ یہ جو کہتا ہے، صحیح کہتا ہے۔

تقرب تو تقرب والے کے پاس ہوتا ہے، جیسے کوئی گویا مل جائے تو اس سے گانے کی فرمائش کی جائے گی، کیونکہ گانا اس کی خاصیت ہے۔ جو جلا ہوا ہوتا ہے، وہ دوسروں کو جلاتا ہے۔ جس کے اندر جلنے کی خاصیت نہیں ہے، وہ کسی کو کیا جلائے گا۔ جس کے اندر تپش نہیں ہے، وہ کیا دوسروں کو گرمائے گا جس کے پاس خود اللہ تعالیٰ کا ساتھ نہیں ہے، وہ کیا دوسروں کو اللہ تعالیٰ کا ساتھ لینا سکھائے گا۔ اس لیے تقرب، تقرب والے سے ملتا ہے۔

زندگی میں بعض اوقات ساتھی ایسا رویہ لے کر آتا ہے کہ بندے کی کمینگی جاگ جاتی ہے، اس لیے کبھی کسی کی کمینگی کو نہیں جگانا چاہیے۔ ہمیشہ اچھائی کو جگانا چاہیے۔ اگر ایک آدمی غلط ہے تو اس کے ساتھ دل سے اتنا پیار کرو کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ محبت کرو تو بے غرض کرو۔ وہ کیا محبت ہوگی جو غرض کے ساتھ جڑی ہو کہ تم ٹھیک ہو تو میں بھی ٹھیک ہوں گا۔ بہ قولِ شاعر، ''وفا کرو گے، وفا کریں گے؛ جفا کرو گے، جفا کریں گے''۔ یہ اپروچ درست نہیں ہے بلکہ اس سے زندگی خراب ہی ہوتی ہے، کبھی سنور نہیں سکتی۔

روحانیت کے تین نقطے ہیں۔ روحانیت پیدائشی ہوگی یا زندگی کے کسی دوراہے پر جاگے گی یا پھر کوئی فرد زندگی میں آ کر روحانیت کو جگا دے گا۔

گداز کہاں سے ملے گا

ایک والد نے اپنے بیٹے سے کہا کہ میرا بیٹا، تم جو روحانیت کہتے رہتے ہو، ابھی تجھے نہیں ملے گی۔ جب تم مجھے دفنا کر چالیس قدم پیچھے ہٹو گے تو اس وقت روحانیت تمہارے پاس آ جائے گی۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ جب والد کا انتقال ہوا اور انھیں دفنایا گیا تو بیٹے نے چالیس قدم پیچھے رکھے ہی تھے کہ اس میں روحانیت آ گئی۔ وہ روحانیت درد کی صورت میں تھی۔ پھر اسے پتا لگا کہ گداز کیا ہوتا ہے۔ پھر پتا لگا کہ محبت کیا ہوتی ہے اور شفقت کیا ہوتی ہے۔ اس لیے بعض اوقات کسی قریبی کا پردہ فرما جانا بھی ولایت دے جاتا ہے۔

بعض لوگوں کی خاصیت ہی روحانیت ہوتی ہے۔ وہ زندگی میں آتے ہیں اور زندگی یوں بدلتی ہے کہ نالۂ نیم شب آ جاتا ہے، آنکھوں کی نمی آ جاتی ہے، تنہائیاں مل جاتی ہیں، تنہائیاں آ جاتی ہیں، کلام سمجھ میں آ جاتا ہے، درد آ جاتا ہے، احساس آ جاتا ہے۔ جس طرح نماز کی تکبیر ہوتی ہے تو سارے کھڑے ہو جاتے ہیں، اسی طرح روحانیت کی بھی تکبیر ہوتی ہے۔ جیسے ہی آدمی آتا ہے، ساتھ ہی تکبیر ہوتی ہے اور روحانیت جاگ جاتی ہے۔

بعض اوقات تربیت ایسی مل جاتی ہے کہ روحانیت جاگ جاتی ہے اور قرب اپنا جنم لے لیتا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں: ''صاحبِ حال کا تعلق صاحبِ حال بنا دیتا ہے۔'' یہ ممکن نہیں ہے کہ ولی سے محبت ہو اور ولایت نہ جائے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ ضروری نہیں کہ ولی کا بیٹا ولی ہو، کیونکہ تعلق کی بنیاد محبت ہے اور محبت بے غرض ہوتی ہے۔

ولی کون ہے؟

کسی نے سقراط سے پوچھا، عقل کہاں سے آئی؟ اس نے جواب دیا، میرے گھر آ جانا۔ جب وہ گھر گیا تو اس وقت سقراط گھر پر نہیں تھا، لیکن اندر سے گالیوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے سوچا، یہ کون ہو سکتا ہے۔ اس نے سقراط کو تلاش کیا اور کہا کہ آپ سے عقل کا پوچھا تھا۔ سقراط نے کہا، تمھیں جواب نہیں ملا۔ اس نے پوچھا، کیسے؟ سقراط نے کہا تم میرے گھر گئے ہو۔ اس نے جواب دیا، ہاں گیا تھا لیکن آپ نہیں تھے لیکن گالیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سقراط نے کہا، یہ آواز کس کی ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا، مجھے کیا پتا۔ سقراط نے کہا، وہ میری بیوی کی آواز تھی۔ اس شخص نے پوچھا، کیا وہ عقل بناتی ہے؟ سقراط نے کہا، ہاں... جو اس کو برداشت کرتا ہے، ولی بن جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کو برداشت کرنے والا ولی بن جاتا ہے۔ حضرت

واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''اس شخص کا بھی شکریہ ادا کرو جس نے کوئی ایسی زیادتی کی کہ اللہ یاد آ گیا۔ اس گناہ کا بھی شکریہ جس کی وجہ سے توبہ ایسی ہوئی کہ پھر ساری زندگی ہی نیک ہوگئی۔'' اس لیے ولی ساز ''مخلوق کی خدمت'' ہے، اور محبت کی بنیاد پر اللہ والے سے تعلق ولی ساز ہے۔

شخصیت کی بنیاد

''کتاب دانش کا پہلا باب دیانت ہے!''

تھامس جیفرسن

ہم جہاں اللہ تعالیٰ سے بہت سی دعائیں مانگتے ہیں.... خیر و برکت کی، حلال رزق کی، آسانیوں کی، اس کی رضا پر راضی ہونے کی، اولاد کی اچھی تربیت کی، والدین کی خدمت کی دعا، اور بہت سی دعائیں مانگتے ہیں، وہیں ہمیں یہ دعا بھی مانگنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اچھے دوست اور درست رہنمائی والے لوگوں کا ساتھ دے جو زندگی کی بہتری اور کامیابی میں معاون ہوں۔

میاں رضاء الرحمان بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جنھیں ہر کوئی اپنا دوست بنانا چاہتا ہے۔ میاں صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ کامیاب اسکول چلانے کے علاوہ اور بھی کاروبار کرتے ہیں۔ میاں صاحب بہت مہمان نواز ہیں۔ خوش اخلاق ہیں۔ وعدہ وفا کرتے ہیں۔ دوسروں کو اہمیت دیتے ہیں۔ بچوں پر انتہا کی شفقت کرتے ہیں۔ یوں کہہ لیجیے کہ ہر لحاظ سے وہ ایک مکمل شخصیت ہیں۔ جب ان کی ساری خوبیوں کے بارے میں پتا لگایا گیا کہ شاید ان خوبیوں میں کسی ٹرینر کا کمال ہو تو پتا چلا کہ ان کی کمال شخصیت میں کسی ٹرینر کا کوئی کمال نہیں۔ پھر پتا لگایا گیا کہ شاید انھوں نے کوئی کورس کیا ہو، لیکن انھوں نے وہ بھی نہیں کیا۔ بلکہ خاص کتابیں بھی نہیں پڑھیں۔ پھر پتا لگایا گیا کہ شاید ان کی زندگی میں کسی مرشد یا پیر صاحب کا کمال ہو کہ جس مٹی کو بھی ہاتھ لگاتے ہیں وہ سونا بن جاتی ہے۔ لیکن ان کا کوئی مرشد

بھی نہیں ہے۔ پھر پتا کیا گیا کہ شاید کوئی چلہ کاٹا ہو۔ لیکن انھوں نے کوئی چلہ بھی نہیں کاٹا تھا۔ جب ان سے خوبیوں کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ سارا میرے والد صاحب (میاں فضل الرحمٰن) کا کمال ہے جنھوں نے میری شخصیت کی بنیاد بنائی۔

شخصیت کی بلند عمارت

یہ ممکن نہیں ہے کہ بغیر تربیت کے، بغیر گرومنگ کے، بغیر سکھائے ہوئے، بغیر سمجھائے ہوئے، بغیر اصلاح کے کسی شخصیت کی اتنی بلند عمارت بنائی جا سکے۔ لوگ سچے کھرے نہیں ہوتے، وہ نعرے تو لگاتے ہیں، لیکن اندر سے بزدل ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں تضاد ہوتا ہے۔ بعض اوقات جیسے قدرت بڑا سائنس داں پیدا کرتی ہے، ایسے ہی قدرت بڑا باپ پیدا کرتی ہے۔ کھمبی (مشروم) کسی بھی جگہ یا کھیت میں اچانک اگ جاتی ہے اور سارے کھیت میں الگ سے نظر آتی ہے۔ اسی طرح، دنیا میں کچھ لوگ کھمبی کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ وہ سب کی طرح نہیں ہوتے۔ وہ جاہل خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود عقل مند ہوتے ہیں۔ جیسے آئن سٹائن کے باپ کو اگر دیکھا جائے تو کبھی نہیں لگے گا کہ یہ اتنے بڑے سائنس داں کا بیٹا ہے۔ اسی طرح اسٹیو جوبز کو بنانے والا اس کا باپ نہیں ہے، اس کے الات ہو سکتے ہیں، دھکے ہو سکتے ہیں۔ اگر آدمی کے اندر واقعی کچھ ہو تو وہ منفرد ہوتا ہے۔ میاں فضل الرحمان بھی ایک کھمبی تھے۔

ہم سب کسی نہ کسی انجام پر کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ دراصل کسی آغاز کا انجام ہوتا ہے اور ہم کسی انجام کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔ اگر آج بنیاد نہیں ہے تو انجام نہیں ملے گا۔ بغیر بنیاد رکھے تعمیر نہیں ہو سکتی۔ ہم جو تعمیر چاہتے ہیں، چاہے وہ کامیابی کی صورت میں ہو، شناخت میں ہو، خدمت ہو، بڑا مقام ہو، کتابیں لکھنا ہو، اچھے والدین میں ہو لیکن اگر بنیاد ہی نہیں رکھی گئی تو کل تقاضا کیا جائے گا اور جواب نہیں ملے گا تو پھر حسد پیدا ہو گا۔

چھپانے والے کمزور ہوتے ہیں

میاں رضاء الرحمان کہتے ہیں کہ میں نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے والد کے کاروبار کی کامیابی کے راز دیکھے تو میں نے جانا کہ اگر کوئی بھی ان سے کاروبار سیکھنے آتا تو وہ انھیں الف سے ی تک سارا کاروبار بتاتے اور سمجھا دیتے۔ اگر پھر بھی سمجھ نہ آتا تو کہتے تھے کہ کوئی بات نہیں، کچھ دن میرے ساتھ کام کرلو، تم سمجھ جاؤ گے۔ یہ بات کہنا آسان ہے، لیکن کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کیلئے بڑا حوصلہ چاہیے، کیونکہ اپنے کاروباری راز بتانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

میاں صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے کہا کہ مجھے کاروبار کرنا ہے تو انھوں نے کہا، نہیں پہلے چھ ماہ نوکری کرو۔ میں نے دو ہزار ماہوار پر نوکری شروع کر دی۔ جب پہلی تنخواہ لے کر گھر آیا تو والد صاحب نے کہا کہ چھ ماہ بعد فیصلہ کرنا کہ نوکری کرنی ہے یا کاروبار۔ جب چھ ماہ گزر گئے تو مجھے سمجھ آیا کہ میں نے چھ ماہ جو تکلیف اٹھائی ہے، اس کے پیچھے کوئی مقصد تھا۔

چار ماہ کا کرایہ

ایک دفعہ یہ ہوا کہ میرے بھائی نے والد سے کہا کہ میں آپ کی ایک دکان رکھنا چاہتا ہوں۔ والد صاحب نے جواب دیا، کوئی مشکل نہیں ہے، تم دکان رکھ لو لیکن تمہیں اس کا کرایہ ادا کرنا پڑے گا۔ بھائی نے سوچا، یہ عجیب بات ہے کہ والد صاحب کرایہ مانگ رہے ہیں۔ خیر بھائی نے دکان رکھ لی اور کرایہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ گزرا تو کاروبار نقصان میں جانا شروع ہو گیا اور کرایہ بھی ادا نہ ہو سکا۔ ایک دن والد صاحب دکان پر آ کر بیٹھ گئے اور ساتھ پرچی تھمائی اور کہا کہ تم نے چار ماہ کا کرایہ نہیں ادا کیا۔ اب تم یا تو چار ماہ کا کرایہ ادا کرد

یا دکان چھوڑ دو۔ بھائی نے فوراً اپنی مہنگی موٹر سائیکل سستے داموں بیچی اور کرایہ ادا کر دیا۔

ہمارے بچوں کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں پر بوجھ نہیں ڈالتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کو دھوپ نہ لگے۔ اگر دھوپ نہیں لگے گی تو پھل کیسے تیار ہوگا۔ بنیاد تبھی بنے گی کہ جب گرومنگ کے عمل سے گزارا جائے گا۔

پھل کیلئے بیج بونا ضروری ہے

اگر والدین اپنے بچوں پر چھوٹی چھوٹی ذمے داریاں نہیں ڈالیں گے تو بنیاد نہیں بنے گی۔ اچانک کسی چیز کی تعمیر نہیں ہوسکتی۔ بیج لگائے بغیر پھل کھانا ممکن نہیں ہے۔ میاں صاحب کہتے ہیں، میرے والد صاحب اپنے اسکول کے بچوں سے بہت پیار کیا کرتے تھے اور انھیں کھلونے لا لا کر دیا کرتے تھے۔ آج اگر ہم اپنے بچوں کے ہمدرد نہیں ہیں تو کسی کے بچوں کے ہمدرد کہاں ہوں گے۔ آپ کو بہت سے لوگ ملیں گے جو این جی اوز بنانا چاہتے ہیں تاکہ لوگوں کی مدد کریں۔ جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا انھوں نے اپنوں کی کبھی مدد کی تو جواب نفی میں ملتا ہے۔

تنقید کرنا بہت آسان ہے، جب کہ کام کرنا بہت مشکل ہے۔ ہم اتنی ناشکری قوم ہیں کہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہر اچھا آدمی بھاگ جائے۔ ہمارا جی چاہتا ہے جو فرد جس فیلڈ میں اچھا ہے، اس پر اتنی تنقید کی جائے کہ اس کا یہاں رہنا مشکل ہو جائے۔ جب سارے بھاگ جائیں گے تو یہاں کام کون کرے گا۔ ہمارے اندر کچھ تو برداشت ضرور ہونی چاہیے۔ کسی کے کام کو قبول کرنے کا حوصلہ ضرور ہونا چاہیے۔

امیر تیمور دنیا کے سفاک انسانوں میں سے ایک تھا۔ وہ اتنا سفاک تھا کہ جس علاقے میں جاتا تھا، وہاں کھوپڑیوں کے مینار بنواتا تھا۔ وہ جسموں کی چربی نکلواتا تھا اور کھوپڑیوں کے اوپر ڈال کر آگ لگوا دیتا تھا۔ پھر کھوپڑیوں کے وہ مینار کئی دن تک روشن رہتے تھے۔ وہ

الاؤ پاس سے گزرنے والوں کو بتاتا تھا کہ اس جگہ سے امیر تیمور گزرا ہے، لیکن اتنی سفاکی کے باوجود وہ اتنا رحم دل ضرور تھا کہ اگر اس کا واسطہ کسی عالم سے پڑ جاتا تھا تو وہ اس کی گردن نہیں کاٹتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ معاشرے کی آکسیجن ہے۔ اگر یہ مٹ گیا تو معاشرہ آگے نہیں چل سکے گا۔

جو تنقید کرتا ہے، اس کا ماضی تنقیدوں سے پُر ہے

ہمارے معاشرے میں ایک مزاج ہے کہ ہم ہر ایک کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ہمیں اس کو چھوڑ کر کام کر کے دکھانا چاہیے۔ کام کیے بغیر تنقید کرنے والا بغیر بنیاد والا شخص ہوتا ہے۔ اس کی کہیں نہ کہیں منفی بنیاد بنی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے تنقید و تنقیص اس کی عادت بن چکی ہوتی ہے۔

اگر بچے کو کاروبار کرانا ہے تو اس پر ذمے داری ڈال کر کاروبار کرنا سکھائیے۔ دیانت داری کر کے دکھائیے، کیونکہ جب بھی کام پر پورا یقین ہوتا ہے تو پھر شخصیت میں سچ آجاتا ہے اور سچے انسان میں ڈر اور خوف نہیں ہوتا۔ بنیاد اچھی ہو تو جیسی مٹی بھی ہاتھ میں آئے، وہ سونا بن جاتی ہے۔ آنے والا وقت اگلی نسلوں کا وقت ہے۔ اس کی بنیاد ہم ہیں۔ جاوید چوہدری کہتے ہیں، ''ہم اپنے بچوں کے ماضی ہیں۔ ہمیں ان کا ماضی خراب نہیں کرنا چاہیے۔'' آج سے بیس سال بعد بچے جب مڑ کر دیکھیں گے تو انھیں پتا چلے گا کہ ہمارا ماضی کتنا شان دار تھا۔

والدین کے لڑائی جھگڑے اور بچوں کی تربیت

جو والدین آپس میں لڑائی جھگڑا کر کے اپنے بچوں کا ماضی خراب کر رہے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کی بنیاد خراب نہ کریں۔ اگر کوئی بچہ ڈاکو یا منافق بنانا ہے یا بچے کی

شخصیت میں تضاد پیدا کرنا ہے تو اس کا فارمولا بہت آسان ہے کہ گھر میں لڑائی شروع کردی جائے۔ یہ لڑائی آنے والے زمانے میں ایک بمبار تیار کردے گی۔

آج اگر بچوں کو امن شفقت دینا ہے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کی بنیاد محبت کی آگ سے رکھی جائے۔ اگر ایک ٹوکری میں محبت ڈالی ہی نہیں گئی تو پھر بیس سال بعد محبت نہیں نکلے گی۔ وہ تمام چیزیں جو بچوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس کی بنیاد پہلے اپنے اندر رکھی جائے۔ پھر ان کی شخصیت میں رکھی جائے۔ یہ بنیاد عملی ہونی چاہیے، کیونکہ نصیحتوں سے بنیاد نہیں بنتی، عمل سے بنیادیں بنتی ہیں۔ بچہ جتنا دیکھ کر سیکھتا ہے، اتنا نصیحتوں سے نہیں سیکھتا۔ بنیاد کے پتھر بظاہر چھپ جاتے ہیں، لیکن عمارتوں کی بلندی انھی کے سر پر ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے، ہم بنیاد کے پتھر ہوں اور آنے والا زمانہ ہمیں نہ جانتا ہو، لیکن ہماری بنیاد کی باتیں ضرور ہوں گی۔

کمزوریوں کو قوت میں تبدیل کیجیے

''جس دن مجھے شکست ہوئی، مجھے اپنی کمزوریوں کا پتا چلا
اور اگلے دن میں نے انھیں قوت میں تبدیل کر لیا!''

لیری برڈ

جہاں انسان کا دانہ پانی ہوتا ہے، وہاں انسان پہنچ جاتا ہے۔ انسان بسا اوقات حیران ہوتا ہے کہ فلاں جگہ سے مجھے چائے کیوں مل گئی، کھانا کیوں کھلا دیا گیا، فلاں جگہ سے میں کیوں نہ کھا سکا، فلاں جگہ پر کیوں پہنچا۔ جب غور کیا جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ دانہ پانی لکھا ہوا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کسی جگہ اپنا کام کر رہا ہوتا ہے اور پھر ایسی جگہ پر پہنچ جاتا ہے جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ صرف اس لیے وہاں پہنچا کہ اس کا دانہ پانی وہاں ہے۔ جس طرح رزق کا دانہ پانی ہوتا ہے، وہ اسے مل جاتا ہے، اسی طرح بات چیت کا بھی دانہ پانی ہوتا ہے۔ ہمیں ایک بات سیکھنی ہے اور وہ بات خاص وقت اور خاص شخص کے ساتھ جڑی ہوئی ہے تو ہم کہیں موجود ہوتے ہیں اور قدرت ہمیں لا کر اس کے سامنے کھڑا کر دیتی ہے اور ہم وہ بات سیکھ لیتے ہیں۔

درست تصور

ہم بچپن سے یہ تصور قائم کر لیتے ہیں کہ کسی کی آنکھیں، کان، بازو، ٹانگیں، منہ اور جسم ٹھیک ہیں تو وہ سو فیصد ٹھیک ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ

ایسے ہیں جن کی دو ٹانگیں ہیں، دو بازو ہیں، دو آنکھیں ہیں، دو کان ہیں اور ان کا ذہن بھی ٹھیک ہے، مگر وہ ٹھیک نہیں۔ ایسے لوگ بہ ظاہر اپاہج نہیں ہوتے، لیکن حقیقت میں اپاہج ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ٹانگوں سے، آنکھوں سے اور بازوؤں سے محروم ہوتے ہیں، لیکن وہ مکمل ہیں کیونکہ اصل میں اپاہج وہ ہے جس کے پاس سب کچھ ہے، لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود ان کا استعمال ٹھیک نہیں ہے۔

ایک اسی سالہ اندھا بھکاری حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ''کاش مجھے اتنی تکلیف والی زندگی نہ ملتی۔'' آپؒ دستک سن کر دروازے پر آئے اور اس سے کہا، ''آئے تو تم بھیک مانگنے ہو لیکن یہ کیا بات کر رہے ہو؟'' بھکاری نے جواب دیا، ''میں مانگنے نہیں آیا۔ میرا ایک سوال ہے۔ مجھے اس کا جواب چاہیے۔'' آپؒ نے پوچھا، ''کیا سوال ہے؟'' اس نے کہا، ''میری عمر اَسی سال ہوگئی ہے، لیکن مجھ سے زیادہ بھی بدقسمت کوئی ہوسکتا ہے؟ کیوں کہ میں اسی سال کا ہوگیا ہوں، مگر اتنی عمر گزر جانے کے باوجود دنیا کو دیکھنے سے محروم ہوں۔ اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے؟'' آپؒ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا، ''تم سے بڑا بدقسمت وہ ہے جس کے پاس آنکھوں کی بصارت تو ہے، لیکن زندگی میں بصیرت نہیں ہے۔''

سیلف میڈ لوگوں کو نمایاں کرنے کی ضرورت

جو لوگ محرومیوں کے باوجود کچھ کر کے دکھاتے ہیں، مغربی معاشرے میں ایسے لوگوں کو بہت نمایاں کیا جاتا ہے۔ انھیں بے شمار سہولیات دی جاتی ہیں۔ وہ سہولیات اچھے روزگار کی صورت میں بھی ہوتی ہیں اور عزت کی صورت میں بھی ہوتی ہیں۔ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ جو لوگ محرومیوں کے باوجود کچھ کر کے دکھاتے ہیں، انھیں دبا دیا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہی نہیں کہ ہمیں جو رزق مل رہا ہے، وہ شاید انھی لوگوں کی وجہ سے مل رہا

ہو۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''ایسا ممکن ہے کہ گھر کا ایک ایسا شخص جو کچھ بھی نہ کرتا ہو لیکن ہو سکتا ہے، گھر کے سارے افراد اس کا نصیب کھا رہے ہوں۔'' کسی نے پوچھا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا، ''بسا اوقات کوئی برکت والا ہوتا ہے۔''

غلط معیارات

ہمارا معاشرہ ایک بیمار معاشرہ ہے۔ یہ طویل عرصہ جن مراحل میں رہا ہے ان کی وجہ سے یہ آج تک طے ہی نہیں کیا جا سکا کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے، حق دار کون ہے اور کون نہیں ہے؟ ہمیں یہ ادراک ہی نہیں کہ محرومیوں اور کمزوریوں کے باوجود آگے بڑھنے والے لوگ کتنے قیمتی ہیں۔ یہ ملک وملت کیلئے کتنا بڑا سرمایہ ہیں اور ان کی وجہ سے کتنی برکت ہیں۔

ایک ٹریننگ میں شرکا کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر کھانے کو کہا گیا۔ جب ان لوگوں نے کھانا کھایا تو سب رونے لگے۔ کوچ نے کہا کہ دوستو، دیکھو ابھی آپ نے پوری زندگی میں ایک وقت کا ایک کھانا آنکھوں پر پٹی باندھ کر کھایا ہے۔ ذرا سوچیے کہ جس کی آنکھیں نہیں ہیں، اس نے پوری زندگی میں کیسے کھانا کھایا ہوگا۔ پھر انھیں کہا گیا کہ اپنی ٹانگیں باندھیں اور کام کریں۔ انھیں اس انداز سے آدھا گھنٹہ گزارنا مشکل ہو گیا۔ جب رسی کھولی گئی تو کوچ نے کہا کہ اندازہ لگائیے کہ جو لوگ ٹانگوں سے محروم ہیں وہ کس تکلیف اور اذیت میں مبتلا ہیں۔ تم ان ٹانگوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کی قدر نہیں کرتے۔ پھر شرکا سے کہا گیا کہ تھوڑی دیر کیلئے اپنی سانس بند کر لیں اور اس وقت تک بند رکھیں جب تک تکلیف نہ ہونا شروع ہو جائے۔ (جب آکسیجن کم ہوتا ہے تو فیصلہ سازی کی قوت پر اثر پڑتا ہے اور دماغ کا توازن خراب ہو جاتا ہے۔) جب پانچ سات بار اس طرح کرایا گیا تو کہا گیا کہ ذرا دیکھیں، دنیا کیسی نظر آ رہی ہے۔ انھیں لگ رہا تھا کہ جیسے ساری دنیا گھوم رہی ہے۔ کوچ نے کہا، مجھے بتائیں کہ جو آدمی ذہنی طور پر تھوڑا سا معذور ہے، ذرا اس کی تکلیف کا اندازہ

لگائیے کہ وہ ایک لمحے میں کتنی تکلیف سے گزر رہا ہوتا ہے۔

خاص سلوک

ایک دن لیلیٰ لنگر بانٹ رہی تھی۔ لنگر لینے والوں کی لائن میں مجنوں بھی کاسہ لیے کھڑا تھا۔ جب مجنوں کی باری آئی تو لیلیٰ نے اسے لنگر دینے کی بجائے اس کا کاسہ توڑ دیا۔ مجنوں بہت خوش ہوا۔ دوسروں نے پوچھا، تم کیوں خوش ہوئے ہو؟ اس نے جواب دیا، لیلیٰ نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے، تمہارے ساتھ نہیں کیا۔ اگر کوئی شخص تھوڑا معذور ہے تو اسے یہ بات ذہن میں نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہے؟ اسے سوچنا چاہیے کہ اتنی مخلوق میں اللہ تعالیٰ نے صرف مجھے چنا اور اسی سلوک کی وجہ سے میرا اللہ تعالیٰ سے تعلق بن گیا اور یہ معذوری مجھے اللہ کی زیادہ یاد دلاتی ہے۔ یہ کتنی بڑی سعادت کی بات ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی کاسہ توڑ کر اپنا تعلق دیا ہے تو یہ برا سودا نہیں ہے۔

بہت ساری دعائیں ایسی ہیں جو ''ربی'' سے شروع ہوتی ہیں۔ اگر اس کا ترجمہ کیا جائے تو اس کا مطلب ہے، ''میرا رب''۔ اگر زندگی میں ہم کہیں ''میری ماں'' تو احساس محسوس ہوتا ہے یا کہیں ''میرا بیٹا'' تو الگ ہی احساس ہوتا ہے یا کہیں ''میرا بھائی'' تو الگ احساس ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ کہا جائے کہ ''میرا رب'' اور احساس نہ جاگے تو پھر یہ سوالیہ نشان ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس سے تعلق قائم نہیں۔ جب تعلق قائم نہیں کیا تو پھر گلہ کرنا نہیں بنتا، کیونکہ اس نے تھوڑی سی محرومی دے کر اپنا خاص قرب دیا ہے۔ اگر کوئی دوری ہے تو صرف ہماری طرف سے ہے۔ اُس کی طرف سے نہیں ہے۔ حضرت شیخ سعدیؒ کہیں جا رہے تھے۔ پاؤں میں جوتی نہیں تھی۔ انھوں نے گلہ کیا کہ اے میرے مالک، میرے پاؤں میں جوتی نہیں ہے۔ ابھی ذرا کچھ آگے ہی گئے تھے کہ ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ہی نہیں تھے۔ آپؒ فوراً سجدے میں گر گئے اور دعا کی کہ میرے مالک تیرا شکر ہے، اگر

جوتی نہیں ہے تو کوئی بات نہیں، پاؤں تو ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں، ''جو مقام گلہ کا ہوتا ہے، اصل میں وہی مقامِ شکر ہوتا ہے۔'' جو شخص اپنی زندگی سے گلہ ختم کرلیتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے مالک، اگر میں تیری نگاہِ خاص میں ہوں تو میرے لیے یہی کافی ہے۔ ایسے شخص کیلئے راستے آسان ہو جاتے ہیں۔

محسن نواز کی کہانی

محسن نواز صاحب تین سال کی عمر میں پولیو کا شکار ہو گئے۔ پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا، اس لیے بچوں کی کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ جب ان کی پہلی کہانی ''ماہنامہ پھول'' میں شائع ہوئی تو وہ آنکھوں سے بھی محروم ہو گئے۔ ایک لمحے کیلئے سوچیے کہ کسی کی کہانی چھپ کر آئے اور وہ پڑھ ہی نہ سکے تو اس کیلئے اس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ ایک دن محلے کی ایک عورت ان کے گھر آئی اور ان کی والدہ سے کہنے لگی، ''آپ محسن کیلئے دعا کیوں نہیں کرتیں۔'' محسن صاحب کی والدہ نے کہا، ''کون سی دعا؟'' اس نے کہا، ''یہی کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس بلا لے، کیوں کہ یہ تو کچھ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کی نہ ٹانگیں اور نہ آنکھیں ہیں۔ تم کب تک اس کا بوجھ اٹھاتی رہو گی۔'' محسن کی والدہ نے کہا، ''تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔'' محسن صاحب کہتے ہیں کہ اس وقت میں اس عورت کی باتیں سن رہا تھا۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کیا کہ اگر ٹانگیں نہیں ہیں اور آنکھیں نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ جو باقی ہے، میں اس سے بہترین کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرے لیے یہ کافی ہے۔ اس کے بعد محسن نواز صاحب نے دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ علم کی طلب اتنی سچی تھی کہ وہ خالی کیسٹیں خریدتے اور دوستوں کو کہتے کہ کتاب اپنی آواز میں اس کیسٹ میں ریکارڈ کر دو، میں یاد کر لوں گا۔ اس طرح کیسٹوں کے ذریعے محسن نواز کتابیں یاد کرنے لگے، یہاں تک کہ انھیں پندرہ سو کتابیں زبانی یاد ہو گئیں۔ آج وہی

محسن نواز صاحب جن کی ٹانگیں اور آنکھیں نہیں ہیں، وہ ریڈیو پر پروگرام کرتے ہیں اور ایک کمپنی میں پی آر مینیجر ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ناامید ہے تو صرف دس منٹ ان کے پاس بیٹھ جائے، اس کی ناامیدی ختم ہو جائے گی۔ کیا ہوا، اگر آپ محروم ہیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آج فیصلہ کیجیے کہ جو نہیں بدلا جا سکتا، اسے قبول کر لیں کہ وہ مالک کی رضا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے جلد راضی ہوتا ہے۔

معذور کون

معذور وہ ہے جو سوچ کا معذور ہے۔ اپاہج وہ ہے جس کی فکر اپاہج ہے۔ اپاہج وہ ہے جو نااُمید ہے۔ معذور وہ ہے جس کے پاس امنگ نہیں ہے۔ معذور وہ ہے جس کے پاس موٹیویشن نہیں ہے۔ معذور وہ ہے جس کے پاس زندگی میں کچھ کرنے کا جذبہ نہیں ہے۔

منزلیں دور نہیں ہوتیں، صرف ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دو ہی مقام ہوتے ہیں۔ روزگار لینا یا روزگار دینا۔ ارادہ کیجیے کہ مجھے روزگار دینے والا بننا ہے۔ زندگی میں چھوٹی ڈیل نہ کیجیے۔ مالک بننے کا سوچیے۔

ایک شخص کی بیوی کو آرٹ کا کام سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم کیا اِدھر اُدھر جا کر سیکھتی رہتی ہو، چھوڑو، گھر میں رہا کرو۔ بیوی نے کہا، مجھے اس کا شوق ہے۔ شوہر نے کہا، میری اچھی جاب ہے، تمہیں اس جاب کے ہوتے ہوئے کیا ضرورت ہے؟ اس نے جواب دیا، بس مجھے شوق ہے۔ شادی کے آٹھ سال بعد اس شخص کی نوکری اچانک ختم ہو گئی جس کی وجہ سے ان کے مالی حالات خراب ہونے لگے۔ بیوی نے جو کچھ سیکھا ہوا تھا، اسی سے اپنا کام شروع کیا۔ وہ کام چل پڑا۔ جلد ہی اس نے اپنے پاس کام کرنے والی عورتیں رکھ لیں۔ اس کا کام اتنا معیاری تھا کہ اس نے ایک چھوٹی سی فیکٹری

قائم کرلی۔ ایک وقت آیا کہ اُن کا سارا مال باہر جانا شروع ہوگیا۔ شوہر نے شکر ادا کیا کہ اُدھر میری نوکری چھوٹی اور اِدھر میں نے نوکریاں دینی شروع کر دیں۔

آج سے عہد کیجیے کہ ہمیں اپنی کمزوریوں کو طاقت میں بدلنا ہے اور باقی زندگی کو شکر والی زندگی بنانا ہے، بامقصد بنانا ہے۔ خیر والی زندگی بنانا ہے، برکت والی زندگی بنانا ہے۔ اللھم لک الحمد ولک الشکر!

ممتاز بننے کا جذبہ

''جب بھی آپ خود کو اکثریت کے ساتھ کھڑا ہوا پائیں تو اس وقت ٹھہر جائیے
اور اپنے اندر جھانکئے!''

مارک ٹوائن

انسان تین چیزوں سے منفرد ہوتا ہے۔ ایک پیشہ، دوسرا جذبہ اور تیسرا کام۔ دنیا کی تاریخ میں آج تک جتنے بھی لوگ ممتاز ہوئے ہیں، ان کا تعلق خواہ کسی بھی شعبے سے ہو، ان کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کے کام نے انھیں ممتاز کیا۔ بہترین پیشہ ہو، بہترین جذبہ ہو لیکن اگر کچھ کر کے نہیں دکھایا تو پھر ممتاز نہیں ہوا جا سکتا۔ وہ تمام کے تمام لوگ جو کچھ کر کے چلے گئے، دراصل ان کا جذبہ ان کے کام کے ذریعے نظر آتا ہے۔

یاد رکھیے، آدمی کو اس کا کام زندہ رکھتا ہے۔ کاؤنسلنگ اور کوچنگ میں جب کسی شخص کو پرکھا جاتا ہے تو اس کی قوتِ ارادی کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ ایک سے دس تک کون سے نمبر پر ہے۔ اگر وہ پانچ سے کم ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شخص کے اندر وہ جنون نہیں ہے جو اسے مستقبل بنانے پر مجبور کرے، لیکن اگر نمبر پانچ سے اوپر ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ اس کے اندر اتنا جنون موجود ہے کہ جو اس کے مستقبل پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

غلط موازنہ

ایک عام شخص کا دوسرے عام شخص سے موازنہ ہو سکتا ہے، لیکن پہاڑ ے اور ذرے کا

موزانہ نہیں ہوسکتا۔ دنیا کے تمام ولی، پیغمبر، رسول ہم ان کے قدموں کی خاک بھی نہیں بن سکتے۔ وہ بہت بڑی ہستیاں ہیں۔ ہمیں دنیا گزارنے کیلئے روٹی بھی کمانی پڑتی ہے، نوکری بھی کرنی پڑتی ہے، ہمیں شاباشی کی بھی ضرورت ہے، ہمیں گاڑی کی بھی ضرورت ہے، ہمیں اچھے کپڑوں کی بھی ضرورت ہے۔ ان تمام چیزوں کے علاوہ ہمیں تھوڑا سا ممتاز ہونے کی تمنا بھی ہوتی ہے۔ اگر یہ تمنا غیر انسانی ہے تو پھر انسان کے درمیان مقابلہ بازی نہ رہے۔ انسان مقابلہ بازی کی حس کو خون سے نہیں نکال سکتا، کیونکہ یہ صلاحیت انسان کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔

اگر آپ دنیا میں ممتاز ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو پیشے، جذبے اور عمل پر کام کرنا پڑے گا۔ اگر آپ یہ تین قدم اٹھا لیتے ہیں تو نتیجہ آنے لگے گا۔ سات آٹھ سو سال پہلے لکھی گئی کتاب ''کیمیائے سعادت'' جو انسانی نفسیات اور فلسفے پر سند کی حیثیت رکھتی ہے، حضرت امام غزالیؒ کو زندہ رکھنے کیلئے کافی ہے۔ آزادی کی تحریک میں مسلمانوں کے قائدین میں سب سے نمایاں نام حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کا ہے، کیونکہ ان کے جذبہ اور کام نے کر کے دکھایا۔ اس کے علاوہ انسانی تاریخ میں جتنے بھی ممتاز اور نمایاں نام ہیں، وہ سب اسی فارمولے پر ممتاز ہوئے۔

پیشے کے حوالے سے دنیا کی رائے مختلف ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پیشے کے انتخاب کی بنیاد زمانے کے ٹرینڈ پر ہوتی ہے جیسے پرانے زمانے جو قالین بنتے تھے، آج ان کا کاروبار کیا جائے تو وہ نہیں چلے گا۔ وہ قالین سجانے کیلئے تو چل جائیں گے، لیکن استعمال کیلئے نہیں چلیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کے زمانے کے قالین کا معیار بدل چکا ہے۔ اسی طرح آج اگر کسی چیز کی تشہیر ڈھول سے کی جائے تو وہ بہت سست ہوگی۔ تیز تر تشہیر کیلئے جدید طریقہ کار سوشل میڈیا کو اپنایا جائے گا۔ ٹیکنالوجی میں ترقی کے باعث دنیا میں جتنی چیزوں کا معیار بہتر ہوئے، ان میں نئے پروفیشن بھی آئے اور ان کی شکلیں بھی بدلیں۔ آج ہمیں دیکھنا ہے کہ آج کے زمانے کے مطابق ہمارے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند اور اچھا کیا ہے۔

ہر خواہش پوری نہیں ہوتی

دنیا میں کوئی خواہش سو فیصد پوری بھی ہو جائے، تب بھی انسان مطمئن نہیں ہوتا۔ جو لوگ گاڑی لینا چاہتے ہیں، وہ گاڑی لے کر بھی خوش نہیں ہوتے۔ لوگ جس نوکری کیلئے بے تاب ہوتے ہیں، وہ انھیں مل جائے، تب بھی خوش نہیں ہوتے۔ انسان سو فیصد مطمئن نہیں ہوسکتا۔ اسے اطمینان کسی کل نہیں ہوتا۔

ہم موٹیویشن بڑے ناموں سے لیتے ہیں۔ کبھی کسی عام آدمی سے موٹیویشن نہیں مل سکتی۔ ہم میں تھوڑی سی یہ گنجائش ضرور ہونی چاہیے کہ ہم جس پیشے میں ہیں، ممکن ہے وہ پیشہ ٹھیک نہ ہو۔ انسان کے ساتھ سب سے بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ اگر انسان کا گزارا ہو رہا ہو تو وہ نیا نہیں سوچتا۔ جب تک اندر چبھن نہ ہو، آدمی اپنی سیٹ نہیں چھوڑتا۔ جب تک تکلیف نہ ہو، کچھ نیا نہیں کرتا۔ ہمیں کبھی تو رک کر سوچنا چاہیے کہ اگر ہمیں ممتاز بننا ہے تو پھر کلرکوں کی فوج سے تو ممتاز نہیں بنا جا سکتا، چھوٹے موٹے کام سے ممتاز نہیں ہوا جا سکتا۔ کوئی تو کام ایسا ہونا چاہیے جس سے ممتاز بنا جائے۔

اس حوالے سے تھوڑا غور و خوض ضرور کیا جائے کہ ہم کون سے کام کر سکتے ہیں۔ وہ ایک یا دو یا تین کام ہو سکتے ہیں۔ ان کاموں کیلئے عمر اور وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔ زندگی میں کسی بھی وقت فیصلہ ہو سکتا ہے کہ مجھے ممتاز بننا ہے۔ لیکن اگر کچھ نیا کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہو تو پھر جو پیشہ اختیار کیا ہوتا ہے، آدمی اسی پر تکیہ کیے رہتا ہے۔ اس لیے جو نئی کوشش نہیں کر سکتا وہ ممتاز نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ بذاتِ خود بہت بڑی قیمت ہے۔ زندگی کو کبھی کبھی بہت سنجیدگی کے ساتھ لینا چاہیے، لیکن زندگی میں کبھی کبھی کچھ نیا بھی کرنا چاہیے۔ اگر زندگی کو تھوڑا سا ڈرامائی بنا دیا جائے تو کیا حرج ہے؟ اگر ہماری دو سال کی کوشش کی قیمت سے باقی پچیس تیس سال کی زندگی بہتر ہو جائے تو برا سودا نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم اسی ڈگر پر چلتے رہیں تو

زندگی تو مکمل ہو جائے گی ، لیکن وہ ممتاز نہیں بن سکے گی ۔

انسان کا امتیاز

دنیا کی کوئی دوسری مخلوق آج تک نامور نہیں ہو سکی۔ اگر کوئی ہوگا بھی تو وہ کسی انسانی واقعے سے منسلک ہوگا، جیسے اصحاب کہف کا کتا۔ ناموری فقط اگر ملی ہے تو انسان کو ملی ہے۔ انسان مرنا نہیں چاہتا۔ وہ فہم کے اس درجے پر چلا جاتا ہے کہ اسے سمجھ آجاتا ہے کہ مجھے مرنا تو ہے، اس دنیا سے جانا تو ہے۔ لیکن اگر کوئی کام ایسا کر جاؤں تو پھر امر ہو جاؤں گا۔ یہ سمجھ کہ میں کچھ کر جاؤں گا تو زندۂ جاوید ہو جاؤں گا، صرف اور صرف انسان کو ملی ہے۔ ''بلھے شاہ، اسی مرنا ناہی گور پیا کوئی ہور'' یہ انسانی جملہ ہے۔ یہ کسی اور مخلوق نے نہیں کہا، یہ فقط انسان نے کہا ہے۔ اس لیے ہمیں سوچنا چاہیے کہ آخر ایسا کون سا کام ہے جو ہمیں معتبر کر سکتا ہے۔ پھر آج سے کوئی کام ایسا نہیں کرنا جس کا نتیجہ معتبر ہونے کے سوا ہو۔ کوئی سوچ ایسی نہیں سوچنی جس کا ہدف معتبر ہونے کے سوا ہو۔ جب مرنا ہی ہے تو پھر کچھ کر کے کیوں نہ مرا جائے۔ جب کچھ کر کے مرنا ہے تو پھر وہ کام کیا جائے جو نمایاں کرے۔

بغیر کام کے نام بنانا زیادتی ہے، بلکہ نام بنتا ہی نہیں ہے۔ قدرت کا قانون یہ ہے کہ قدرت کبھی بھی بغیر کام والے کا نام نہیں بناتی۔ وہ کہتی ہے کہ جس نے بھی کچھ کیا ہے، خواہ اس کا تعلق دنیا کے کسی بھی قوم، خطے یا مذہب سے ہو، اسے شناخت ملے گی۔ انسان خوف کی وجہ سے کچھ نیا نہیں کرتا، لیکن یہ بھی یاد رہے کہ خوف سے نجات میں ہی کامیابی ہے۔ یہ وہ پہلا تالہ ہے جسے کھولنا ضروری ہے۔ ایک لاکھ روٹیاں پڑی ہوں، لیکن ایک وقت دو ہی کھائی جا سکتی ہیں، ستر سوٹ ہوں، ایک وقت میں ایک ہی پہنا جائے گا۔ پچاس گاڑیاں ہوں، سواری ایک میں ہو سکتی ہے۔ زندگی محدود ہے۔ اس محدود زندگی میں ہمیں بہت سی چیزیں نہیں چاہئیں۔ صرف کچھ محدود اچھی کوالٹی کی چیزیں چاہئیں جس سے زندگی اچھی گزر

جائے۔ لیکن جو بھی کیا جائے، اس معیار اور انداز سے کہ وہ ممتاز کر دے۔ اگر چیزوں سے نام بننا ہوتا تو حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ جاتے ہوئے اپنا سب کچھ پاکستان کے نام پر کر کے نہ جاتے۔ سب سے بڑا ذہین وہ ہے جسے یہ سمجھ آ گیا ہو۔ لالچ بہت بڑا دشمن ہے، اس لیے امتیاز کا پہلا ٹیسٹ لالچ سے شروع ہوتا ہے۔

پیسہ خوشی نہیں دیتا

ایک حد کے بعد پیسہ صرف ہندسوں میں نظر آتا ہے، جیب میں نظر نہیں آ سکتا۔ ایسے لوگ جن کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ وہ ہندسوں میں چلا گیا ہے، اگر ان کا انٹرویو لیا جائے اور ان سے پوچھا جائے کہ انھیں خوش کرنے والی چیز کیا ہے تو جواب ملے گا، بینک اسٹیٹمنٹ۔ پھر پوچھا جائے کہ اس کے بعد کوئی چیز جس سے آپ کو خوشی ملتی ہو تو جواب ملتا ہے کہ کوئی ایسا کام جو خوشی کا باعث بن سکے۔ گویا، کام خوشی دیتا ہے اور وہی کامیاب کرتا ہے۔

قدرت نے اتنا بڑا کارخانہ چلانا ہے، اس لیے اسے سارے لوگ ڈاکٹرز نہیں چاہئیں، سارے انجینئرز نہیں چاہئیں، سارے ٹریڈرز نہیں چاہئیں، سارے لیڈرز نہیں چاہئیں، سارے سیاستداں نہیں چاہئیں۔ اس لیے کائنات میں ورائٹی ہے۔ قدرت کے پاس ایک ڈائی نہیں ہے کہ جس سے ایک جیسے ہی انسان بنتے جائیں۔ انسان درج ذیل چیزوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں:

1. فطرت: انسان کی فطرت نہیں بدلی جا سکتی۔ یہ ہر ایک کی مختلف ہوتی ہے
2. طبیعت: ہر انسان کی طبیعت مختلف ہوتی ہے
3. مزاج: انسان کے مختلف مزاج ہیں جن میں سے کچھ کو بدلا جا سکتا ہے، کچھ کو نہیں۔
4. سوچ: انسان اپنی سوچ کے اعتبار سے مختلف ہے

5 عادت: انسان اپنی عادتوں کے اعتبار سے مختلف ہے

6 گرومنگ: انسان کی گرومنگ میں فرق ہے۔ گرومنگ بعض لوگوں کو ممتاز بناتی ہے بعض کو نہیں بناتی

7 اندازہ: انسان اپنے اندازوں کے اعتبار سے مختلف ہے۔ آج دنیا میں سب سے زیادہ بات اندازوں پر ہو رہی ہے

8 حالات: (قسمت) انسان اپنے حالات کے اعتبار سے مختلف ہے

یہ سب چیزیں انسان کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں، لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس فہرست میں کون سی ایسی چیز ہے جو ہمیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ پروفیشن چھوٹے سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس پروفیشن سے محبت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق جو بندہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بہترین کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے شناخت دے دیتا ہے۔ ہم شناخت والی مخلوق ہیں۔ ہم ایک جیسے شیر نہیں ہیں، ایک جیسے گیڈر نہیں ہیں، ایک جیسے شاہین نہیں ہیں۔ ہم ممتاز ہیں۔ ہم میں سے ہر کوئی ایک دوسرے سے جدا جدا ہے۔

پہلا اور آخری بچہ زیادہ خود اعتماد کیوں ہوتے ہیں

ماں اپنا پورا زور بھی لگا لے تو اس کے سارے بچے ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ باپ پورا زور لگا لے تو چھ بچے ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ ایک تحقیق کے مطابق، پہلے یا آخری بچے میں خود اعتمادی کا امکان زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ پہلے بچے کے ناز نخرے بہت زیادہ اٹھائے جاتے ہیں جس سے اس کی شخصیت میں اعتماد پیدا ہوتا ہے جبکہ آخری بچے کے وقت معاشی حالات اتنے اچھے ہو چکے ہوتے ہیں کہ جس کی وجہ سے خود اعتمادی آجاتی ہے۔

ہمیں وہ کام تلاش کرنا ہے جس سے ہمیں عشق ہے۔ دنیا میں کسی بھی شعبے کے جتنے بھی نام ہیں، انھوں نے ایک کام پکڑا، پھر اسے پالش کیا ہے۔ اس وجہ سے وہ کام ان کی شناخت

بنا۔ یونانیوں اور چینیوں کا پینٹنگ بنانے کا مقابلہ ہوا۔ دونوں کو ایک میدان میں لے جایا گیا۔ درمیان میں پردہ لگا دیا گیا تا کہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں۔ جب پینٹنگ بن گئی تو پردہ ہٹایا گیا۔ دیکھا کہ یونانیوں نے شاندار پینٹنگ بنا دی لیکن جب چینیوں کی طرف دیکھا گیا تو بالکل اسی طرح کی پینٹنگ ان کی طرف بھی بنی ہوئی تھی۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ ایسا کیسے ممکن ہے۔ پتا لگایا گیا کہ ایسا کیسے ممکن ہے تو معلوم ہوا چینیوں نے دیوار کو شیشہ بنا دیا تھا جس پر اس پینٹنگ کا عکس پڑ رہا تھا۔ چلو ہم پینٹر نہ بنیں، آئینہ ہی بن جائیں۔

فروخت کی صلاحیت

جو شخص کوئی شے بیچ سکتا ہے تو وہ بہت بڑا گرو ہے، کیونکہ اس کے پاس بیچنے کی صلاحیت ہے۔ جو آدمی اپنے آپ کو بیچ سکتا ہے، اپنے آپ کو برانڈ کر سکتا ہے، اپنے آپ کو پروڈکٹ بنا سکتا ہے، اپنی سروس پیش کر سکتا ہے، وہ بھوکا نہیں بیٹھ سکتا، کیونکہ دنیا میں کام زندہ کرتا ہے اور اگر آپ نے کام تلاش کر لیا ہے تو پھر وہ آپ کو شناخت ضرور دے گا۔

انسانوں کیلئے فائدہ رساں

کسی کی صحبت موڈ اچھا کر دیتی ہے۔ سوچ موڈ اچھا کر دیتی ہے، خیال موڈ اچھا کر دیتا ہے۔ اگر آپ کو دل سے عزت کرنا آتی ہے تو آپ اس سے بھی ممتاز بن سکتے ہیں۔ ہر کام کو خلوص کے ساتھ بہترین کرنے کی کوشش کیجیے، کیونکہ یہی خلوص آپ کو اس کام کی طرف لے جائے گا جس کام کیلئے آپ کو قدرت نے پیدا کیا ہے۔ قدرت اس شخص پر رحم کرتی ہے جو چھوٹے چھوٹے کام بھی بڑی نفاست کے ساتھ کرتا ہے۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ ''تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو انسانوں کیلئے فائدہ مند ہے۔'' انسانوں کی دوڑ میں کچھ بہترین ہیں اور جو بہترین ہے، وہ انسانوں کیلئے بہترین ہے۔

اس خیال کا آنا کہ میں کسی بھی عمر میں کچھ نئے کی کوشش کرسکتا ہوں، بذاتِ خود اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ کی کمائی کا جو ذریعہ ہے، وہی رہنے دیں لیکن شوق ضرور پالیں۔ شوق میں یہ شرط رکھیں کہ کرتے جانا ہے، کرتے جانا ہے۔ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اس سے عزت اور برکت ضرور دے گا، کیونکہ جس طرح خواہشیں بھی پل کر جوان ہوتی ہیں، اسی طرح شوق بھی جوان ہوتا ہے۔

اپنی توانائیاں سینت سینت کر نہ رکھیے

جو شخص اپنی انرجی بچا کر رکھتا ہے، وہ خوش نہیں ہوسکتا۔ وہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ اس کو میں کبھی اگلے وقت میں استعمال کروں گا، حالانکہ یہ سراسر دھوکا ہے، کیونکہ کل کا کسی کو نہیں پتا۔ یہی فکر مندی کہ میں اگلے وقت میں کروں گا، اسے خوش نہیں ہونے دیتی۔آج کا وقت پھر کبھی نہیں آنا۔آج کی جوانی کبھی واپس نہیں آنی۔ جو آج کے لمحات ہیں کبھی نہیں آنے، اس لیے اپنا سب سے بہترین آج کو دیجیے۔

اپنے شوق اور جذبے کو کبھی بچا کر نہ رکھیں اور کبھی انتظار نہ کیجیے کہ کوئی آئیڈیل وقت آئے گا تو پھر اس کا استعمال ہوگا۔آپ کا جو بھی شوق ہے اسے غذا ضرور فراہم کیجیے۔ یہ غذا دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک زندہ رہنے کیلئے اور ایک جنون کیلئے۔ اس لیے اپنے شوق اور جذبے کی غذا کا انتظام کیجیے۔اس کیلئے فہرست بنایئے کیا کیا کام ایسے ہیں جو آپ کے شوق کو بڑھاوا دے سکتے ہیں۔اپنے شوق کو موٹیویٹ رکھنے کیلئے ایسے دوست ضرور بنایئے جن سے موٹیویشن ملے اور جو شوق اور جذبے کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوں۔آپ کو جیسا شوق ہے، ایسے ہی شوق والوں کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں۔ یہ صحبت موٹیویشن کا باعث بنے گی۔ ممتاز اور منفرد افراد کی کہانیاں پڑھیں۔ یہ بھی موٹیویشن کا باعث بنیں گی۔ایسی ویڈیوز دیکھیں جو موٹیویشن کا باعث بنیں۔کمال یہ ہے کہ جیسے شہد کی مکھی رس نکال کر شہد بنا لیتی ہے، آپ جو

بنانا چاہتے ہیں وہ اس دنیا سے نکال کر خود بنائیں۔ انہی فلموں، انہی کہانیوں، انہی شخصیات، انہی کتابوں اور انہی لوگوں سے اپنا شہد بنائیں اور وہی آپ کا شوق ہوگا، وہی جذبہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیئے کہ "اے اللہ، ہمیں عزت والی شناخت عطا کر۔" یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ یہ شناخت روٹی سے، پیسے سے اور گاڑی سے بڑا انعام ہے۔

ہمیں لگتا ہے کہ ہم کسی کمپنی کیلیئے کر رہے ہیں جبکہ حقیقت میں ہم قدرت کیلیئے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ آدمی کی محنت کا محافظ باس نہیں ہوسکتا، کمپنی نہیں ہوسکتی، دکان نہیں ہوسکتی۔ وہ صرف قدرت ہوسکتی ہے۔ ہماری تنخواہ یا معاوضہ تو ہماری محنت کی ایک معمولی شکل ہوتی ہے۔ یہ تنخواہ سب کچھ نہیں ہے۔ محنت کا ایک حصہ قدرت کے پاس بھی جمع ہوتا رہتا ہے جو اسے رکھتی جاتی ہے۔ اس لیے جو شخص اپنی بہترین صلاحیت استعمال کرتا ہے تو پھر قدرت اس کی محنت کے صلے میں اسے ممتاز کر دیتی ہے۔

قدرت کے پاس ہماری محنت کو سنبھالنے کیلیئے بہت جگہ ہے اور اس کا صلہ ہمیں بہتر وقت میں بہترین دیتی ہے، کیونکہ قدرت اس نظارے کو دیکھ رہی ہوتی ہے جسے انسان کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ بعض اوقات آدمی اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کرتا ہے، لیکن کمپنی اس کی صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کرتی۔ لیکن قدرت اس کے خلوص کو اپنے پاس محفوظ کرتی چلی جاتی ہے۔ ایک گڈریا اپنے گدھے کو لیے سڑک پر جا رہا تھا کہ اسے سڑک پر پڑا ہیرے کا ہار ملا۔ اس نے وہ ہار اٹھایا اور گدھے کے گلے میں ڈال دیا۔ پھر آگے چل پڑا۔ ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک جوہری نے گدھے کے گلے میں وہ قیمتی ہار دیکھ لیا۔ وہ سستے داموں یہ ہار خرید کر لے آیا اور جا کر بادشاہ کو پیش کیا۔ اس کا قیمتی ہیرا ملکہ کے تاج میں لگایا گیا تو جوہری نے کہا کہ "جس چیز نے جہاں پہنچنا ہے، وہاں اس نے پہنچ ہی جانا ہے۔" ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ہیرے ہوتے ہیں، لیکن وقتی طور پر پتھر بن جاتے ہیں۔ جیسے جوہری نے ہیرے کی قیمت کو شناخت کرلیا، اور گدھے والا اسے گدھے کے گلے میں

ڈال کر گھومتا پھرا، ہم اپنے آپ کو شناخت نہیں کر پاتے، لہٰذا اپنے ساتھ گدھے والا کرتے رہتے ہیں۔

ایک جگہ سے مطمئن نہ ہوں، خود کو بہتر کرتے رہیے

اپنے آپ کو مانجھتے رہیے۔ خبر نہیں کہ کب نگاہِ قدرت میں آجائیں، خبر نہیں کہ کب پتھر تراش اپنی نگاہوں میں لے آئے، کب بنانے والا آپ کو بنا جائے۔ جب آپ اپنی بہترین صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں تو کبھی دنیا سے توقع نہ رکھیں بلکہ اپنے آپ سے توقع رکھیے۔ اپنے آپ سے سوال کیجیے کہ قدرت نے جو توانائی مجھے دی ہے، کیا میں نے اس کا پورا استعمال کیا ہے؟ کیا اسے بہترین جگہ استعمال کیا ہے؟ لوگ اپنی توانائیوں کو پورا استعمال کرتے ہیں نہ درست جگہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے نتیجہ مختلف ہوتا ہے۔

جب ہم صبح اٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہماری جیب میں چوبیس گھنٹے ڈالتا ہے۔ ہم نے انھی چوبیس گھنٹے میں کام کرنا ہوتا ہے، اسی میں آرام کرنا ہوتا ہے، اسی میں کھانا کھانا ہوتا ہے، اسی میں شکر ادا کرنا ہوتا ہے، اسی میں عبادت کرنی ہوتی ہے، اسی میں احترام کرنا ہوتا ہے، غرض چوبیس گھنٹوں میں سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ہم ان چوبیس گھنٹوں کا صحیح اور بہترین استعمال نہیں کرتے پھر زبان پر گلے شکوے لاتے ہیں۔

تین دروازے

اپنی زندگی میں تین دروازے ہمیشہ کھلے رکھیے۔ پہلا دروازہ کتاب، دوسرا انسانوں سے سیکھنا، تیسرا ہمیشہ اپنے ہوش وحواس قائم رکھنا اور ان کا صحیح استعمال کرنا۔ جب کتابیں اور انسان مل جاتے ہیں تو پھر رٹا نہیں لگانا پڑتا، کیونکہ رٹا اُس چیز کا لگایا جاتا ہے جس کے نمبر لینے ہوتے ہیں۔ درج بالا تینوں چیزیں آدمی کے اندر احساس پیدا کرتی ہیں اور اس کی سوچ

بدلتی ہیں۔ اگر سوچ میں تھوڑی سی بھی تبدیلی آتی ہے تو یہ انجام تک پہنچتے پہنچتے بہت بڑی تبدیلی بن جاتی ہے۔ جس طرح کپڑے پر تھوڑا سا چھید لگتا ہے تو پھر یہ تھوڑا سا چھید کچھ ہی وقت میں پورا کپڑا اپھاڑ دیتا ہے۔

زمانہ سب سے بڑی کتاب ہے۔ یہ انسان کو سکھاتا ہے۔ تجربہ سب سے بڑا مرشد ہے۔ یہ انسان کو سکھاتا ہے۔ اس لیے زمانے اور تجربے کو کبھی نظرانداز نہ کیجیے۔ جب آدمی ان سب چیزوں کو سامنے رکھتا ہے تو پھر وہ اپنے موضوع کا ماہر بن جاتا ہے، پھر یاد نہیں کرنا پڑتا۔ جس طرح سب کو اپنے گھر کا راستہ یاد ہوتا ہے، اسی طرح جو نظریات آدمی کے اپنے ہوتے ہیں، انھیں بھی یاد نہیں کرنا پڑتا۔ جو نظریات نتائج نہیں دے رہے، وہ سب غلط ہیں۔ جو نظریہ یا تصور مطلوبہ نتیجہ دیتا ہے، وہ درست ہے۔ ہر وہ علم جس کے ساتھ عملی نتیجہ ہے، اس علم کی قدر کیجیے، کیونکہ وہ علم نافع ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان نفع ہے۔ سکونِ قلب نفع ہے۔ عزت نفع ہے۔ لوگوں کے دلوں میں احترام نفع ہے۔ کام کیلئے جذبہ اور جنون نفع ہے۔ تعلقات نفع ہے۔ جو آدمی کام کی قدر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر لوگوں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ جو آدمی اپنے کام کی قدر نہیں کرتا، اس کی قدر نہیں ہوتی۔ دنیا میں جتنے لوگوں کی قدر ہو رہی ہے، انھوں نے اپنے کام کی قدر کی تو ان کی قدر ہوئی، اس لیے قدر و منزلت کا بڑھ جانا نفع ہے۔

نفع کا تصور بدلیے۔ اس تصور کو محدود نہ کیجیے۔ تنخواہ نفع کا ایک معمولی سا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ نیک اولاد نفع ہے، ساتھ چلنے والا پارٹنر بھی نفع ہے۔

سوچ اور تصورات بدل جائیں تو نتائج بدلنے لگتے ہیں۔ جب تک سوچ نہ بدلے، نتیجے نہیں بدلتے۔ اگر کسی کے ساتھ بڑی نیکی کرنی ہے تو اسے سوچ دیجیے، کیونکہ سوچ بدلے بغیر زندگی بہت خطرناک ہے۔ سوچ بدلے بغیر عہدہ بڑا خوف ناک ہے اور سوچ بدلے بغیر رزق بھی بڑا خوف ناک ہے۔

بہترین اخلاق

اپنی زندگی میں اخلاق بہترین کر لیجیے، مواقع ملنا شروع ہو جائیں گے۔ اچھے لوگ ملنا شروع ہو جائیں گے۔ آپ کی روٹی کے مسائل ختم ہو جائیں گے۔ اپنے کام کے صلے کا ایک حصہ اپنے اللہ سے لیجیے۔ کچھ ایسا ہونا چاہیے جس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے دینا ہو، یعنی کچھ کام ایسا بھی ہونا چاہیے جو چھپ کر ہو، جس کا کوئی گواہ نہ ہو۔ اس میں بڑا لطف ہے۔

چیزوں کو بہترین انداز میں کرنا سیکھیے۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں، اسے مزید اچھے انداز میں کرنا سیکھیں۔ اپنی خدمات کا معیار بہتر کیجیے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی کامیابی کا مزاج ایک کام سے لیتا ہو، جبکہ ترقی کسی اور کام میں کر جائے۔ یہ دیکھئے کہ کون سا کام اچھا مزاج دیتا ہے۔ جس طرح عبدالستار ایدھی مرحوم نے کہا تھا کہ میری ماں کے دکھ نے میرے اندر ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا۔ دنیا میں کئی چیزیں کہیں پڑی ہوتی ہیں، وہ ملتی کہیں اور ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کون سا مزاج کہاں سے ملا ہے۔

معیار کیوں کر بہتر کیا جا سکتا ہے؟

اس بارے میں ہمیشہ سوچا کیجیے کہ کام کی کوالٹی کو کیسے بہتر کیا جا سکتا ہے۔ ہمیشہ بہتری کی گنجائش رکھیں۔ بہترین سوچ پیدا کیجیے۔ یہ دیکھئے کہ میری سوچ معیاری ہے کہ نہیں۔ اپنی سوچ کا کبھی کبھی محاسبہ کیا کیجیے۔ جب بھی کسی میں کوئی اچھی چیز دیکھیں، اسے اپنانے کی کوشش کیجیے۔

اپنی زندگی میں کمٹمنٹ بڑھائیے۔ وہ تمام وعدے جو خود سے کیے ہیں، انھیں پورا کیجیے۔ وہ تمام وعدے جو اللہ تعالیٰ سے کیے ہیں، انھیں پورا کیجیے۔

کسی بھی کام کے کچھ اصول متعین ہوتے ہیں، لیکن ان میں کچھ اپنے اصول بھی شامل

کیجیے۔ یہ وہ اصول ہیں جو آپ اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں۔ اس کے بغیر ممکن نہیں۔

پڑھے لکھے کافی نہیں، آج ماہرین کی ضرورت ہے

کتاب Millionnaire Messanger ضرور پڑھئے۔ یہ کتاب ایک ایسے فلسفے پر ہے کہ جس کے مطابق، اس وقت دنیا میں ایکسپرٹ انڈسٹری آچکی ہے۔ ہمیں پڑھے لکھے لوگ نہیں چاہئیں، ہمیں ایکسپرٹ کی ضرورت ہے۔ ہمیں ماہرفن کی ضرورت ہے۔ ایک ہے، پروفیشنل اور ایک ہے، ایکسپرٹ۔ ایکسپرٹ وہ ہوتا ہے جس کا وزڈم دیگر پروفیشنلز سے کہیں بلند ہوتا ہے۔ وہ کام کی باریکیوں کو جانتا اور سمجھتا ہے۔ وہ سکھانے کے قابل ہوتا ہے۔

ہر فرد کی کہانی ایک پروڈکٹ ہے۔ اگر اندازِ بیاں مل جائے تو پھر ہر آدمی میلینئر (امیر) بن سکتا ہے۔ اپنی زندگی میں وہ شہد اکھٹا کیجیے جو بانٹا جا سکتا ہے۔ ایسے وزڈم پر معذرت ہے جسے بانٹنے کا حوصلہ ہی نہ ہو۔ وہ وزڈم، وہ فہم جو بانٹی جا سکے، آسانی جو شیئر کی جا سکے، فہم وہ جو بتایا جا سکے، دانش وہ جو دی جا سکے اور عقل وہ جو دی جا سکے۔ کام ایسے کیجیے کہ کل کو اگر سکھانا پڑے تو سکھا سکیں۔

جب آدمی اپنی فیلڈ میں برانڈ بنتا ہے تو ترقی شروع ہو جاتی ہے۔ برانڈ بنتا ہے تو وہ ممتاز بھی ہوتا ہے۔ اکثر لوگ اپنے برانڈ پر کام نہیں کرتے جس کی وجہ سے انھیں ترقی نہیں ملتی۔ ایسا پودا لگانا چاہیے جس کا پھل آنے والی نسلیں کھائیں۔ اگر آپ اپنا برانڈ بنائیں گے تو آپ ایک فرد سے ایک ادارہ بن سکتے ہیں۔ یہ ادارہ جس کا فیض آپ کی آنے والی نسلوں تک منتقل ہو۔ جس کا پھل قوم کھائے، جس کا پھل امت کھائے اور جس کا پھل صدیوں تک آنے والے انسان کھائیں۔

خدمت کا جذبہ

''اپنی شناخت کا بہترین طریقہ یہ ہے خود کو دوسروں کی خدمت میں تج دو!''

مہاتما گاندھی

فرد واحد ہو، گھر ہو یا معاشرہ ہو، سب سے بڑی کمائی سکونِ قلب ہوتی ہے۔ جس معاشرے میں خدمت کی جا رہی ہو، آسانیاں بانٹی جا رہی ہوں وہاں سکون قلب بڑھتا جاتا ہے۔ جس معاشرے میں ہوس، خود پرستی اور لالچ آ جائے وہاں خدمت کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ خدمت ایک ہی صورت میں زندہ رہ سکتی ہے کہ جسے خدمت ملی ہو، وہ دوسروں کی خدمت کرے۔ آج کوئی سیکھنے، سکھانے اور سوچنے کو تیار نہیں ہے کہ دوسروں کی خدمت بھی کرنی ہے۔

خدمت کا محدود تصور

آج خدمت کے تصور کو پیسے کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ صرف پیسے والا ہی خدمت کر سکتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ خالی پیٹ والا اور عاجز بھی خدمت کر سکتا ہے۔ خدمت کا تعلق مال کے ساتھ نہیں ہے، خدمت کا تعلق دل کے ساتھ ہے۔ سخاوت مال سے نہیں ہوتی، سخاوت حوصلے سے ہوتی ہے۔ فیس بک کے بانی مارک زوکر برگ کی جب بیٹی پیدا ہوئی تو اس نے اپنی بیٹی کی خوشی میں اپنی کمائی کا بہت بڑا حصہ خیرات کر دیا اور اپنی بیٹی کی ڈائری میں لکھا کہ ''میری دنیا تمہاری دنیا سے بہت زیادہ

خوبصورت ہے، اس لیے میں نے یہ عطیہ کیا ہے جو آنے والا وقت ہے، وہ تمہارا وقت ہے اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔'' جو کوئی بھی خدمت کرتا ہے، وہ صرف اپنے لیے نہیں کرتا بلکہ اپنی نسلوں کیلئے کرتا ہے۔

خدمت کی اصل، نیت ہے

اچھی نیت خدمت ہے۔ بے لوث دعا خدمت ہے۔ بے لوث آسانی خدمت ہے۔ بسا اوقات بارگاہِ الٰہی میں مال واسباب والے کی خدمت قبول نہیں ہوتی، ایک غریب کی قبول ہو جاتی ہے۔ دراصل قبولیت مال سے نہیں ہوتی، نیت سے ہوتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں ایک بڑھیا بھی تھی۔ وہ تھوڑے سے گندم کے دانے لے کر آئی اور کہا، میں بھی خریدار ہوں۔ کسی نے کہا کہ یہ تو بہت تھوڑے ہیں۔ اس سے تمہارا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ اس نے جواب دیا، مجھے پتا ہے میں ان دانوں سے خرید تو نہیں سکتی لیکن یہ تو ہوگا کہ خریداروں کی فہرست میں میرا نام ہوگا۔

خدمت بہت زیادہ توانائی یا وقت دینے کا نام نہیں ہے، بلکہ کوالٹی کا نام ہے۔ اگر کوالٹی کا ایک جملہ بھی کہہ دیا جائے تو وہ خدمت میں شمار ہو سکتا ہے۔

اپنے بچوں کو خدمت کا عادی بنائیے

تربیت کے حوالے سے بچوں کی بنیاد والدین ہوتے ہیں، کیونکہ وہ بچے کی زندگی میں اس کے پہلے رول ماڈل ہوتے ہیں۔ اگر والدین میں خدمت کا جذبہ ہوگا تو وہ بچوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کر سکیں گے۔ ہمارے پاس خدمت کے حوالے سے بہترین مثال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو میں آپ صلی اللہ علیہ کا خدمت کا جذبہ نظر آتا ہے۔ اگر والدین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کی پیروی کریں تو پھر وہ

بچوں میں صحیح خدمت کا جذبہ پیدا کر سکیں گے۔

والدین کے بعد بچوں میں خدمت کے جذبے کو پیدا کرنے میں استاد کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ ایک اچھا استاد معاشرے میں آکسیجن کی مانند ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ ہمارا استاد خدمت کا جذبہ نہیں پیدا کر رہا، وہ صرف تنخواہ لے رہا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس میں سارا قصور استاد کا بھی نہیں ہے۔ انھیں کارپوریٹ کلچر نے ایسا بنا دیا ہے۔ کارپوریٹ کلچر میں جتنے پرائیویٹ کالجز اور یونیورسٹیاں ہیں وہ اساتذہ اور بچوں دونوں کا خون نچوڑتے ہیں۔ اس کارپوریٹ کلچر نے تعلیم وتربیت دینے کی بجائے اس کو کمائی کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ اس وقت ایک ایسی تحریک کی ضرورت ہے جو تعلیمی اداروں میں تعلیم اور تربیت کی اہمیت کو اجاگر کرے۔ خدمت کے جذبے پر مضمون لکھنے سے بچوں میں خدمت کا جذبہ پیدا نہیں کیا جا سکتا، یہ تربیت سے پیدا ہوگا۔ اس کیلئے اساتذہ کو قربانی دینی پڑے گی۔ بچوں کے اندر جذبہ خدمت کا بیج تب ہی لگے گا کہ جب وہ استاد کو قربانی دیتے ہوئے دیکھیں گے۔ آج اگر کسی بچے میں یہ بیج لگتا ہے تو وہ آنے والے وقت میں تناور درخت بنے گا۔

آپ کا حق کسی شے پر نہیں، یہ محض مالک کی عطا ہے

جو بندہ کسی آسانی یا نعمت کو اپنا حق سمجھتا ہے وہ بے وقوف ہے۔ دنیا میں کسی بھی چیز پر کسی کا حق نہیں ہوتا۔ یہ مالک کا کرم اور عطا ہوتی ہے۔ حق نہ ہونے کے باوجود بھی اگر نعمتیں مل رہی ہیں تو انھیں ضرور باٹنا چاہیے۔ ہم بچا کھچا سالن، فریج میں پڑی چیزیں، پھٹے پرانے کپڑے، خراب جوتے دیتے ہیں یہاں تک کہ جب بڑھاپا آتا ہے تو تب خدمت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ ہمیں خدمت کیلئے اپنی جوانی، سب سے اچھا پھل، سب سے اچھی توانائی اور سب سے اچھا ٹیلنٹ دینا چاہیے۔ اگر استاد ہیں تو کچھ بچوں کو فری پڑھانا

چاہیے۔ اگر ڈاکٹر ہیں تو مستحق مریضوں کا فری علاج کرنا چاہیے۔ اگر طالب علم ہیں تو تھوڑا وقت جونیئر طالب علموں کو دینا چاہیے۔ جب تک ہم دوسروں کو اپنی پسندیدہ چیز نہیں دیں گے، اس وقت تک خدمت کے اصل ذائقے کو نہیں چکھ سکیں گے۔

خدمت وہ واحد شے ہے جس سے بندہ پاتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید بانٹنے سے کم ہوتا ہے، یہ اُن کی غلط فہمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ بانٹنے والوں کو زیادہ دیتا ہے۔ دنیا میں نعمت کو بچانے کا فقط ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنی نعمتیں بانٹی جائیں۔

خدمت کیلئے بہتر وقت کا انتظار نہ کیجیے

بعض لوگوں میں خدمت کا جذبہ فنا فی الذات کی حد تک ہوتا ہے۔ بھیک مانگنے کو برا سمجھا جاتا ہے لیکن عبدالستار ایدھی وہ شخص ہیں کہ انھوں نے جب بھی مانگا ان کی عزت میں اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے لیے نہیں مانگا بلکہ دوسروں کیلئے مانگا۔ معاشرے میں کچھ لوگ حقیقی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اندر اتنا فہم پیدا کر دیتا ہے کہ وہ دوسروں کیلئے اپنی ذات کو فنا کر دیتے ہیں۔ ایدھیؒ صاحب کے گھر میں ان کا نواسہ گرم پانی سے جھلنے کی وجہ سے فوت ہو جاتا ہے۔ جب تدفین کا وقت آتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ گھوٹکی میں ٹرین کا حادثہ ہو گیا ہے۔ وہ تدفین کا کام وہیں چھوڑتے ہیں اور گھوٹکی پہنچ جاتے ہیں۔ نواسے نے جانا تھا، چلا گیا لیکن اس وقت جو لوگ تکلیف میں ہیں ان تک آسانی پہنچنی چاہیے۔ یہ ظرف صرف بڑے لوگوں میں ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مرنے کے بعد بھی نہیں مرتے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''موت عام انسان کو مار دیتی ہے لیکن بڑے انسان کی موت اس کی عظمت میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔'' اس طرح کے لوگ لمبی کہانی بنتے ہیں۔ جو شخص لمبی کہانی بننا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ بڑی قربانی دے۔ حضرت واصف علی واصفؒ کے پاس آ کر لوگ کہتے کہ جب میں کچھ بن جاؤں گا تو تب خدمت

کروں گا۔ آپؒ اسے فرماتے، ''عین ممکن ہے، اس وقت تمہارے پاس وہ ظرف ہی نہ ہو۔'' بہتر یہ ہے کہ ابھی سے خدمت کا مزاج بنایا جائے۔

جتنی خدمت ہو سکتی ہے اس کو تو شروع کیا جائے۔ ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ وہ تمام لوگ جو کر سکتے ہیں، وہ نہیں کر رہے۔ جو لوگ خدمت کر رہے ہیں، وہ استقامت پیدا کریں، کیونکہ شروع کرنا آسان ہوتا ہے جبکہ جاری رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

خدمت وقتی عمل نہیں

خدمت پابندی والی جاب نہیں ہے۔ یہ چوبیس گھنٹوں کا عمل ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی خدمت ہو سکتی ہے۔ ہر خدمت کیلئے پیسہ کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت سی خدمتیں ایسی ہیں جو بغیر پیسے اور روپے کے کی جا سکتی ہیں۔ دوسروں کو صحیح راستہ بتائیے۔ علم میں آسانی پیدا کیجیے۔ اچھی کتابیں تقسیم کیجیے۔ کھانا کھلائیے۔ اگر دھوپ ہے تو چھاؤں فراہم کیجیے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''کوئی ڈوب رہا ہو تو ڈوبنے والے سے اس کا عقیدہ نہیں پوچھنا چاہیے بلکہ اس کی مدد کرنی چاہیے۔''

اپنی کہانی، اپنی زبانی

''اگر آپ اپنے خوابوں کو پورا نہیں کریں گے تو کوئی دوسرا آپ کو ملازم رکھ لے گا اور آپ اس کے خواب پورے کریں گے!''

دھیروبھائی امبانی

میرے والدین اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے جبکہ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں۔ کہتے ہیں کہ پہلوٹھی کا بچہ سب سے لاڈلا۔ بڑا ہونے کی وجہ سے مجھے اپنے والدین کا پیار محبت زیادہ ملا۔ بچپن میں سب سے زیادہ شفقت دادا سے ملی جو آرمی میں آفیسر تھے اور ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ اُن کی حیثیت ہماری فیملی میں مرکز کی سی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر میرے رول ماڈل ہیں۔

بچپن کے خواب

بچپن سے ہی مجھے خواب دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ میرا خواب تھا کہ میں آرمی میں جاؤں۔ اس خواب کو پورا کرنے کیلئے میں خاندان کے دوسرے بچوں کے ساتھ تکیوں اور رضائیوں کے مورچے بنا کر ایک جنگ کا ماحول پیدا کر کے کھیلا کرتا تھا۔ تصورات میں کھوئے رہنے کی اتنی عادت تھی کہ ایک دفعہ کمرے میں اکیلا تصورات میں کھویا ہوتا تھا کہ اچانک میری والدہ کمرے میں آگئیں اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ جب میں نے انھیں دیکھا تو مجھے اس کیفیت پر بڑی شرمندگی ہوئی۔

تین چیزیں مجھے بچپن سے ہی مل گئی تھیں جن میں پاکستان سے محبت، روحانیت اور والدہ کی تربیت۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا، میرے دادا کا تعلق آرمی سے تھا، ان کی پاکستان سے لگن اور محبت بہت زیادہ تھی۔ یہی لگن اور محبت مجھے ان سے ملی۔ ہم گجرات کے جس گاؤں میں رہتے تھے، وہاں ہمارے آبا کئی سو سال سے آباد تھے۔ ان میں روحانیت بہت زیادہ تھی۔ اولیائے کرام کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ میں وہ تذکرے سنتا رہتا تھا۔ وہیں سے روحانی پہلو بھی میری شخصیت میں شامل ہو گیا۔

جو ملا، بانٹ دیا

جس طرح ہر ماں کو اپنے بچوں سے خاص محبت ہوتی ہے، اسی طرح میری والدہ کو بھی مجھ سے بہت زیادہ محبت ہے۔ میں نے جو محبت اور شفقت ان میں دیکھی، وہ کسی اور میں نہیں دیکھی۔ ہمیشہ سمجھانے اور راستہ بتانے میں ان کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ زندگی میں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ جب میں دل ہار بیٹھا تو وہاں والدہ کا مثبت کردار ہی تھا جس کی وجہ سے میں دوبارہ اٹھا اور جدوجہد شروع کر دی۔ شروع سے جب بھی میں نے اپنی کمائی والدہ کو دی، انھوں نے وہ بانٹ دی۔ یہی درویشی اور فقیری مجھے اپنی والدہ سے ملی ہے۔

بڑا ہونا اہم نہیں ہے، بڑا بننا اہم ہے۔ اس حوالے سے میرا بہن بھائیوں سے کردار شروع ہی سے بڑوں والا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ جب میں ساتویں کلاس میں تھا تو میرے چھوٹے بہن بھائیوں کے اسکول شروع ہونے والے تھے۔ میں اکیلا اپنے بہن بھائیوں کو لے کر گجرات سے لاہور آیا۔ منٹو پارک سے کھانا کھلایا، گھر پہنچا، خود تیار ہوا اور انھیں بھی تیار کرایا اور ہم اسکول چلے گئے۔

وسائل کی کمی نہیں، کردار کا قحط ہے

آج کے بچوں میں وسائل کی کمی نہیں ہے، ان کے پاس سب کچھ ہے، لیکن اگر کمی ہے تو حیاداری، مہمان نوازی، اخلاق، قدر اور ادب کی کمی ہے۔ یہ بڑی تکلیف کی بات ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ نصیحت کر دینا ہی تربیت ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ جو کر کے دکھاتے ہیں، اصل میں وہی تربیت ہے۔

پہلے لوگوں کا دل وسیع ہوتا تھا۔ جب آپ اپنا دل بڑا رکھتے ہیں تو وہ بذاتِ خود ایک مثال بن جاتی ہے۔ میرے دادا کے والد زمیندار تھے۔ جب وہ اپنی بکریوں کو لے کر گھر کی طرف نکلتے تو مونجی کی رسی سے ان کا منہ باندھ دیتے۔ پھر انھیں آگے لے کر جاتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا، آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا، بھائی ایسا ہے کہ ان بکریوں کا دودھ میری اولاد پیتی ہے۔ ان کو حلال وحرام کا تو پتا نہیں ہے لیکن مجھے تو پتا ہے۔ میں اپنی احتیاط کرتا ہوں کہ کہیں غلطی سے یہ بکریاں دوسرے کی فصل سے نہ کھالیں۔

اُس وقت حلال وحرام کی یہ تمیز بہت عام تھی، جبکہ آج ماحول یکسر بدل چکا ہے۔ آج بڑی گاڑی کا نام عزت ہے، بڑے گھر کا نام عزت ہے، کسی باہر کی یونیورسٹی سے ڈگری لینا عزت ہے، دولت کی فراوانی عزت ہے، بڑا عہدہ عزت ہے۔ یہ چیزیں تب نہیں تھیں، تب قدر اور عزت تھی۔ یہ دیکھا جاتا تھا کہ یہ آدمی کردار اور اخلاق کا اچھا ہے۔ اچھے کردار والے کو "اچھا" اور برے اخلاق والے کو "برا" سمجھا جاتا تھا۔

میں نے ایف ایس سی اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور سے کیا۔ پھر انجینئرنگ یونیورسٹی چلا گیا۔

ٹھوکر کھا کر سنبھلنا

ایف ایس سی کے زمانے میں نئی نئی آزادی ملی تھی جس کی وجہ سے میں تھوڑا سا راستے سے اِدھر اُدھر ہوگیا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو دوستوں کی بیٹھک صحیح نہیں تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرسٹ ایئر کے امتحان میں ایک دو پیپر دیئے، جبکہ باقی چھوڑ دیے۔ ظاہر ہے، فیل ہی ہونا تھا۔ لیکن سیکنڈ ایئر کے شروع ہی میں، میں نے فیصلہ کیا کہ اب برے لوگوں کا ساتھ چھوڑ کر محنت کرنی ہے۔ پھر میں نے دن رات ایک کر کے محنت کی اور امتحان میں پاس ہوگیا۔ میرا نام میرٹ پہ بھی آ گیا۔ یہ دو سال کا دورانیہ تھوڑا سا وقت ضائع ہونے کے علاوہ کوشش کا دور بھی ہے۔

حضرت واصفؒ سے تعارف

سیکنڈ ایئر کے آخر میں حضرت واصف علی واصفؒ سے بھی متعارف ہوا۔ ہوا کچھ یوں کہ میرے دوست کی سال گرہ تھی۔ ہم دوست ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا کیا تحفہ دیا۔ ایک نے کہا کہ میں نے حضرت واصف علی واصفؒ کی کتاب ''کرن کرن سورج'' دی ہے۔ جیسے ہی میں نے یہ نام سنا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل پر دستک ہوئی اور میں نے دل میں کہا کہ یہ کتاب پڑھنا چاہیے۔ حالانکہ مجھے کتابیں پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا، لیکن نہ جانے کیوں اس کتاب کے مطالعے کی طرف توجہ ہوئی۔

مجھے آج تک نہیں پتا کہ اللہ تعالیٰ دلوں میں کیسے ڈال دیتا ہے۔ خیر، جس کو یہ کتاب تحفے میں ملی تھی، میں وہ کتاب لینے اس کے گھر چلا گیا۔ ایک دن مجھے اپنے والد صاحب سے شاپنگ کیلئے پندرہ سو روپے ملے۔ میں انارکلی چلا گیا جہاں سے مجھے کپڑے خریدنے تھے۔ ایک جگہ میں نے اپنی موٹر سائیکل کھڑی کی۔ سامنے بک شاپ تھی۔ جیسے ہی میں نے

اس دکان کی طرف دیکھا، سامنے ہی حضرت واصف علی واصفؒ کی کتابیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے شاپنگ کرنے کی بجائے ان پندرہ سو کی وہ ساری کتابیں خرید لیں۔ میرے اندر پیاس اس قدر تھی کہ میں نے اس رات ہی میں ایک کتاب مکمل کرلی۔ پھر جیسے جیسے کتابیں پڑھتا گیا، اپنا آپ کھلتا گیا۔ آج میں جب یہ کتابیں دیکھتا ہوں تو جن جن جملوں پر لائن کھینچ کر نمایاں کیا تھا، آج وہ میری زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔

جب میں نے یہ کتابیں پڑھنا شروع کیں تو مجھ پر تنقید شروع ہوگئی، کیوں کہ ان کے مسلسل مطالعے کے باعث میرے شب و روز کے معاملات متاثر ہونے لگے تھے۔ کہاں بچہ کورس کی کتابوں سے آگے نہیں جاتا تھا اور کہاں کورس سے ہٹ کر کتابیں لینا شروع کردیں اور رات گئے تک انھیں پڑھنا شروع کردیا۔ اگلی تبدیلی یہ ہوئی کہ رات کو اچانک اٹھ جاتا اور تہجد ادا کرتا۔

سچی تبدیلی کی علامت

یہ تبدیلی اصل میں، میری زندگی میں انقلاب تھا۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''ایک سچی روحانی محبت کے اثرات ہر معاملے پر پڑتے ہیں۔'' آدمی جو حاصل کرنے کو کامیابی سمجھتا تھا، اب اس کی بجائے بانٹنے کو کامیابی سمجھنا شروع کردیتا ہے۔

ایک دن حضرت واصف علی واصفؒ کے مزار پر جانا ہوا جہاں میں نے فاتحہ پڑھی۔ وہیں شکر بھی ادا کیا کہ اگر آپؒ کے ملفوظات نہ ملتے اور انھیں پڑھا نہ ہوتا تو آج میں یہاں نہ ہوتا۔ آج تک جو کچھ میں نے کیا ہے، اگر اس وقت حضرت واصف علی واصفؒ میری زندگی میں نہ آتے تو آج یہ ویڈیوز، یہ کتابیں اور یہ علم کا لوگوں تک پہنچ جانا... میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

جو انسان کے اندر ہوتا ہے جب اسے اسی طرح کا ماحول مل جاتا ہے تو وہ جاگ جاتا

ہے۔ انسان جس سے انسپائر ہوتا ہے، اصل میں اس کے ذریعے اس کی اپنے آپ سے ملاقات ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ وہیں سے مجھے پتا چلا کہ میں موٹیویٹر ہوں۔ انھی دنوں کہ جب میں بچوں کو پڑھاتا تھا، میری پڑھانے کی مستقل مزاجی میں بھی حضرت واصف علی واصفؒ کا کردار ہے، کیونکہ آپؒ بھی ٹیچر تھے۔ اس لیے وہ میرے بھی رول ماڈل بن گئے۔ رول ماڈل کی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ جاننا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ اُس نے کون سا انداز اپنایا، وہ کس اسلوب سے چلا، اس کا طریقہ کار کیا تھا۔

انسپائریشن، دل کا معاملہ ہے

جن لوگوں سے آپ کو انسپائریشن ہوتی ہے، ان کے بول یادداشت میں نہیں جاتے، دل میں اترتے ہیں۔ انسپائریشن سے بولی ہوئی بات حافظے کا حصہ نہیں بنتی بلکہ وہ دل اور عمل پر چلی جاتی ہے۔ اگر آپ کو اپنے استاد سے محبت نہیں ہے تو پھر آپ اس سے علم نہیں حاصل کر سکتے، کیونکہ استاد منبع ہے۔ اگر آپ عقلی طور پر چل رہے ہیں تو آپ پکڑیں گے اور چھوڑ دیں گے۔ جب بھی محبت کا تعلق ہوگا تو پھر اس کی کہی ہوئی بات کا اثر ہوگا۔ آج اگر میری باتوں کا لوگوں پر اثر ہوتا ہے تو دراصل یہ سب حضرت واصف علی واصفؒ کا فیض ہے۔

جب میں بچوں کو پڑھاتا تھا، مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا کہ میں ٹیچر ہوں۔ میرے پڑھانے کے رزلٹ بہت شان دار تھے۔ بچے امتحانات میں نہ صرف اچھے نمبر لینے لگے بلکہ ان کا کردار، ان کی سوچ، ان کے ادب آداب میں بھی تبدیلی آنے لگی۔

پڑھانے کے ساتھ ساتھ میری نیٹ ورکنگ بہت زیادہ ہونے لگی۔ کہاں دو تین بچوں کو پڑھانا اور کہاں قافلہ بن جانا۔ کہاں ایک کمرے سے شروع کرنا اور کہاں پورے ٹاؤن کے بچوں کی آمد۔ ایک دن میں کسی ڈیپارٹمنٹ میں ٹریننگ کیلئے گیا تو وہاں موجود

اسسٹنٹ نے مجھ سے کہا کہ آپ کا تعارف میرے پاس نہیں ہے، پلیز آپ اپنا تعارف کرا دیں۔ میں نے اسے کہا کہ میں ٹیچر اور ٹرینر ہوں۔ اس نے کہا، نہیں ذرا تفصیلی تعارف کرائیے۔ میں نے پوچھا، کلاس شروع ہونے میں کتنا وقت ہے۔ پتا چلا کہ ابھی نصف گھنٹہ باقی ہے۔ میں نے کہا، آپ کاپی پنسل پکڑیں، میں لکھوا دیتا ہوں۔ مجھے اس طرح تعارف کرانے میں پچیس منٹ لگ گئے۔

ایک دن ایک صاحب میرے گھر آئے تو وہ میری شیلڈز گننے لگے اور کہنے لگے کہ یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ میں نے انھیں جواب دیا، آپ کو جو شیلڈز یہاں نظر آ رہی ہیں، صرف یہی نہیں ہیں، اس سے زیادہ اندر بند پڑی ہیں۔

میں نے اس کے علاوہ کئی امتحانات بھی پاس کیے جن میں پبلک سروسز اور ہائیکورٹ کے امتحان وغیرہ شامل ہیں۔ میرے کلاس فیلوز مجھے کہتے تھے کہ تم پیسہ کمانے کیلئے پڑھ رہے ہو، اس لیے تم چھوڑنا نہیں چاہتے۔ میں انھیں جواب دیتا کہ پیسہ بھی ایک چیز ہے، لیکن اس سے مجھے جو عزت مل رہی ہے وہ پیسوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کا تمھیں اندازہ ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی جس نے جوانی کے شروع میں بادشاہت دیکھ لی ہو، اس کیلئے نوکری کرنا یا کسی دوسری فیلڈ میں جانا معانی نہیں رکھتا، کیونکہ پڑھانا پوری بادشاہت ہے۔

دورانِ تدریس یعنی جب میں پڑھایا کرتا تھا، میں نے موٹیویشنل لیکچر دینے شروع کر دیے تھے۔ فزکس پڑھانے کے ساتھ ساتھ دو چار اچھی باتیں بھی کہہ دیتا تھا۔ مجھے نہیں خبر تھی کہ آنے والے دنوں میں یہ دو چار اچھی باتیں میرا تعارف بن جائیں گی۔ آج میتھ اور فزکس تو کہیں پیچھے رہ گئیں، لیکن زندگی کے بارے میں جو باتیں میں نے کی تھیں، وہ لیکچرز کا حصہ بن چکی ہیں۔

سوچ کا ارتقا کیوں نہیں؟

میں اس دانشور، ٹیچر، مینٹور اور فلاسفر کو مانتا ہی نہیں ہوں جس کی اپنی سوچ ارتقا کے عمل سے نہ گزری ہو۔ جو اپنے آپ کو بہتر کر رہا ہے، وہ مطالعہ کرے گا۔ وہ نئی چیزیں پڑھے گا۔ وہ غور و خوض کرے گا۔ اس کے تجربات و مشاہدات، دنیا کے اسفار اسے سکھائیں گے۔ وہ کنویں کا مینڈک نہیں رہے گا۔ جب اس کی فکر میں بہتری آئے گی تو پھر وہ اپنے افکار کو تازہ افکار کی طرف لے کر جائے گا۔ نیوٹن کہتا ہے کہ جس طرح سمندر کے کنارے ایک بچہ بیٹھا ہوتا ہے، اس کے ہاتھ میں چند کنکر ہوتے ہیں اور سامنے سمندر ہوتا ہے، وہ چند کنکر اس سمندر کے سامنے کوئی معانی نہیں رکھتے، اسی طرح میرا علم بھی ان چند کنکروں کی مانند ہے اور سامنے سمندر ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''علم کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اپنی لاعلمی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔''

لاعلمی کا احساس جتنا زیادہ بڑھتا ہے، آدمی کا علم کی طرف سفر اتنا ہی تیز ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ اگر وہ اس زعم میں ہیں کہ انھیں سب کچھ پتا ہے تو وہ ایک خطرناک بیماری کا شکار ہیں۔ سول سروسز میں یہ بہت زیادہ مسئلہ ہے۔ شاید ان کے عہدے ہی ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں پتا ہی کچھ نہیں ہوتا، لیکن پھر بھی ایسا ظاہر کرتے ہیں جیسے انھیں سب کچھ پتا ہے۔ اس کا نقصان بہت ہے۔ یہ کیفیت آدمی کے اندر مزید سیکھنے کی گنجائش ختم کر دیتی ہے۔ یہ انسان کو سخت انسان بنا دیتی ہے۔ کچھ سیکھنے اور آگے بڑھنے کیلئے آدمی کا نرم اور لچک دار ہونا بہت ضروری ہے۔

زمانے کے چلن

ہر زمانے میں پچھتاوے، پشیمانی اور افسوس کے اپنے معیارات (اسٹینڈرڈ) ہوتے

ہیں۔ زمانے کے چلن کو سمجھنا ضروری ہے۔ آپ زمانے کے چلن کے مطابق کام کریں گے تو آپ بہتر کام کر پائیں گے۔ یہی حکمت ہے۔ مجھے اس حوالے سے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔
ہاں، اتنا ضرور ہے کہ زندگی میں کہیں وقت ضائع ہو گیا تو مجھے اس کی بڑی شرمندگی ہے۔
میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو جہاں جہاں وقت ضائع کیا ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے وہاں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ اس زمانے میں شعور ہی نہیں تھا۔ دوسرے، جہاں جہاں اپنی توانائیاں ضائع گئی ہیں، میں سوچتا ہوں کہ نہیں ضائع ہونی چاہیے تھیں۔
لیکن پھر ساتھ ہی سوچتا ہوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج زندگی کی قدر نہ ہوتی۔ جب تک انسان گنواتا نہیں ہے، اسے پتا ہی نہیں لگتا کہ اس نے جو گنوایا ہے، اس کی کیا قیمت تھی۔ آدمی کچھ وقت ضائع کرتا ہے، تب ہی وقت کی قدر سیکھتا ہے۔ پیسہ برباد کرتا ہے تو پیسے کی قدر آتی ہے۔ تعلقات خراب کرتا ہے تو تعلقات کی قدر کرتا ہے۔

ناکامی کا ایندھن، خود کو جلانے کیلئے نہیں

ناکام لوگوں کے اندر ناکامیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہیں۔ ان کے اندر گھٹن ہوتی ہے۔ یہ گھٹن ایک طرح کا ایندھن ہے۔ یہ کامیاب لوگوں میں بھی ہے، لیکن ناکام آدمی اس ایندھن کو غلط سمت پر موڑ دیتا ہے۔ اس کی ناکامیاں اس کی عزتِ نفس کو اتنا دبا دیتی ہیں کہ وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ پھر وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرنے کی بجائے اس ایندھن سے خود کو جلاتا ہے اور دوسروں کو آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ وہ دوسروں پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیتا ہے۔ جو لوگ آگے بڑھنے کی اور دوسروں کو پیچھے لانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، ایسے لوگ اپنی ذات کے چور بن جاتے ہیں۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ میں اپنے کاموں میں، اپنی چیزوں میں، اپنے شوق میں اتنا گم ہوں کہ کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ مجھے جو کرنا ہے، میں کرتا رہوں، میرا اللہ مجھے اس کا صلہ دے گا۔

میری ویڈیوز

میں نے وہ سوالات اٹھائے ہیں، جو آج کے نوجوانوں کے سوالات ہیں۔ یہ سوال ان کی گھٹن کا باعث بنے ہوئے ہیں اور انھیں تکلیف دے رہے ہیں۔ اُن کا جی چاہتا ہے کہ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی سے یہ سوالات کیے جائیں۔ میری ویڈیوز پھیلنے کی وجہ یہی ہے کہ میں نے ان موضوعات پر گفتگو کی ہے۔ میرے تمام لیکچرز کا ایک مقصد یہ ہے کہ ایک نئی سوچ بنے تاکہ نئی زندگی کی شروعات ہو سکے۔ انسان کے اندر جو خلا پایا جاتا ہے، اس خلا کو پُر کیا جائے۔ وہ خواہ انفارمیشن ہو، علم ہو یا نیا زاویہ نظر ہو... ہر لحاظ سے موجود خلا کو پُر کر دیا جائے۔ ہر شخص اچھے کپڑے پہننا چاہتا ہے، اچھا کھانا چاہتا ہے، اچھا گزر بسر چاہتا ہے... اسی طرح ہر فرد یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی سوچ اچھی ہو۔ میرے لیکچرز کے موضوعات اس ضمن میں اسے غذا فراہم کرتے ہیں۔ وہ ان ویڈیوز میں اس لیے دلچسپی لیتا ہے کہ اس کے اندر کی گونجتی آواز کو قاسم علی شاہ نے الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے۔

قاسم علی شاہ ۔ ایک تعارف

قاسم علی شاہ بنیادی طور پر ایک استاد ہیں۔ آپ 1998ء سے شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں۔ آپ نے 2001ء میں قاسم علی شاہ اکیڈمی کے نام سے اپنا پہلا تعلیمی ادارہ قائم کیا جو لاہور کے تعلیمی اداروں میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ قاسم علی شاہ اکیڈمی کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء و طالبات کی تعلیم کے ساتھ ان کی اخلاقی تربیت اور تعمیر شخصیت پر بطور خاص توجہ دی جاتی ہے۔ آپ [illegible] پروفیسر کے طور پر تدریسی شعبہ میں اپنی خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔

شاہ صاحب کا اگلا پڑاؤ ٹریننگ اور تربیت ہے، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد تربیت ہے اور تربیت کے بغیر تعلیم اپنا اثر قائم نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ کئی برس سے وہ اپنے آپ کو ٹیچر ٹریننگ اور موٹیویشن کیلئے وقف کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں آپ ملازمین کی موٹیویشن، کسٹمر سروس، مینجمنٹ و کسٹمرز سے تعلقات، ذہنی دباؤ اور غصے پر قابو، ٹائم مینجمنٹ، لیڈرشپ، اخلاقی اقدار، اہداف کو حاصل کرنے کی مہارت، تنظیم سازی، منتظمین کی صلاحیتوں کا نکھار، کارکردگی میں اضافہ کی مہارتیں، شخصیت کی تعمیر، کردار سازی، آپسی تنازعات کا حل جیسے انتہائی اہم موضوعات پر لیکچرز، ورکشاپس، سیمینارز اور سمپوزیم کا باقاعدہ انعقاد کرتے ہیں۔

ملک بھر کے نمایاں تعلیمی ادارے (اسکول، کالج اور یونیورسٹی) قاسم علی شاہ صاحب سے استفادہ کر چکے ہیں، اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

تعلیمی اداروں کے علاوہ موقر سرکاری اور معروف نجی اداروں میں آپ کی ٹریننگ کو وقت کی اہم ترین ضرورت سمجھا جاتا ہے۔ قاسم علی شاہ پولیس، عدلیہ، فوج، سمیت بڑی تعداد میں کارپوریٹ اداروں کو ٹریننگ فراہم کر چکے ہیں۔

اپنی مہارت اور تجربے کے باعث آپ عصر حاضر کے مقبول ترین ٹرینرز ہیں۔ ملک کے مرکزی شہروں کے علاوہ دور دراز علاقوں سے پاکستانی جوق در جوق شاہ صاحب کے تربیتی پروگراموں میں بھرپور شرکت کرتے ہیں۔ اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرون ملک بھی آپ کے پروگراموں کی طلب روز بہ روز بڑھ رہی ہے۔ حال ہی میں لندن سے کامیاب ٹریننگ سیشنز کر کے لوٹے ہیں۔

ورکشاپس کے علاوہ ایف ایم ریڈیوز اور ٹی وی چینلز سے بھی لائیو پروگراموں کے ذریعے تشنگان علم کی پیاس بجھا رہے ہیں۔ اب تک آپ کو پی ٹی وی، سماء ٹی وی، بول ٹی وی، جیو نیوز، سٹی 42، ایکسپریس نیوز، وقت نیو، 7 نیوز، مائی ٹی وی، پیغام ٹی وی، ہوپ ٹی وی اور FM 100، FM 98.6، FM 95، FM 101 پر بطور مہمان بلایا جا چکا ہے اور یہ فہرست طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ سوشل میڈیا پر آپ اس وقت پاکستان کے سب سے زیادہ سرچ کیے جانے والے موٹیویشنل اسپیکر ہیں جہاں روزانہ دنیا بھر سے لاکھوں لوگ آپ کے آڈیو، وڈیو لیکچرز اور ٹاک شوز سے مستفید ہو رہے ہیں۔

قاسم علی شاہ صاحب کی زیر سرپرستی اپریل 2017ء میں قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس فاؤنڈیشن کے ذریعے زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے کامیاب اور نامور پروفیشنلز ایک منفرد تعلیمی تکنیک کے تحت اپنے تجربات اور مہارتیں نوجوان نسل کو منتقل کر سکیں گے۔

قاسم علی شاہ کے درجنوں مضامین اور تحریروں کے ساتھ ساتھ اب تک آپ کی درج ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:- کامیابی کا پیغام، ذرا نم ہو.... آپ کا بچہ کامیاب ہو سکتا ہے، بڑی منزل کا مسافر، اونچی اُڑان، سوچ کا ہمالیہ، اپنی تلاش۔

قاسم علی شاہ صاحب کے بارے میں مزید معلومات اور تازہ سرگرمیوں سے واقف رہنے کیلئے درج ذیل لنکس کو سبسکرائب کیجیے:

FACEBOOK YOUTUBE
www.QasimAliShah.com
Cell: 0321-6531424

نئی سوچ
ں نمبر 47، فرسٹ فلور، ہادیہ حلیمہ سنٹر
غزنی اسٹریٹ، اُردو بازار، لاہور
Cell: 0300-847584
0340-4235023